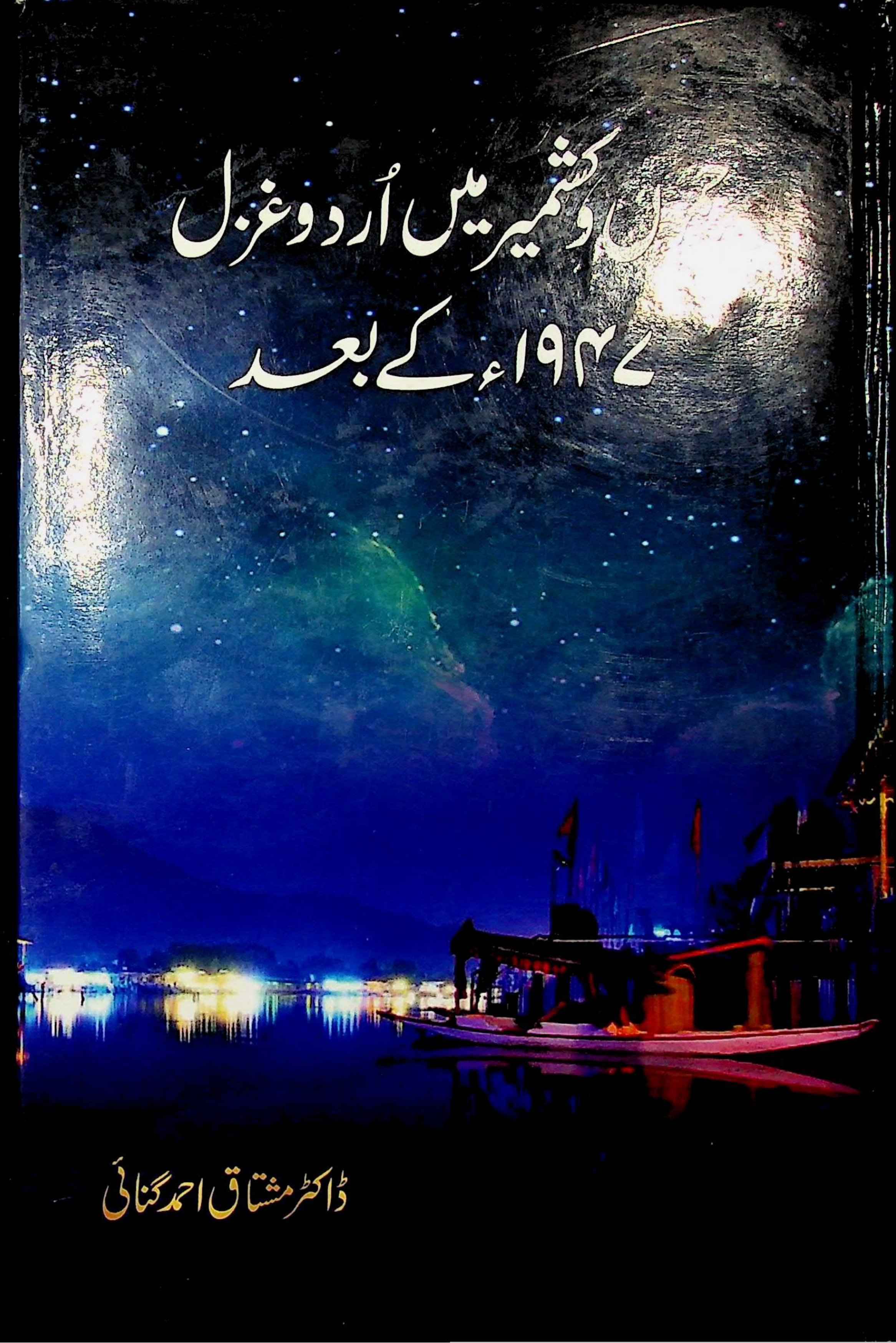


کشمیر میں اُردو غزل
۱۹۴۷ء کے بعد

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

جموں و کشمیر میں اُردو غزل ۱۹۴۷ء کے بعد

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر۔ کشمیر

انتساب

اپنے رفیق و شفیق والدین

محترم عبدالغفار گنائی

اور

محترمہ ساجدہ بانو

کے نام

تعارف

نام: ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

قلمی نام: مشتاق عالم

والد: عبدالغفار گنائی

والدہ: ساجدہ بانو

پیدائش: یکم مارچ ۱۹۸۷ء، سامبورہ، پانپور، پلوامہ، کشمیر

تعلیم: ایم۔اے اُردو کشمیر یونیورسٹی، سرینگر (۲۰۱۰)

پی۔ایچ۔ڈی، اندور یونیورسٹی اندور، ایم۔پی (۲۰۱۸)

JKSET 2016، UGC NET/JRF 2012

پیشہ: درس وتدریس محکمہ اعلیٰ تعلیم حکومت جموں وکشمیر

پتہ: گنائی محلّہ سامبورہ، پانپور، پلوامہ، کشمیر

پوسٹ آفس: کاکاپورہ۔192304

موبائل نمبر: 7006402409

ای۔میل: mushtaqalamphd87@gmail.com

☆☆☆☆

فہرست

☆☆☆

تاثرات

اُردو غزل اپنی متنوع خصوصیات کے ساتھ عہدِ امیر خسرو سے عہدِ حاضر تک ارتقائی سفر میں سرگرمِ عمل ہے۔ اس محبوب ترین صنفِ سخن کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر کون نہیں۔ حالیؔ جیسا غزل کا مخالف بھی اس صنف سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ فطرت نے اُردو غزل کو بڑی فرصت سے سنوارا، نکھارا اور پھر رعنائی اور دلکشی نے اس میں چار چاند لگائے بحر کے توازن نے تناسب عطا کیا، ردیف اور قافیہ نے لے اور موسیقی سے ہم کنار کیا۔ غزل گویا موتی کی لڑی ہے جو الفاظ کے ذریعہ جذبات کی تصویر کشی کرتی ہے۔ کچھ نہ کہہ کر سب کہہ دینے کے اندازِ دلبری نے ایران سے ہندوستان اور برصغیر تک اس کو وسعت عطا کی۔ اُردو لب ولہجہ کے شیدائی عالم کے کسی بھی گوشہ میں رہ کر غزل کی اسیری سے آزاد نہ ہو سکے۔

غزل اُردو تہذیب کی میراث ہے، انسانی خیالات وجذبات رجحانات کی ترسیل کا ذریعہ آلہ کار ہے اسی وجہ سے تغیرات غزل کا وصف ہیں کیونکہ عصری تقاضوں کے مطابق انسانی جذبات و خیالات بھی بدلتے رہتے ہیں انہیں کا عکس ادب پر مرتسم ہوا کرتا ہے لٰہذا غزل بھی ان احساسات کی ترجمانی کرتی رہی۔

ہندو پاک میں اس صنف کا دائرہ کار انتہائی وسیع ہے۔ قریہ قریہ، شہر شہر میں غزل کے فن پر مسلسل طبع آزمائی جاری ہے۔ دہلی ہندوستان کا دل ہے اور ملک کا دارالخلافہ ہونے کے سبب تمام اصناف ادب کا پروردہ بھی رہا۔ دیگر صوبۂ جات میں بھی صنف غزل پر کافی کچھ لکھا گیا مگر کچھ حالات کی بنا پر تو کچھ عصری مسائل کی وجہ سے تمام غزل گو شعرا کا فن ضبطِ تحریر میں نہ آسکا۔

جموں وکشمیر بھی ایک ایسا ہی ادب پرور خطہ ہے۔ جو خطہ بے نظیر کہلاتا ہے۔ یہاں کے باشندے ذکی وفہیم ہونے کے ساتھ ساتھ علم وادب کی آبیاری میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ سے علم وادب کا یہ کارواں تیزی سے سفر کرتا رہا۔ غزل جو اردو شاعری کی مقبول صنف ہے اس جانب آزادی کے بعد جموں وکشمیر کے شعرا کا کلام رسائل وجرائد میں مسلسل چھپتا رہا مگر باقاعدہ تحقیقی کاوشیں منظر عام پر نہ آسکیں۔ اس کے علاوہ

کچھ غزل گوشعرا اشاعت کی تمنا لئے دار فانی سے کوچ کر گئے۔ایسی کاوشیں منتظر نظر رہیں کہ کوئی ادب کا شیدائی اس جانب بھی متوجہ ہو۔بقول خواجہ میر درد

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

اس کے مصداق میرے شاگرد مشتاق احمد گنائی نے ''جموں وکشمیر میں اُردو غزل ۱۹۴۷ء کے بعد'' کے اُردو غزل کے سرمایہ کی جانب تحقیقی کاوش کا حوصلہ کیا جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔یہ بات باعث مسرت ہے کہ وہ اپنے اس تحقیقی کام کو کتابی شکل میں منظر عام پر لا رہے ہیں۔زیر نظر کتاب جموں وکشمیر میں اُردو غزل کی ابتداء وارتقا اور تقسیم ہند کے بعد یہاں کے نمائندہ غزل گوشعرا کا احاطہ کرتی ہے،جو کہ میرے خیال میں جموں وکشمیر میں اُردو غزل کے حوالے سے ایک خوش گوار اضافہ ہوگا۔جموں وکشمیر میں بھی غزل گوشعرا کی تعداد خاصی ہے اس لئے نمائندہ غزل گوشعرا کے حوالے سے تنقیدی وتحقیقی محاسبہ کرنے کی کوشش ہوئی ہے۔چونکہ یہ مصنف کی پہلی کاوش ہے اس لئے اس میں کمیاں اور کوتاہیاں ضرور رہی ہوں گی۔لہٰذا ناقدین ادب کو ان سے جو توقع رہی ہوگی وہ تو پوری نہ ہوسکی ہوگی۔بہر کیف مجھے امید ہے کہ اہل نظر اس کتاب کو سراہیں گے اور موصوف کی حوصلہ افزائی کریں گے۔میں اس کام کے لئے مشتاق احمد گنائی کو بہت ساری دعائیں اور مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

پروفیسر فہمیدہ منصوری

صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ پی جی گرلز کالج موتی طویلہ،اندور

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اُردو افسانے کی طرح اُردو غزل میں بھی زندہ رہنے کے امکانات موجود ہیں۔ جب ہم اُردو غزل کے تاریخی، ادبی اور سماجی و جمالیاتی پس منظر پر دھیان دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے ہر دور میں دوسری اصنافِ سُخن کے مقابلے میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل رہی ہے اور اب تو اس کی مقبولیت کے چرچے عالمی سطح پہ ہو رہے ہیں۔ حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ اردو غزل کا مزاج اور معیار بھی بدلتا رہا۔ اب غزل کے روایتی معنی و مفہوم یعنی عورتوں کی باتیں کرنا، محبوب سے باتیں کرنا یا عشق و عاشقی کی باتیں کرنا بہت حد تک معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ آج کے سائنسی اور تکنیکی دور میں غزل نے ہر طرح کے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ گویا اس میں اب وہ سب کچھ آ گیا ہے جس کی کسی زمانے میں یہ متحمل نہ تھی۔ آج کا شاعر عالمی حالات و واقعات اور مسائل و معاملات کی پوری خبر رکھتا ہے چنانچہ وہ اپنے آپ کو عالمی گاؤں کا ایک ذمہ دار فرد تصور کرتا ہے اور غزل کی فارم میں جب وہ اپنے جذبات و احساسات اور عوامی مسائل و معامات کا اظہار کرتا ہے تو وہ حساس طبقے کا گرویدہ بن جاتا ہے۔ یوں بھی اُردو زبان و ادب میں ایسی فطری کشش اور مٹھاس ہے کہ جو ہر کسی کو اپنی طرف مائل و قائل کرتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہماری نظمیہ اور غزلیہ شاعری نے برصغیر کی تحریکِ آزادی، سماجی اصلاح اور مشترکہ تہذیبی رنگا رنگی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ اردو شاعری اور بالخصوص اُردو غزل کو ایسے باکمال شاعر نصیب ہوتے رہے ہیں جنھوں نے انسانیت، محبت، اخوت اور رواداری و بھائی چارے کی باتیں کی ہیں۔ آدابِ زندگی کو موضوع بنایا ہے اور امن و سلامتی کو ہر دور کی اہم ضرورت بتایا ہے۔ بہت سے قدیم و جدید شعرا اُردو غزل کو آج تک نصیب ہوئے ہیں جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بدھ اور جین غرضیکہ سبھی مذہبوں اور دھرموں کے لوگوں نے گلستانِ اُردو کی آبیاری کی ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال ہماری فلمی صنعت میں کام کرنے والے شاعروں اور گلوکاروں کی دی جاسکتی ہے کہ جنھوں نے برصغیر کی کلاسیکل فلموں میں اُردو غزل گائکی کے ذریعے عوام کے دلوں میں اردو کی محبت پیدا کی۔ رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی ادبی تحریکات و رجحانات سے

اردو غزل متاثر ہوتی رہی ہے لیکن بلاشُبہ غزل اُردو شاعری کی آبرو ہے اور یہ زندگی کے ہر موسم میں اپنے آپ کو منوائے بغیر نہیں رہتی۔

یہاں یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ مشتاق احمد گنائی نے ''جموں وکشمیر میں اردو غزل ۱۹۴۷ء کے بعد'' کے موضوع پر بڑی محنت سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جسے وہ کتابی صورت میں شائع کروانے جا رہے ہیں۔ تحقیق، انتہائی محنت ولگن، ذوق وشوق، مطالعے ومشاہدے، ذہنی کوفتوں اور مالی صعوبتوں سے گزرنے کا نام ہے۔ مانا کہ آج کل کے دور میں ادبی تحقیق کا معیار، کسل مندی، ملازمت حاصل کرنے کی دوڑ اور نمود ونمائش کے چکر میں بہت حد تک پست ہو چکا ہے لیکن زیرِ نظر تحقیقی مقالے کے مطالعے نے مجھ میں اس محرومی کے احساس کو ختم کر دیا۔ اس مقالے میں مقالہ نگار نے اقتباسات کی بھرمار کے بجائے حقائق کی بازیافت میں اپنے موقف اور استدلال کا خاص خیال رکھتے ہوئے کسی حتمی فیصلے تک پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے مذکورہ موضوع بہت وسیع ہے اور جموں وکشمیر میں اردو غزل کا سفر متنوع رہا ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ مستقبل میں قدم رکھنے سے پہلے ماضی میں کیا کچھ ہوا ہے یہ جاننا نہایت ضروری ہے، چنانچہ اسی مناسبت سے مقالہ نگار نے نہ صرف ۱۹۴۷ء کے بعد کی اُردو غزل پہ بات کی ہے بلکہ مقالے کے چار ابواب میں پہلے دو ابواب کا تعلق جموں وکشمیر کے اردو شعر وادب کے ابتدائی دور سے ہے۔ تیسرے باب میں جموں وکشمیر کے نئے اور پرانے غزل گو شعرا کے کلام کے حوالے دیئے گئے ہیں اور اس طرح اُردو غزل کا پورا منظر نامہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ بہرکیف یہ مقالہ، کتابی صورت میں شائع ہونے کے بعد مقالہ نگار کو ادبی حلقوں میں ایک شناخت دے گا اور مجھے اُمید ہے کہ جموں وکشمیر کی اُردو غزل کی سمت ورفتار (بالخصوص ۱۹۴۷ء کے بعد) کو سمجھنے میں یہ کتاب ایک اہم دستاویز ثابت ہوگی۔ میں مشتاق احمد گنائی کو صمیمِ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور خدا سے دُعا گو ہوں کہ وہ ایمان وتندرستی کے ساتھ اُردو ادب کی خدمت کرتا رہے!

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

شعبۂ اُردو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

پیش لفظ

ریاست جموں وکشمیر اپنے قدرتی حُسن و جمال، کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ علاقہ خوبصورت باغات، فلک بوس برفیلے پہاڑوں، مرغزاروں، جھیلوں و جرنوں، چناروں، زعفران اور لالہ زاروں کی بدولت قدرت کا ایک شہکار ہے۔ جہاں ایک طرف یہ ریاست حسین اور دلکش نظاروں کے لئے بے نظیر و بے مثال ہے، وہی دوسری جانب یہاں کی تہذیب وتمدن، کلچرل وثقافت اور بول چال بھی ملک کے دوسرے علاقوں سے مختلف اور رنگا رنگ ہے۔ یہ ریاست بنیادی طور پر تین اکائیوں کشمیر، جموں اور لداخ پر مشتمل ہے۔ ان تینوں خطوں کے باشندے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان کی زبانیں اور ان کا کلچر بھی الگ الگ ہے۔ کشمیر کے لوگ کشمیری، جموں کے باشندے ڈوگری اور اہل لداخ لداخی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ ان تین زبانوں کے علاوہ بھی یہاں دوسری چھوٹی چھوٹی زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔ لیکن ان تینوں علاقوں کے عوام کو اُردو زبان نے برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے رکھا ہے۔ اُردو کو یہاں کے باشندے ایک دوسرے کے ساتھ رابطے کی زبان کے طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔ ان تینوں خطوں کے افراد نے مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اس بین الاقوامی زبان کو فروغ و ترقی دینے میں اپنا رول ادا کیا ہے، جو کہ نا قابلِ فراموش ہے اور جس کا ثبوت یہ ہے کہ جموں کشمیر آج ہندوستان کی واحد ایسی ریاست ہے جہاں اُردو کو سرکاری زبان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف سخن ہے۔ اُردو زبان کا تصور ذہن میں آتے ہی اُردو شاعری کا خیال دل میں آتا ہے اور اُردو شاعری کے ذکر سے ہی اُردو غزل کی گنگناہٹ محسوس ہوتی ہے۔ غزل اُردو شاعری کی ایسی واحد صنف سخن ہے جو ابتداء سے ہی لوگوں کی پسند دیدگی کا مرکز رہی ہے۔ یہ صنف ہر زمانے میں میں عوام و خواص کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ غزل اپنے موصوعاتی رنگا رنگی اور ہیئتی برتاؤ کی بدولت انفرادیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی

نے اسے اُردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔اُردو شاعری کا بیشتر سرمایہ غزل کی صنف پر ہی مشتمل ہے ،جس سے غزل کی سدا بہار مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو شعر و ادب کے آغاز سے ہی صنف غزل کی طرف یہاں کے شعراء نے خصوصی توجہ کی ہے۔ یہاں اُردو غزل پر مشتمل کافی شعری سرمایہ موجود ہے،لیکن ملکی سطح کے ناقدین ادب نے یہاں کے فن کاروں کو بڑی حد تک نظر انداز کیا ہے اوران کی ادبی خدمات کا وہ صلہ نہیں دیا ہے جس کے وہ صحیح معنوں میں حق دار ہیں۔ یہاں اُردو غزل کے حوالے سے جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ مختلف مضامین پر مشتمل ہے۔کوئی ایسا کام میری نظروں سے نہیں گزرا ہے جو یہاں کے غزل گو شعراء کا مکمل جائزہ ایک ساتھ پیش کرتا ہو۔ یہی امر میری تحقیقی دلچسپی کا موجب بنا اور میں نے ریاست میں اُردو غزل پر تحقیق کرنے کا ارادہ کیا۔ ریاست جموں و کشمیر میں اُردو شاعری کا ترقی یافتہ دور آزادیٔ ہند کے بعد ہی شروع ہوتا ہے،اس لئے راقم نے اپنی تصنیف کے لئے ''جموں و کشمیر میں اُردو غزل ۱۹۴۷ء کے بعد'' کا موضوع منتخب کیا ہے۔

مذکورہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا اولین باب ''جموں و کشمیر میں اُردو شعر و ادب ایک تعارف'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کے آغاز وارتقاء کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ریاست میں اُردو ادب کے آغاز اور اس سلسلے میں مختلف ادوار میں اُردو زبان کو وسیلۂ اظہار بنانے والے قلم کاروں کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ریاست میں اُردو شاعری، افسانوی و غیر افسانوی نثر،تنقید و تحقیق اور صحافت کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں بھی مختصر جانکاری فراہم کی گئی ہے۔

''جموں و کشمیر میں اُردو غزل کا آغاز و ارتقاء'' کتاب کا باب دوم ہے۔اس باب میں ریاست جموں و کشمیر میں اُردو غزل کے آغاز اور مختلف ادوار کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ریاست میں اُردو غزل کے ابتدائی دور سے لیکر موجودہ دور تک کے نئے شعراء کے شاعرانہ امتیازات کا مختصراً احاطہ اس باب کے تحت کیا گیا ہے۔ ریاست میں کلاسیکی،ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید تحریکات اور رجحانات کے زیر اثر لکھی جانے والی غزل کو بھی اسی باب میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کا باب سوم ''جموں و کشمیر کے نمائندہ غزل گو شعراء ۱۹۴۷ء کے بعد'' ہے۔ اس باب کو دو ذیلی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ (ا) میں ۱۹۴۷ء کے بعد وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے نمائندہ اُردو غزل گو شعراء کے حالات زندگی اور غزل گوئی کا جائزہ تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ حصہ (ب) میں صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے اُردو غزل کے ان شعراء کے حالات زندگی اور غزل گوئی کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، جنہوں نے تقسیم ہند کے بعد یہاں اُردو غزل میں نمائندگی کی ہے۔

کتاب کا باب چہارم ''جموں و کشمیر میں اُردو غزل کا مستقبل اور امکانات'' ہے۔ اس میں راقم نے ریاست میں اردو غزل کے ان شعراء کو موضوع بحث بنایا ہے جن میں بیشتر ابھی شاعری کے ابتدائی مراحل سے گزر رہے ہیں۔ یہ شعراء گزشتہ دو تین دہائیوں سے غزل کہنے میں منہمک ہیں اور مستقبل میں ان سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتیں ہیں۔

راقم کے اس کام میں یقیناً کئی خامیاں اور کوتاہیاں رہ گئیں ہونگی، جس کا مجھے اعتراف ہے۔ علاوہ ازیں بعض ایسے شعراء کو مواد کی عدم موجودگی کے باعث نہ چاہتے ہوئے بھی نظر انداز کرنا پڑا جن کا تذکرہ اس کتاب میں ہونا چاہیے تھا۔ جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

میں زیر نظر کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں سب سے پہلے اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے مجھے کتاب کی ترتیب و تہذیب کے دوران مختلف اور مشکل راہوں سے گزار کر اس کام کو انجام تک پہنچانے کی توفیق عطا کی۔ میں ریاست کے ان تمام شعراء حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، جن کے ساتھ کتاب کی بابت مواد حاصل کرنے کے لئے میں نے ذاتی ملاقاتیں کیں اور جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کرنے کے علاوہ مجھے مطلوبہ مواد بھی فراہم کیا۔ میں ریاست و بیرون ریاست کے اپنے مشفق و مہربان اساتذہ، پروفیسر شہناز نبی، پروفیسر فہمیدہ منصوری، پروفیسر نازنین منصوری، پروفیسر شفق سوپوری، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر لیاقت جعفری، ڈاکٹر مشتاق حیدر وغیرہ کا سپاس گزار ہوں جنہوں نے میرے اس کام کی ترتیب و تزئین کے دوران اپنے مفید مشوروں سے نواز کر میری حوصلہ افزائی کی۔

میں اپنے والدین محترم عبدالغفار گنائی اور محترمہ ساجدہ بانو کی عنایتوں، شفقتوں اور محبتوں سے گراں بار ہوں۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، یہ ان کی دعاؤں کا ہی ثمرہ ہے۔ میں ان کی صحت کامل اور درازِ عمر کے لئے دعا گو ہوں۔ میں اپنے برادران، ممتاز احمد، عبدالحمید، یونس احمد، اور شمیم احمد کا بے حد احسان مند ہوں کہ جنہوں نے قدم قدم پر میری ہمت باندھی اور مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ ان پیارے بھائیوں کی بھرپور حوصلہ افزائی سے میرا یہ کام خوش اسلوبی سے انجام کو پہنچا۔

میں اپنے عزیز دوستوں ڈاکٹر محمد حسین وانی، شآد سجاد، ڈاکٹر محمد یٰسین گنائی، ڈاکٹر فاروق احمد وانی، ڈاکٹر ریاض احمد میر، بلال احمد ڈار اور سرفراز عالم کا شکریہ ادا کرنا بے حد ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری کے دوران پروف ریڈنگ اور املا کی دُرستی میں میری مدد کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا کرے، آمین۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ''جموں و کشمیر میں اُردو غزل ۱۹۴۷ء کے بعد'' اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے، جو کہ میری بھی پہلی کاوش ہے۔ راقم نے موضوع کے ساتھ اپنی استداد کے مطابق انصاف کرنے کی کوشش کی ہے، پھر بھی اس میں کئی خامیاں رہ گئی ہونگی۔ مجھے امید ہے کہ قارئین میری اس حقیر سی کوشش میں شامل کوتاہیوں سے قطع نظر میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

مشتاق احمد گنائی

باب اول

جموں و کشمیر میں اُردو شعر و ادب: ایک تعارف

انسان ایک حیوان ناطق ہے، یہ وصف اس کو دیگر حیوانات سے برتر بناتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی بے شمار نعمتوں میں زبان ایک بہت بڑی نعمت ہے۔زبان اور دیگر صفات کی ہی بدولت انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔باقی تمام حیوانات کے برخلاف انسان اپنے جذبات واحساسات، تجربات اور مشاہدات کا اظہار زبان کے ذریعے کرتا ہے۔دنیا بھر کے ممالک میں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں، جو اپنی مخصوص تہذیب وتمدن کی شناخت اور نمائندگی کرتی ہیں۔ہندوستان دنیا کا ایک بڑا ملک ہے، جہاں سینکڑوں زبانیں بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہیں، جن میں اردو، ہندی، پنجابی، مراٹھی، سندھی، گجراتی، بنگالی، ہریانوی، بھوجپوری، تمل، تیلگو، کنڑ، ملیالم اور کشمیری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر تمام دنیا میں اپنے خوبصورت نظاروں، آبشاروں، سبزہ زاروں، رعنائیوں، برفیلے پہاڑوں، وادیوں، جھیلوں اور ندی نالوں کی بدولت جنت بے نظیر کہلاتی ہے، جس کی خوبصورتی کے بارے میں مشہور مغل بادشاہ شاہ جہاں نے بجا طور پر کہا ہے ؎

گر فردوس بہ روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

جموں وکشمیر میں بھی متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں کشمیری، لداخی، ڈوگری، شینا، پشتو، پنجابی، گوجری، پہاڑی پوگلی، بلتی زبانیں شامل ہیں۔اس کے علاوہ مختلف حکمرانوں کے ادوار حکومت میں مختلف زبانیں جیسے سنسکرت، فارسی اور اردو رائج رہی ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر پر لکھی گئی مختلف اور متنوع تاریخی کُتب کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ یہاں صدیوں پہلے ہندوؤں کے دور حکومت میں سنسکرت زبان کا چلن تھا، اور اسی زبان کو درباری زبان کا درجہ حاصل تھا۔اس کے بعد کشمیر میں شہ میری خاندان کی حکمرانی کا دور شروع ہوتا ہے۔شاہ میری حکومت کے ابتدائی دور میں سنسکرت ہی درباری زبان تھی۔چونکہ ان کی زبان فارسی تھی، لہٰذا رفتہ رفتہ فارسی نے عوامی سطح پر اپنی پہچان بنانی شروع کی، اور بہت جلد سنسکرت زبان کے ساتھ قدم سے قدم ملانے لگی۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سنسکرت زبان کی جگہ فارسی زبان کو درباری زبان بنایا گیا۔مغلوں کے دور حکومت میں بھی فارسی زبان ہی کا دور دورہ تھا، اور اسی کو سرکاری زبان ہونے کا افتخار حاصل تھا۔جب ہندوستان میں مغلوں کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور انگریز ہندوستان پر قابض ہو رہے تھے، اس کا اثر ریاست جموں وکشمیر پر بھی پڑا۔چونکہ ریاست دلی سے دور ایک پہاڑی سلسلے کے بیچ واقع ہے۔اس وجہ

سے انگریزوں نے ۲۱/مارچ ۱۸۴۶ء میں امرتسر معاہدے کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں کشمیر کو محض پچھتر (۷۵) لاکھ روپیوں میں فروخت کر دیا۔

اس معاہدے کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں ڈوگرہ حکمران مسندِ شاہی پر براجمان ہوئے، چونکہ ریاست میں فارسی زبان درباری زبان تھی تو مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور حکومت میں بھی یہی زبان سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج رہی۔ انگریزوں نے واردِ ہندوستان ہوتے ہی یہاں کی عوامی زبانیں سیکھنے کی کوششیں کیں، جن میں ایک زبان ہندوستانی تھی، جو آگے چل کر ہندی، ہندوی، ہندوستانی اور بھر اُردو کہلائی۔ یہ زبان پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور مقبول عام ہو رہی تھی۔ انگریزوں نے فارسی زبان کی بہ نسبت اسی زبان کی سرپرستی کی۔ انگریزوں کو اُردو سکھانے کے لیے فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ جس کی بدولت یہ زبان ہندوستان کے طول وعرض میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنے منازل طے کرنے لگی۔ خاص طور پر دہلی، لاہور، لکھنؤ وغیرہ علاقوں میں اس زبان کو خوب فروغ ملا۔

ریاست کے ڈوگرہ حکمرانوں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تعلقات پنجاب سے بہت پہلے سے ہی تھے، علاوہ ازیں کشمیری عوام تجارت، تعلیم اور ملازمت و روزگار کی غرض سے پنجاب اور ملحقہ علاقوں میں جاتے رہتے تھے، جہاں اردو زبان کا چلن عام تھا، جس کا اثر کشمیر سے آئے ان لوگوں پر پڑنا لازمی تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے سیاح اور سیلانی کشمیر کی خوبصورتی سے محظوظ ہونے کے لیے آئے دن آتے رہتے تھے، یہ لوگ اردو زبان بولتے تھے اور کشمیری عوام سے اسی زبان میں بات کرتے تھے۔ اہل کشمیر اس زبان کو سمجھتے تھے، جس کی تصدیق طبقات العرض کے ماہر سر فیڈرک ڈریو نے اپنی کتاب ''دی جموں اینڈ کشمیر ٹریٹریز'' (The Jammu and Kashmir Territories) میں کچھ اس طرح کی ہے:

''ہندوستان سے بہ سلسلہ ملازمت آنے والے لوگ بلاشبہ ہندوستانی بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔''[۱]

مشہور کشمیری نثر نگار، صحافی اور شاعر منشی ہر گوپال خستہ اپنی کتاب ''گلدستۂ کشمیر'' (۱۸۸۳ء) جو اردو نثر میں کشمیر کی پہلی تاریخ ہے۔ کشمیر میں اردو زبان کی ابتداء کے بارے میں اظہار خیال یوں کرتے ہیں:

''گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ اردو بولتے ہیں۔ اور ہانجیوں وغیرہ طائفوں کے لوگ سیاح سیلانیوں کے ساتھ اسی زبان میں ٹوٹی پھوٹی گفتگو کر لیتے ہیں۔''[۲]

مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد ان کے جانشین مہاراجہ رنبیر سنگھ نے حکومت کی طناب اپنے ہاتھ میں لی۔ مہاراجہ

رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں اگر چہ فارسی ہی سرکاری زبان رہی، لیکن انھوں نے اردو زبان کے لیے کئی تاریخ ساز اقدامات اٹھائے، جن میں سرکاری اسکولوں میں اردو درس و تدریس ایک اہم اور ناقابل فراموش قدم تھا۔اس سلسلے میں پروفیسر عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں:

> ''مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اردو کی علمی، ادبی اور افادی اہمیت کے مدنظر اسے ذریعۂ تعلیم اور ادبی اظہار کا وسیع موقف حاصل ہو چکا تھا، اور یہ دفتروں، عدالتوں اور دربار کی زبان بن گئی تھی۔اس زمانے میں کشمیری ادیبوں کے بیرون ریاست کے ادیبوں سے روابط میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور بعض چوٹی کے ادیب کشمیر آنے جانے لگے۔''[۳]

اتنا ہی نہیں بلکہ رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں انھی کے حکم نامے کے تحت ریاست میں پہلا چھاپہ خانہ ۱۸۸۲ء میں ''بدیابلاس'' کے نام سے قائم کیا گیا۔اور اسی مطبع سے ۱۸۸۲ء میں ہی ایک سرکاری اخبار ''بدیابلاس'' کے نام سے جاری کیا گیا۔یہ اخبار ذولسانی تھا اور اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔اس اخبار کی بدولت ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کی ترویج و ترقی میں کئی راہیں روشن ہوئیں۔اس زمانے کے ریاست کے قلمکاروں میں منشی پنڈت ہرگوپال خستہ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ خستہ لاہور اور پٹیالہ میں عرصۂ دراز تک مقیم رہنے کے دوران درس و تدریس کے علاوہ مختلف اخباروں کے ساتھ منسلک رہے۔جن میں ''تحفۂ کشمیر''،''خیر خواہ کشمیر''،''راوی''،''دیش کی پکار'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔پنڈت ہرگوپال خستہ، حالی اور شبلی کے معاصر تھے، اور اردو زبان وادب سے پوری طرح آشنا تھے۔وہ اردو کے ایک اچھے شاعر اور ادیب بھی تھے۔۱۸۷۶ء میں وہ وطن واپس لوٹے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔یہاں انھوں نے اپنی لیاقت، قابلیت اور زبان دانی کا بہترین مظاہرہ کیا، اور ''گلدستۂ کشمیر'' اور ''گلزار فوائد'' جیسی تاریخ ساز کتابیں تصنیف کیں۔جن کی اہمیت کشمیر میں اردو کی ابتدا کے سلسلے میں ہمیشہ برقرار رہے گی۔بقول ڈاکٹر برج پریمی:

> ''خستہ کے کئی نثری کارنامے ہیں۔ان کی گلدستۂ کشمیر اردو نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے۔جو عہد قدیم سے لے کر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد کا احاطہ کرتی ہے۔یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔''[۴]

۱۸۸۵ء میں رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند اکبر مہاراجہ پرتاپ سنگھ ریاست کے نئے حکمران کی صورت میں جلوہ افروز ہوئے۔پرتاپ سنگھ کے دور حکومت تک اردو نے ریاستی سطح پر پوری طرح سے اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔اردو پڑھنے والوں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔علاوہ ازیں یہاں کے

فنکار اس زبان میں اپنے جذبات واحساسات اور خیالات کو آراستہ کرنے لگے تھے، جس میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ اردو کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے سیاسی مصلحت پسندی کے تحت ریاست کے تینوں خطوں کشمیر، جموں اور لداخ کو ایک لسانی دائرے میں سمونے کے لیے مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ایک تاریخ ساز قدم اٹھایا اور ۱۸۸۹ء میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا۔ یہ امر ریاست میں اردو زبان کی تاریخ میں ناقابل فراموش حیثیت رکھتا ہے۔ سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے بعد اردو نے یہاں کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظرنامے پر مثبت اثرات مرتب کیے۔ یہ زبان اب باقاعدہ مدارس، سرکاری محکموں اور عدالتوں میں بہ روئے کار لائی جانے لگی۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی تصنیف ''کشمیر میں اردو'' میں کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''یہ صحیح ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی حکومت نے اپنے پیش رو کی طرح اردو کی ترقی کے لیے کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا۔ اس کے باوجود عوامی مقبولیت کے بل بوتے پر اردو پھیلتی اور پھلتی پھولتی رہی، اجتماعی اور تعلیمی اور علمی اور ادبی زندگی کے ساتھ یہ زبان ایسی لازم وملزوم ہوگئی تھی کہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں اسے سرکاری زبان قرار دے کر پرتاپ سنگھ کے ہی عہد میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا۔'' ۵

ریاست میں اردو زبان کی اشاعت میں اخبارات کا رول نمایاں رہا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے برسوں تک بیرون ریاست سے شائع ہونے والے اخبارات کی بدولت کشمیری عوام کا رابطہ ان علاقوں سے قائم ہوا۔ پنجاب، لاہور اور دہلی وغیرہ سے شائع ہونے والے یہ اخبارات زیادہ تر یہاں کے معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کو پیش کرتے تھے۔ ان اخبارات میں یہاں کے پڑھے لکھے طبقے کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے، جن کی بدولت ان کی ادبی صلاحیتوں کو جلا ملی۔

صحافت کے میدان میں ایک درخشاں نام محمد الدین فوق کا ہے۔ فوق نے کشمیری عوام کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے لاہور اور کشمیر سے متعدد اخبارات جاری کیے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب، شاعر اور صحافی تھے۔ انھوں نے نہ صرف صحافت بلکہ اردو ادب کی بھی بے لوث خدمات انجام دیں ہیں۔ فوق نے ناول، شاعری، افسانہ، تاریخ اور تذکرہ نگاری میں بھی لاجواب کارنامے انجام دیئے ہیں۔ لالہ ملک راج صراف جن کو کشمیر میں اردو کے بابائے صحافت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے انہوں نے ۱۹۲۴ء میں ریاست کا پہلا اردو اخبار ''رنبیر'' جموں سے جاری کیا۔ اس اخبار کی بدولت کشمیر میں اردو نثر کی راہیں ہموار ہونے لگیں۔ ریاستی ادیبوں کو اپنی ادبی کاوشوں کو ابھارنے میں اس اخبار نے آبِ حیات کا کام

کیا۔اس اخبار سے منسلک ادیبوں میں کشپ بندھو، مولوی زین العابدین، سالگ رام کول سالک، مولوی عبداللہ وکیل، پریم ناتھ بزاز، بلدیو پرشاد شرما، عشرت کشتواڑی، غلام حیدر چشتی، قیس شیروانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

''رنبیر'' کی اشاعت کے ٹھیک نو سال بعد ۱۹۳۳ء میں سرینگر سے پہلا اخبار ''وتستا'' کے نام سے پریم ناتھ بزاز نے جاری کیا۔اس کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور پریم ناتھ بزاز نے مل کر ۱۹۳۵ء میں ہفت روزہ ''ہمدرد'' جاری کیا۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے متعدد اخبارات سرینگر اور جموں سے اجرا ہوتے رہے، اور ۱۹۴۷ء تک ایک اندازے کے مطابق اردو اخبارات کی تعداد ۴۷ سے تجاوز کر چکی تھی، اور یہ سلسلہ آج بھی بدستور جاری ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو کے پھیلنے اور پھولنے پھلنے میں بمبئی کی تھیٹریکل کمپنیوں کا بھی بڑا احسان رہا ہے۔ یہ کمپنیاں یہاں مختلف ڈراموں کو اسٹیج پر پیش کرتی رہیں۔جس کو دیکھنے کے لیے لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہوتی تھی۔انہی کمپنیوں کی بدولت ریاست کی عوام آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں سے متعارف ہوئی۔اس سلسلے میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''ریاست میں اردو کی مقبولیت اور اشاعت میں بمبئی کی تھیٹریکل کمپنیوں کا بڑا حصہ رہا۔ یہ کمپنیاں جموں وکشمیر میں اپنے کھیل کو دکھاتیں، جن کو دیکھنے کے لیے لوگ جوق در جوق آتے، اور جب وہ کھیل دیکھ کر نکلتے تو غزلیں اور گیت ان کے کانوں میں رچی ہوئی ہوتی اور گنگناتے جاتے ان کمپنیوں نے آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کو جموں وکشمیر کے عوام سے روشناس کرایا۔''[6]

ریاست میں اخبارات کے اجرا ہونے کے بعد یہاں سیاسی بیداری کا آغاز ہوا۔ریاستی عوام اندرون ریاست کے ساتھ ساتھ بیرون ریاست کے حالات وواقعات سے انہی اخبارات کے ذریعے باخبر ہو رہے تھے۔بیسویں صدی کے نصف اول سے ہی یہاں سیاسی ہنگامہ آرائی شروع ہوتی ہے۔ریاست کے باشندوں نے اپنی فریاد بہ زبان اردو ہی حکومت کے ایوان تک پہنچائی۔اس سلسلے میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''اس (بیسویں صدی) کی چوتھی دہائی کشمیر میں سیاسی اور تمدنی بیداری کا صبح صادق تھی کہ یہ دونوں رجحانات ایک دوسرے کے ہمراز اور دمساز ہوتے ہیں۔علامہ اقبال اسی دہائی کے ابتداء میں کشمیر آئے اور یہاں دل پر زخم کھا کر چلے گئے۔ یہ زخم بعد میں کشمیر کی نجات کے گلشن زار جدید شگوفہ ثابت

ہوا۔ان کے واپس لاہور پہنچتے ہی وہاں کے اردو اخبارات نے کشمیریوں کے بارے میں انکشافات کا سلسلہ شروع کر دیا۔۔۔۱۹۳۰ء کے لگ بھگ عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کا ''انقلاب'' کشمیر کی تحریک کا ہراول دستہ بن گیا۔اس اخبار نے کشمیر دربار کی بے مہریوں کو بے نقاب کرنا اور کشمیر میں مسلمانوں کی مظلومیت کا بالخصوص پردے چاک کرنا شروع کیا۔ یہ مضامین شیخ عبداللہ ہی کی مساعی سے وہاں پہنچے تھے، چنانچہ آج یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ۱۹۳۱ء میں کشمیر کی تحریک آزادی کے رسمی آغاز سے پہلے جن واقعات نے کشمیر کے ساکن پانیوں میں پتھر پھینک کر ارتعاش پیدا کر دیا، ان میں ۱۹۳۱ء کے ابتدائی مہینوں میں انقلاب کے داخلہ کشمیر پر پابندی شامل ہے۔ اس کاروائی پر کشمیر اور کشمیر کے باہر بڑا غل مچا۔لیکن خود ادارہ ''انقلاب'' نے اس کا توڑ یوں کیا کہ اس نے ''مکتوب کشمیر'' کے نام سے ایک اور اخبار نکالا اور اس میں اور زیادہ شدت سے مہاراجہ اور اس کی حکومت پر برس پڑا۔اس پر بھی پابندی عائد کر دی گئی تو فوراً ''کشمیری مسلمان'' کے نام سے ایک اور اخبار نکالا گیا۔اس سلسلے کا تیسرا اخبار ''مظلوم کشمیر'' تھا....بقول شیخ عبداللہ یہ اخبارات جن کی قیمت ایک پیسہ فی پرچہ ہوتی تھی، ایک دو بلکہ پانچ پانچ روپے میں بکتے تھے۔'' ۷

اس طرح ریاستی عوام میں جدوجہد آزادی کا جذبہ بیدار ہو گیا اور اس میں اردو اخبارات نے نمایاں کردار ادا کیا۔ پروفیسر نذیر احمد ملک اپنے ایک مضمون ''کشمیر میں اردو: ایک لسانی جائزہ'' میں اس کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''کشمیر میں اردو کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ تحریک آزادی کشمیر کا سارا مواد اسی زبان میں چھپتا تھا۔ یہاں کے لیڈر اور تحریک آزادی کے بانی شیخ محمد عبداللہ تحریک آزادی کے نعرے اسی زبان میں بلند کرتے تھے۔ اپنی تقریروں کا آغاز اُردو شعراء اور خاص کر کلام اقبال سے کرتے تھے۔'' ۸

اس بات کی تصدیق محمد یوسف ٹینگ کے لکھے ایک مضمون ''ریاست میں اردو ادب'' سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شیخ عبداللہ نے جن ابتدائی زمروں سے کشمیریوں کے دل میں آزادی کی
آگ لگادی، وہ اقبال، آغا حشر اور عبدالمجید سالک کے تھے۔"[9]

اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

یارب دل مسلم کو زندہ تمنا دے
جو قلب کو تڑپا دے جو روح کو گرما دے (علامہ اقبال)

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے (آغا حشر)

تمہیں سے اے مجاہدو جہاں کی حیات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
(عبدالمجید سالک)

اس کے بعد ریاست میں اردو زبان کا چلن عام ہو گیا اور ڈوگرہ حکومت کے خاتمے کے بعد بھی ریاست میں اردو زبان کی سرکاری حیثیت حاصل رہی ہے جو کہ موجودہ دور تک برقرار ہے۔ ریاست جموں و کشمیر ہندوستان کی واحد ایسی ریاست ہے جس کی سرکاری زبان اردو ہے، اس سے بھی ریاست میں اردو زبان کے چلن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ریاست میں اردو زبان دسویں جماعت تک ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں درجہ اول سے یونیورسٹی سطح تک اردو تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ریاست میں ہر سال آٹھ (۸۰۰) سو کے قریب طلبا ایم۔ اے اُردو کی سند حاصل کرتے ہیں۔ جو ریاست میں اردو کے روشن مستقبل پر دلالت کرتا ہے۔

جہاں تک ریاست میں اردو کے تخلیقی ادب کی ابتدا کا تعلق ہے تو یہاں بھی ملک کی دیگر بڑی زبانوں کی طرح نثر کے مقابلے میں پہلے شاعری ہی کے نمونے ملتے ہیں۔ سنسکرت اور فارسی کی طرح یہاں کے ادب نواز اور ادب دوست فنکاروں نے اردو میں کلام موزوں کر کے اپنی شناخت قائم کی۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی کڑی میر کمال الدین حسین اندرابی رسوا کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جنھیں کشمیر میں اردو کا پہلا باقاعدہ شاعر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بقول عبدالقادر سروری:

"میر کمال الدین حسین اندرابی رسوا سے کشمیر میں اردو کے ترقی یافتہ روپ کا آغاز ہوتا ہے۔ رسوا اورنگ زیب کے آخری عہد کے کشمیری انشا پردازوں اور شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ کم و بیش شمالی ہند کے ابتدائی

لکھنے والوں جعفر زٹلی افضل اور فضلی کے معاصر تھے۔''۱۰

اکبر شاہ ثانی کے دربار میں بحیثیت ملازم رسوا ایک عرصے تک دہلی میں مقیم تھے اور جب شہزادہ شکست سے دوچار ہوئے تو رسوا اپنے وطن کشمیر لوٹے۔ ان کے مکاتیب اور فارسی وار دو کلام کو ان کے شاگرد عزیز لچھی رام نے مرتب کر کے ''رقعاتِ حاتم الکمال'' کے نام سے شائع کیا۔ جس میں رسوا کے خطوط کے علاوہ ریختہ، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

رسوا کے بعد جن سخن سنجوں نے ریاست میں فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کی راہیں بھی ہموار کیں، ان میں مرزا عبدالغنی بیگ قبول، پنڈت دیا رام کاچرو خوش دل، مرزا محمد جان بیگ سامی، خواجہ امین الدین خان امین، محمد علی حشمت، خواجہ احسن اللہ خان بیاں وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ریاست میں اردو شاعری کی کوئی بھی تاریخ ''دو بھائی ادیب'' یعنی پنڈت ہر گوپال کول خستہ اور سالگ رام سالک کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہوگی۔ یہ دونوں بھائی اردو زبان پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے صحافت، تاریخ، نثر اور شاعری میں اپنے جوہر دکھائے ہیں، جن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کے شعر ملاحظہ فرمایئے۔

پلا ساقیا مجھ کو جامِ شراب
کہ ہوتی ہیں اب کشتیاں غرق آب

خوب ڈھونڈا جہاں میں اے خستہ
خستگی کا نہ آشنا دیکھا (ہر گوپال خستہ)

گرداب محبت سے ہوا کوئی نہ جاں بر
یہ بحر وہ ہے جس کا کنارہ نہیں ہوتا (سالگ رام سالک)

چودھری خوشی محمد ناظر جو کہ کشمیر میں گورنر کے عہدے پر عرصۂ دراز تک فائز رہے ہیں، نے ریاست میں اردو شاعری کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کا وطن گجرات تھا، لیکن عمر کا بیشتر حصہ کشمیر میں ہی گزارا۔ وہ ایک بلند مرتبہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے کشمیر کی خوبصورتی کے پیش نظر متعدد نظمیں لکھی ہیں، جو ان کے مجموعۂ کلام ''نغمۂ فردوس'' میں موجود ہیں۔ جھیل ڈل کی خوبصورتی کا عکس کچھ اس طرح کھینچتے ہیں۔

ہیں شکارے میں سیہ چشم بتانِ کشمیر
یا اترتے ہیں غزالانِ حسن پانی میں
لبِ ڈل آپ بھی کاشانہ بنالیں ناظر

موسم گل میں رہے لطفِ سخن پانی میں

ناظؔر نے کشمیر میں اردو شعراء کے مذاق کو سنوارنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ناظؔر کے دور کے دیگر شعراء میں مرزا اسعد الدین سعدؔ، منشی امیر الدین امیر، منشی غلام محمد خادم، صادق علی خان صادقؔ وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ریاست میں اردو شاعری کو تقویت دینے میں یہاں قائم کی گئیں مختلف انجمنوں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں انجمن مفرح القلوب، انجمن اسلامیہ، انجمن نصرت الاسلام سرینگر، بزمِ مشاعرہ جموں، بزمِ اردو جموں و سرینگر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان انجمنوں میں ریاست کے علاوہ ملک بھر کے نامور شعراء بھی شریک ہوتے تھے۔ جن میں علامہ اقبالؔ، سر عبدالقادر، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی، یگانہ چنگیزی، حفیظ جالندھری، تاجور نجیب آبادی، جگر مراد آبادی، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، روش صدیقی، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محمد دین تاثیر وغیرہ ایسے نام ہیں جن سے پوری اردو دنیا مانوس ہے۔ ان شعراء کی وقتاً فوقتاً کشمیر آمد سے یہاں کے مقامی شعراء کا مذاق سخن بھی سنورتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۴۷ء تک ریاست میں اردو شعراء کی ایک کثیر تعداد اُبھر کر شعری افق پر نمودار ہوئی۔ ان میں نندلال کول طالبؔ کاشمیری، کشن سمیل پوری، رسا جاودانی، پنڈت نندلال کول بے غرضؔ، قمرؔ قمرازی، مرزا کمال الدین شیداؔ، دینا ناتھ مست چکنؔ، میر غلام رسول نازکیؔ، شہ زور کاشمیری، دینا ناتھ رفیقؔ، عشرتؔ کاشمیری، اثرؔ صہبائی، نشاطؔ کشتواڑی، منوہر لال دلؔ، غ۔م۔ طاؤسؔ، وشوناتھ درماہؔ، غلام علی بلبلؔ وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بیشتر شعراء کا کلام نہ صرف ریاست بلکہ ملک کے نامور رسائل و جرائد میں شائع ہوا ہے۔ علاوہ ازیں کئی شعراء کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

پنڈت نندلال کول طالب ریاست میں اُردو شاعری کے ایک روشن ستارے ہیں۔ انھوں نے اردو غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی، لیکن نظم ان کی محبوب صنفِ سخن رہی ہے۔ ان کے کلام کا نمایاں موضوع کشمیر ہے۔ ان کی متعدد نظمیں جنت بے نظیر کی عکاسی کرتی ہیں۔ جس کی ایک منفرد مثال نظم ''بہار کشمیر'' ہے۔ کشمیر کی خوبصورتی کے علاوہ طالب کے یہاں قومی، تہذیبی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔ نظم ''بہار کشمیر'' سے یہاں دو شعر نقل کرتا ہوں ؎

شکست آرزو تھی لطفِ بہار دیکھوں
کاشانہ چمن کے نقش و نگار دیکھوں
باغِ نشاط میں ہو دل کو نشاط حاصل

تازہ نسیم ڈل اور شالامار دیکھوں

وادیٔ بھدرواکے رہنے والے رسا جاودانی کا نام ریاست کے قادرالکلام اردوشعراء میں ہوتا ہے۔ مناظر قدرت پر کچھ نظموں کے علاوہ ان کے کلام کا متعدد بہ حصہ غزلوں پر مشتمل ہے، جوان کی محبوب صنف سخن رہی ہے۔اشعار ملاحظہ فرمائیں ؂

بے یقینی ہے سُستی ایمان
ضعف اوہام کا سہارا ہے
تیری فرقت میں تجھ سے ملنے تک
تیرے پیغام کا سہارا ہے

منوہرلال دلؔ بھی ریاست میں اردوشاعری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔وہ غزل اور نظم کے شاعر ہیں، لیکن غزل سے وہ زیادہ شغف رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنی غزلوں کے لیے زیادہ تر چھوٹی بحروں کا استعمال کیا ہے۔''نقدِ دل'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔اشعار دیکھیں ؂

یہ خضرہ کی بدولت نہ کارواں کے طفیل
ملی حیات کی منزل غم جواں کے طفیل
ہرایک اہلِ سخن دلؔ ہے تیرا گرویدہ
نئی زمین غزل اور نئے بیاں کے طفیل

میر غلام رسول نازکی کا شمار ریاست کے سربرآوردہ شعراء میں ہوتا ہے۔وہ اُردوزبان پر غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں، اور اسی زبان کو انھوں نے اپنے جذبات کے اظہار کا مؤثر وسیلہ بنایا ہے۔انھوں نے غزل، نظم، رباعی اور قطعات وغیرہ جیسی اصناف سخن میں کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔

محبوب کے ہونٹوں پرسیلاب تبسم ہے
یانور کے دریا کی موجوں میں تلاطم ہے

اس کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں جن شعرا نے اردو زبان کی خدمت کی اور شاعری کے علم کو نئی بلندیوں تک پہنچایا، اُن میں عرشؔ صہبائی، قیصرؔ قلندر، عابدؔ مناوری، اندر جیت لطفؔ، نشاطؔ انصاری، ودیا رتن عاصیؔ، شوریدہ کاشمیری اور سیفیؔ سوپوری وغیرہ کے نام کئی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ان حضرات کا کلام ملک گیر سطح پر پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ان میں بیشتر شعراء کا کلام اس دور کے ہندوپاک کے نمائندہ ادبی رسائل میں شائع ہوا ہیں۔

عرشؔ صہبائی کا نام اردو کے قدآور شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔انھوں نے اردوشاعری کی بے

لوث خدمت کی ہیں آج بھی یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔عرشؔ صہبائی اپنے جذبات واحساسات کوزیادہ تر غزل کے سانچے میں منتقل کرتے ہیں۔اگر چہ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں،لیکن ان کی شناخت غزل کی بدولت ہی قائم ہوئی ہے۔اشعار ملاحظہ فرمائیں

عرش ان جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور
ڈوبنے والے کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

گوری نند بالی عابدؔ مناوری ریاست کے اہم شاعر ہیں۔حسن وعشق کے موضوع کو انھوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔اس کے علاوہ ان کی شاعری میں انسان دوستی،بے ثباتی دنیا اور وطن کی محبت وغیرہ جیسے مضامین ملتے ہیں۔چنانچہ کہتے ہیں۔

دلِ انسان کو سکوں مل نہ سکا
جستجو شمس و قمر تک پہنچی

قیصرؔ قلندر غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔رومان ان کی شاعری کا خاص موضوع رہا ہے۔پنڈت ودیارتن عاصیؔ کا شمار ریاست کے معتبر شاعروں میں ہوتا ہے۔شاعری میں غزل ان کی محبوب صنفِ سخن رہی ہے۔غزل میں انھوں نے اپنے دردِ دل کی داستان بہت ہی خوبصورتی سے بیان کی ہے۔شوریدہؔ کاشمیری ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔زندگی کے نشیب وفراز اور دیگر معاملات کو انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔مذکورہ شعراء کا ایک ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں احساس کے نازک سینے میں
اک حسن سا شامل رہتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں
(قیصر قلندر)

بیٹھے ہو سرِ راہ گزر کیوں نہیں جاتے
تم لوگ تو گھر والے ہو گھر کیوں نہیں جاتے
(ودیارتن عاصی)

داغ دل ہے حاصل عمر عزیز
یہ عطائے بے بہائے درد ہے
(شوریدہ کاشمیری)

ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا اہم دور ۱۹۶۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔اس دور کے اکثر شعراء کے کلام میں داخلیت،خود پسندی،دنیا کی بے ثباتی،انسانی قدروں کی پامالی اور انکشاف ذات وغیرہ جیسے

موضوعات نظر آتے ہیں۔اس دور کے شعرامیں حکیم منظور، ہمدم کاشمیری، حامدی کاشمیری، مظفر ایرج، رفیق راز، شہباز راجوروی، فاروق نازکی، پرتپال سنگھ بیتاب، شجاع سلطان، فاروق مضطر، خالد بشیر، رخسانہ جبین، احمد شناس فاروق آفاق اور شبیب رضوی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حکیم منظور ریاستی شعراء کی کہکشاں میں دور سے پہچانے جاتے ہیں۔انھوں نے برصغیر ہندوپاک میں اپنی شناخت قائم کی ہے۔منظور اردو غزل سے والہانہ شغف رکھتے ہیں۔اپنے جذبات واحساسات کو انھوں نے اکثر غزل کی صورت میں ہی بیان کیا ہے۔شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

کانگڑی بستر میں رکھ کر کھڑکیوں کو وا کروں
برف گرنے کا کبھی میں یوں ہی نظارا کروں

حامدی کاشمیری کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں۔افسانہ، ناول، تحقیق، تنقید اور شاعری غرض ہر میدان میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔وہ ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور شاعری کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہیں۔ان کی شاعری غزل، نظم، قطعہ اور رباعی پر مشتمل ہے۔ان کی شاعری میں متنوع موضوعات ملتے ہیں۔چنانچہ کہتے ہیں ؎

دہن وا کردہ منتظر قبریں ہیں
یہ جشن زندگانی شام تک ہے

مظفر ایرج کی پہچان قدیم اور جدید روایات کے حسین امتزاج کے شاعر کے طور پر ہوتی ہے۔ہمدم کاشمیری کی شاعری انسان کی مجروح روح کی داستان ہے۔فاروق نازکی کے یہاں فکر کی تازگی اور منفرد انداز بیاں نظر آتا ہے۔رفیق راز نے اپنے دل میں چھپے کئی پوشیدہ راز غزل کی صنف میں کھول کے رکھ دیئے ہیں۔ان کی شاعری ان کی ذات کا انکشاف کرتی ہے۔پرتپال سنگھ بیتاب ریاست کے معتبر شعراء میں ایک منفرد نام ہے۔انسانی قدروں کی پامالی، سماجی نابرابری، فرد کی تنہائی وغیرہ بیتاب کی شاعری کے توانا موضوعات ہیں۔احمد شناس اپنے شعری مجموعے ''پس آشکار'' سے اردو دنیا میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ان کے یہاں محرومی، ہجر، لاتعلقی اور بے ثباتی دنیا وغیرہ جیسے مضامین زیادہ نظر آتے ہیں۔مذکورہ شعراء کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

تم نے چھوڑا تو غم نے ساتھ دیا
کوئی بے آسرا نہیں ہوتا
(مظفر ایرج)

کیا نہیں رکھا تھا میرے سامنے

پھر بھی سجدے سے نہ میرا سر اٹھا
(ہمدم کاشمیری)

وہ جو اترے تھے سرِ شام کبھی آنگن میں
چاندنی رات میں دینے کو صدا ہم ہی تھے
(فاروق نازکی)

گونج سکتی ہے کسی بھی وقت فنا کی جھنکار
سنگ سے کارگہہ شیشہ گراں دور نہیں
(رفیق راز)

بے مول بکوں گا وہ خریدار اگر ہو
حسرت ہے بس اک بار وہ بازار میں آئے
(پرتپال سنگھ بیتاب)

میں نے ہجرت کے کئی دور دیکھے ہیں
میں کتابوں سے کبھی دور نہیں ہوسکتا
(احمد شناس)

متذکرہ بالا شعراء کے بعد ریاست میں اردو شاعری کے میدان میں جن سخن سنجوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے، ان میں ایاز رسول نازکی، سید رضا، فرید پربتی، بلراج بخشی، تنویر بھدرواہی، اقبال فہیم، شفق سوپوری، نذیر آزاد، شبنم عشائی، ترنم ریاض، نصرت چودھری، عشاق کشتواڑی وغیرہ کے نام کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ دور حاضر کے نوجوان شعرا میں اشرف عادل، پرویز مانوس، سلیم ساغر، لیاقت جعفری، خالد کرار، شیخ گلزار، سجاد پونچھی، محتشم احتشام، لیاقت نیر، اقبال صدیقی، علمدار عدم اور اطہر بشیر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ریاست میں اردو شاعری کے متعلق اس مختصر جائزے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں جب سے اردو شاعری کا آغاز ہوا ہے، اس وقت سے لے کر موجودہ دور تک یہ سلسلہ بدستور جاری و ساری ہے۔ مستقبل میں بھی نئی نسل سے اچھی توقع وابستہ رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اردو آج بھی ریاست کی سرکاری زبان ہے اور یہاں کے فنکاروں نے اس کو آنکھوں پر بٹھایا ہے، اور اردو زبان میں اپنے جذبات واحساسات اور خیالات کو پیش کرنے میں ہمیشہ فخر محسوس کیا ہے۔

اردو شاعری کے علاوہ اردو نثر میں بھی ریاست جموں وکشمیر کے قلمکاروں نے ناقابل فراموش

کارنامے انجام دیئے ہیں۔افسانہ، ناول، ڈرامہ، خاکہ، سفرنامہ، انشائیہ، تحقیق وتنقید غرض اردو نثر کی جملہ اصناف میں یہاں کے ادیبوں نے کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔اردو شاعری کے بعد ریاست میں جس صنفِ ادب میں سب سے زیادہ پیش رفت ہوئی ہے، وہ اردو افسانہ ہے۔ریاست میں پہلا اردو افسانہ نگار کے طور پر تیرتھ کاشمیری، محمد الدین فوق اور پریم ناتھ پردیسی کے نام لیے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

> ''فوق نے روش زمانہ کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلمبند کیے،جنھیں ہم ریاست میں اُردوافسانے کے نقوشِ اول کہہ سکتے ہیں۔''[۱۱]

ڈاکٹر حامدی کاشمیری اپنی کتاب ''ریاست جموں کشمیر میں اردوادب'' میں تیرتھ کاشمیری کواردو کا پہلا افسانہ نگارتسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ریاست میں دراصل ادبی نثر کے عمدہ اور قابل قدر نمونے افسانوں ہی کی صورت میں ملتے ہیں۔اس سلسلے میں سب سے پہلا اہم نام تیرتھ کاشمیری کا ہے۔''[۱۲]

ریاست میں اردو افسانہ اورافسانہ نگار کے نقش اول کے حوالے سے مشہورومعروف افسانہ نگار نورشاہ اپنے خیالات کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''جب ہم کشمیر میں اردو افسانے کی بات کرتے ہیں تو پریم ناتھ پردیسی کا نام سامنے آتا ہے۔شاید اس لیے کہ ریاست میں اردو افسانے کی ابتدا پردیسی سے ہی ہوئی، اگرچہ ان سے پہلے بھی کئی افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے،لیکن پردیسی کے افسانوں کی اہمیت، افادیت اور انفرادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانے تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد بھی مشہورومعروف اور معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہے۔[۱۳]

مذکورہ بالا افسانہ نگاروں میں سب سے اہم اور معتبر نام پریم ناتھ پردیسی کا ہے۔ریاست میں باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز انہی سے ہوتا ہے۔ان سے پہلے جتنے بھی لکھنے والے تھے،ان کے افسانے فنی کسوٹی پر پورا نہیں اترتے ہیں۔پردیسی اردو افسانوی ادب سے آشنا تھے، وہ صنف افسانہ کی جملہ خصوصیات کا بھی بھرپور علم رکھتے تھے۔ان کی کہانیوں میں سماجی نابرابری، استحصال، طبقاتی کشمکش، کشمیر کی مفلسی، گھریلو زندگی کے مسائل وغیرہ اہم موضوعات ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی اردو زبان پر کامل دسترس رکھتے تھے، ان کا انداز بیان بھی منفرد تھا۔ان کے افسانوی مجموعے''شام وسحر'' دنیا ہماری'' اور''بہتے چراغ'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی، پریم چند سے بہت متاثر نظر آتے ہیں، ان کے افسانوں میں بھی پریم چند ہی کی طرح غریب عوام کی مظلومی، لاچاری، بے بسی اور بدحالی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔اس اعتبار سے پردیسی کو کشمیر کا پریم چند بھی کہا جاتا ہے۔

پردیسی کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ در، موہن یاور، رامانند ساگر، نرسنگھ داس نرگس، گنگا دھر بھٹ دیہاتی، دینا ناتھ مٹو، ٹھاکر پونچھی، تارا چند ترسل وغیرہ نے بھی افسانہ نگاری میں انمٹ نقوش قائم کیے۔ پردیسی کے بعد پریم ناتھ در جموں وکشمیر کے ایک اہم افسانہ نگار تصور کیے جاتے ہیں۔ان کے دو افسانوی مجموعے''کاغذ کا واسدیو'' اور''نیلی آنکھیں'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کی اکثر کہانیوں میں کشمیر کی خوبصورتی کی عکاسی ملتی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے یہاں کے غریب عوام کی بھی تصویر کشی کی ہے۔نرسنگھ داس نرگس بھی ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ان کی کہانیوں کا مجموعہ'' دکھیا دیس'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ٹھاکر پونچھی کا نام بھی ریاست کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے بے شمار چھوٹی بڑی کہانیاں قلمبند کیں ہیں۔''چناروں کے چاند، زندگی کی دوڑ'' اور''یادوں کے کھنڈر'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔موہن یاور انسانی نفسیات کے بڑے نباض تھے۔ انھوں نے تین افسانوی مجموعے''وسکی کی بوتل، سیاہ تاج محل'' اور'' تیسری آنکھ'' یادگار چھوڑے ہیں۔رامانند ساگر نہ صرف ریاست بلکہ برصغیر ہندوپاک کے قدآور افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی شہرت یافتہ کہانیوں میں''ٹنگمرگ کے اڈے پر، آبِ حیات'' اور'' آئینے'' قابل ستائش ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ملک بھر میں افراتفری، ناامیدی، محرومی اور مایوسی کا عالم چھایا رہا۔اس کے اثرات ریاست جموں وکشمیر کے قلمکاروں پر بھی پڑے۔جس کی عکاسی انھوں نے ملک کے دیگر ریاستوں سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کی طرح اپنی کہانیوں میں بھی کی۔اس دور میں ریاست کے افسانوی افق پر نمودار ہونے والے ادیبوں کی فہرست طویل ہے۔جن میں نور شاہ، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، برج پریمی، غلام رسول سنتوش، حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ، اختر محی الدین، صوفی غلام محمد، مخمور بدخشی، عمر مجید، ویدراہی، شبنم قیوم اور کلدیپ رعنا وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اگر اس کو ریاست میں اردو افسانے کا سنہرا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، کیونکہ اس دور سے تعلق رکھنے والے بیشتر افسانہ نگاروں کے یہاں ایسی کہانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، جو فن کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔اس سلسلے میں تیج بہادر بھان کا افسانہ''جہلم کے سینے پر''، علی محمد لون کے''پاپی پجارن کی سنتان'' اور''مونچھوں والی گڑیا'' حامدی

کاشمیری کا ''سندری''، پشکر ناتھ کے ''درد کا مارا'' اور ''پل نمبر صفر کے گدھ''، مخمور بدخشی کا ''نیل کنول مسکائے''، نورشاہ کے ''بے گھاٹ کی ناؤ'' اور ''ویرانے کے پھول''، برج پریمی کا ''سپنوں کی شام''، عمر مجید کا ''جہلم بہتا ہے''، کلدیپ رعنا ''ایک خط'' وغیرہ جیسے افسانے نمونے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا افسانہ نگاروں میں بعض کا انتقال ہو چکا ہے اور بعض آج بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھا رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے ساتویں دہے سے ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود ابھر کر سامنے آئی۔ ان کے یہاں احساس کمتری، وجودیت، انفرادیت، قدروں کی پامالی، انکشاف ذات، محرومی وغیرہ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ملک کے دیگر کہانی کاروں کی طرح یہاں کے ادیبوں میں بھی فنی، ہیئتی اور اسلوبیاتی سطح پر افسانے میں نئی تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس دور میں علامتی افسانوں کا رواج قائم ہوا۔ اس سلسلے میں پروفیسر قدوس جاوید اپنے ایک مضمون ''کشمیر میں اردو افسانہ کے بدلتے رجحانات'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''جب اردو میں جدیدیت کا رجحان شروع ہوا تو کشمیر کے افسانہ نگاروں نے ایسے جدید افسانے لکھے جن میں فیشن پرستی اور لایعنیت کے بجائے جدید سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں سے جڑی معنی خیز علامتیں اور استعارے ہیں، جن میں کہانی پن کو بھی بیانیہ کے نئے تقاضوں کے مطابق برتا گیا ہے۔''[۱۴]

گذشتہ چار دہائیوں سے ریاست جموں وکشمیر میں جو افسانہ نگار اردو افسانہ کی آبیاری کر رہے ہیں اور اس کو نئی وسعتوں تک پہنچانے کے لیے منہمک ہیں، ان میں خالد حسین، وحشی سعید ساحل، غلام نبی شاہد، امین بنجارہ، پروفیسر ظہور الدین، شام طالب، مسعود سامون، کے۔ ڈی۔ مینی، دیپک بدکی، ایثار کشمیری، پرویز مانوس، ناصر ضمیر، راز مناوری، اقبال شال، طارق شبنم، الطاف کشتواڑی، فاروق رینزو، شہباز راجوروی، ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی، مشتاق مہدی، راجہ یوسف، اقبال نازش، شیخ بشیر، خالد کرار، نثار راہی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

طبقۂ نسواں نے بھی ریاست میں اردو افسانے کے کینواس پر نقش گری کی ہے۔ ان میں واجدہ تبسم، زنفر کھوکھر، نکہت فاروق نظر، ترنم ریاض، ایم۔ نساء، ڈاکٹر نصرت چودھری، نعیمہ احمد مہجور، منظورہ اختر، نیلوفر ناز نحوی، نسرین نقاش، رومی شال وغیرہ کے نام کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔

درجہ بالا مختصر جائزے سے اس بات کا آسانی سے پتا چلتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں جب سے صنف افسانہ کی ابتدا ہوئی ہے، اس وقت سے لے کر موجودہ دور تک ریاستی ادیبوں نے مسلسل اس

میں طبع آزمائی کی ہے اور کر رہے ہیں، جو کہ ریاست میں اردو افسانے کے مستقبل کے حوالے سے ایک خوش آئند امر تصور کیا جا سکتا ہے۔

افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری کے آثار بھی یہاں بیسویں صدی کے اوائل میں ہی نظر آتے ہیں۔ ریاست میں اس صنف کی جانب سب سے پہلے سالگ رام سالک اور محمد الدین فوق نے توجہ کی۔ انہی بزرگوں کے بعض قصوں کو ہم ناول کے نقش اولین کہہ سکتے ہیں۔ سالگ رام سالک نے دو قصے ''داستان جگت روپ'' اور ''تحفۂ سالک'' کے نام سے لکھے، جبکہ محمد الدین فوق نے متعدد قصے لکھے، ان میں ''ناصح مشفق، غریب الدیار، نیم حکیم، ناکام، انارکلی'' اور ''اکبر'' اہمیت کے حامل ہیں۔ آخر الذکر ''انارکلی'' اور ''اکبر'' ناولوں کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ ریاست میں اردو ناول کے آغاز کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی یوں قمطراز ہیں:

> ''انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں سب سے پہلے ناول نگاری کی شروعات پنڈت سالگ رام سالک اور مولوی محمد الدین فوق نے کی۔'' ۱۵

محمد الدین فوق اور سالگ رام سالک کے قصے ریاست میں ناول کے ابتدائی نمونے تھے، لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ یہ قصے فن ناول نگاری کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتے، ان میں بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں، البتہ ان کی تاریخی اہمیت سے کوئی انکار نہیں۔ ریاست میں ''رنبیر'' اخبار کی اشاعت سے ناول نگاری میں پیش رفت ہونے لگی۔ اس اخبار کے ذریعے جن فنکاروں نے ریاست میں اردو ناول کی آبیاری کی ان میں موہن لال ماروا ''داستان محبت''، شمبھو ناتھ ناظر ''بیوہ کی فریاد پر نظر اپیل'' وشوناتھ درماہ، پنڈت نند لال در بے غرض ''تازیانہ'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ریاست میں اردو ناول کی پیش رفت میں ''رنبیر'' اخبار کے کردار کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

> ''جب جموں خطے سے ہفت روزہ ''رنبیر'' شائع ہونے لگا تو کئی لوگوں نے لکھنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ناول جیسی صنف کی طرف بھی توجہ ہوئی اور اس اخبار کی مختلف اشاعتوں میں اپنے ناول قسط وار چھپوانا شروع کئے۔ اس دور کے ناول لکھنے والوں میں وشوا ناتھ درماہ، موہن لال ماوراہ، شنبھو ناتھ ناظر اور کئی نام قابل ذکر ہیں۔'' ۱۶

تقسیم وطن کے بعد ملک کشمیر سے ابھرنے والے بیشتر افسانہ نگاروں نے ناول کی طرف بھی توجہ کی اور اس صنف ادب میں بھی اپنی بساط کے مطابق کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے چند سال قبل پریم

ناتھ پردیسی، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، کاشی ناتھ، خوشتر ترچھل اورٹھاکر پونچھی وغیرہ نے ریاست میں اردو ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور نام پیدا کیا۔

پریم ناتھ پردیسی نے ایک ناول ''پوتی'' کے نام سے لکھا ہے۔ پردیسی کے بعد رامانند ساگر کا مشہور ناول ''اور انسان مرگیا'' شائع ہوا، جو کہ تقسیم ملک کے خونریز واقعہ کا احاطہ کرتا ہے۔ ریاست کے ناول نگاروں میں نرسنگھ داس نرگس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے ناول کے فن کی طرف خصوصی توجہ کی، اور متعدد ناول لکھے، جن میں ''پاربتی'' اور ''نرملا'' کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے اکثر ناول ریاست کے دیہاتوں کی چلتی پھرتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اسی دور میں ''گوری شنکر'' کے نام سے کاشی ناتھ ترچھل خوشتر نے ایک ناول لکھا۔ کشمیری لال ذاکر ریاست کے معتبر ناول نویس ہیں، انھوں نے کئی ناول لکھے ہیں، جن میں ''سندور کی راکھ، انگوٹھے کا نشان، دھرتی سدا سہاگن، کرماں والی، جاتی ہوئی رت، ڈوبتے سورج کی کتھا، چھٹی کا دودھ'' اور ''خون پھر خون ہے'' وغیرہ قابل مطالعہ ناول ہیں۔

کشمیری لال ذاکر کی طرح ٹھاکر پونچھی کو بھی اس فن سے خاصی رغبت رہی ہے، اور انھوں نے بھی یکے بعد دیگرے کئی ناول لکھے۔ ان کے ناولوں میں ''وادیاں اور ویرانے، پیاسے بادل، یادوں کے کھنڈر، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک'' اور ''چاندنی کے سائے'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد ریاست کے جن ادیبوں نے افسانہ کے علاوہ ناول میں بھی اپنی شناخت قائم کی، ان میں تیج بہادر بھان، غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، حامدی کاشمیری، بھوشن لال بھوشن، وجے سوری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تیج بہادر بھان ناول کے فن سے پوری طرح واقف ہیں، جس کا اندازہ ان کے لکھے ناول ''سیلاب اور قطرے'' کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ غلام رسول سنتوش ایک شہرت یافتہ مصور ہونے کے علاوہ ایک اچھے فکشن نگار بھی ہیں۔ انھوں نے متعدد افسانوں کے علاوہ ایک ناول ''سمندر پیاسا ہے'' بھی لکھا ہے۔ ''شاید ہے تیری آرزو'' کے خالق علی محمد لون ریاست کے ایک معتبر فکشن نگار ہیں۔ وجے سوری کو ان کے لکھے ناول ''ایک ناؤ کاغذ کی'' نے حیات جاوداں بخشا۔ حامدی کاشمیری کی شخصیت کے متنوع پہلو ہیں اور وہ ہندو پاک کی مختلف ادبی انجمنوں میں اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ انھوں نے کئی ناول لکھے ہیں، جن میں ''برف میں آگ، بہاروں میں شعلے، بلندیوں کے خواب'' وغیرہ قابل مطالعہ ہیں۔ بھوشن لال بھوشن نے ایک ناول ''صرف پانچ ہزار'' کے نام سے لکھا ہے۔

دیگر اہم ناول نویسوں میں نور شاہ کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے ''پائل کے زخم، نیلی جھیل

کالے سائے'' اور'' آؤ سوجائیں'' وغیرہ جیسے ناول سپرد قلم کیے ہیں۔ نورشاہ کے معاصرین میں مدن موہن شرما ''ایک منزل چار راستے'' وحشی سعید ساحل ''خون اور محبت'' عمر مجید ''یہ بستی یہ لوگ'' برج کٹیال ''چراغ بجھنے سے پہلے'' مالک رام آنند ''اپنے وطن میں اجنبی'' کرن کاشمیری ''خوابوں کے قافلے'' ڈی کے کنول ''کشمکش'' صوفی محی الدین ''بکھر گئے سب تنکے'' شبنم قیوم ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا'' فاروق رینزو ''زخموں کی سالگرہ'' آنندلہر ''تپسوی کون'' جان محمد آزاد ''کشمیر جاگ اٹھا'' وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔

ریاست میں افسانہ نگاری کے مقابلے میں ناول نگاری کی جانب کم توجہ کی گئی، لیکن پھر بھی جو ذخیرہ ہمیں ناول کی صورت میں یہاں ملتا ہے، وہ تسلی بخش ہے، اور ریاست میں اس صنف ادب میں جو پیش رفت ہوئی ہے، وہ ملک کی دوسری ریاستوں سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

ڈراما اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے، یہ اردو کی قدیم اصناف میں سے ایک ہے۔ یہ صنف زندگی کے بہت قریب ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کی نقل پیش کی جاتی ہے۔ جہاں تک ریاست جموں وکشمیر کا تعلق ہے، یہاں اس صنف کے آغاز وابتدا پر نظر کریں تو سب سے پہلا اور منفرد نام محمد عمر نور الٰہی کا آتا ہے۔ یہ دو دوستوں محمد عمر اور نور الٰہی کا مشترکہ نام ہے۔ ان کی شہرہ آفاق تصنیف ''ناٹک ساگر'' کی بدولت ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ کتاب اردو ڈرامہ نگاری کی تاریخی اور تنقیدی نوعیت کے لحاظ سے معتبر مانی جاتی ہے۔ بقول پریمی رومانی:

> ''ریاست جموں وکشمیر میں ڈراما نگاری کو فروغ دینے میں محمد عمر نور الٰہی کا نام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' اردو ڈراما نگاری میں مستند حیثیت رکھتی ہے۔'' ۱۷

''ناٹک ساگر'' کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر عشرت رحمانی یوں لکھتے ہیں:

> ''ان حضرات نے افسانے بھی لکھے، اور ڈرامے بھی اور اردو میں ڈرامہ نگاری کی پہلی تاریخی وتنقیدی کتاب ''ناٹک ساگر'' لکھ کر بڑی خدمت انجام دی۔'' ۱۸

محمد عمر نور الٰہی نے متعدد ڈرامے لکھے اور ترجمہ کیے، جن میں ''جان ظرافت، روح سیاست، بگڑے دل، قزاق، ظفر کی موت، تین ٹوپیاں، ہمہ خانہ آفتاب'' اور ''سکندر'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ریاست میں اردو ڈرامہ کو فروغ دینے میں ممبئی کے تھیئر ٹیکل کمپنیوں نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کمپنیوں نے جموں اور سرینگر میں کئی ڈرامے کھیلے جو کافی پسند کیے گئے۔ خاص طور پر آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے ان

کمپنیوں نے یہاں کھیلے، جنھیں دیکھنے کے لیے یہاں کے لوگ کثیر تعداد میں آتے تھے، اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

''یہ کمپنیاں جموں وکشمیر میں اپنے کھیل کو دکھاتیں، جن کو دیکھنے کے لیے لوگ جوق در جوق آتے۔''[19]

جموں وکشمیر میں اردو ڈرامہ کی تاریخ میں محمد عمر نور الٰہی کے بعد ماسٹر غلام حیدر، منوہر رائے زادہ، نرسنگھ داس نرگس، دینا ناتھ وارید، آزر عسکری، جگدیش کنول، اور ایم۔ اے۔ عزیز وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں نرسنگھ داس نرگس کا ڈرامہ ''تعارف''، جگدیش کنول کا ''پردے کے پیچھے'' دینا ناتھ وارید کا ''رکمنی ہرن'' منوہر رائے زادہ کے ''اردو ڈرامہ'' اور ''پرانے دیپ نئے اجالے'' اور ایم اے عزیز کا ''توشئہ تقدیر'' وغیرہ اس عہد کے اہم اور نمائندہ ڈرامے ہیں۔

تقسیم ملک کے المیہ سے زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد متاثر ہوئے۔ مگر سب سے زیادہ اثر فن کاروں نے قبول کیا، کیونکہ وہ دیگر افراد کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ جموں وکشمیر کے فن کاروں نے بھی اپنی ذمہ داری کو پہچان کر عوام کی زندگی کو موضوع بنا کر پیش کیا۔ شاعروں، مصوروں اور ڈرامہ نگاروں نے ایک انجمن کلچرل فرنٹ کے نام سے قائم کی۔ اس بزم سے منسلک جن قلم کاروں نے صنف ڈرامہ کو فروغ دیا ان میں محمود ہاشمی، پریم ناتھ پردیسی، راج ہنس کھنہ، شودھان سنگھ چوہان، علی محمد لون، سوم ناتھ زتشی، دینا ناتھ نادم، پران کشور، قیصر قلندر وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ریاست کے اردو ڈرامہ نگاروں میں پروفیسر محمود ہاشمی کا نام ناقابل فراموش ہے، انھوں نے اپنے ڈراموں میں کشمیر کے محنت کش عوام کو موضوع بنایا۔ ان کے مشہور ڈراموں میں ''کشمیر یہ ہے، انار کلی کی واپسی'' اور ''آنکھیں اور کیمرہ یہ ہے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کشمیر کے پریم چند کہلانے والے ادیب پریم ناتھ پردیسی نے شاعری، افسانہ اور ناول کے ساتھ ساتھ فن ڈرامہ نگاری کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے چند شہرت یافتہ ڈراموں میں ''مجاہد شہید شیروانی''، ''اسوائی''، ''سنگ تراش''، ''قدہ گوجواری'' وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان ڈراموں میں کشمیر اور کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ریاست میں ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں کے وجود میں آتے ہی اردو ڈرامے کا نیا باب شروع ہوا۔ ان اسٹیشنوں سے جن فنکاروں کے ڈرامے نشر ہوئے ہیں ان میں خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، راہی معصوم رضا کے علاوہ ٹھاکر پونچھی، علی محمد لون، پشکر بھان، قیصر قلندر، بنسی

نردوش، موہن یاور، پشکر ناتھ، آفاق احمد اور حامدی کاشمیری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔خواجہ احمد عباس کا ڈرامہ ''چودہ گولیاں'' ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہونے والا پہلا ڈرامہ تھا۔اس کے بعد یہ سلسلہ لگاتار چلتا رہا۔علی محمد لون اور بنسی نردوش دونوں اگرچہ کشمیری زبان کے ادیب ہیں، لیکن انھوں نے اردو ادب کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔علی محمد لون نے کشمیر کے نچلے طبقے کو اپنے ڈراموں میں پیش کیا ہے۔ان کے ڈراموں میں ''چراغ اور سائے'' اور ''آدم حوا اور ابلیس'' اہم ہیں۔بنسی نردوش نے بھی کشمیر کی سیاسی اور سماجی مناظر کی عکاسی کی ہے۔ان کا ڈرامہ ''ایک رات کا مہمان'' اس کی زندہ مثال ہے۔

پشکر ناتھ ریاست کے بڑے فنکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا، لیکن بعد میں افسانوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے ڈرامہ کی طرف بھی توجہ کی اور متعدد ڈرامے لکھے۔جن میں ''ساون جلے بھادو جلے''، ''ایک درد کی لکیر''، ''چندر مکھی''، ''دل کی وادیاں''، ''ڈیرا'' اور ''جانے انجانے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس دور کے دیگر ڈرامہ نگاروں میں زیڈ سیمی کا ڈرامہ ''جہانگیر کی موت'' وجے سمن کا ''انگ مان'' وینو بھائی پنت کا ''سورگ کی کھوج'' رام کمار ابرول کا ''انسان جیت گیا'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔نور شاہ ریاست کے بڑے فکشن نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔انھوں نے صنف ڈرامہ کے طرف بھی توجہ کی اور کئی اہم ڈرامے لکھے ہیں۔ان کے ڈراموں میں ''دل کی بستی''، ''وئیل چیئر''، ''ویرانے کے پھول'' اور ''چاند کے پھول'' وغیرہ قابل ستائش ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ڈرامہ کو فروغ دینے میں ریاستی کلچرل اکاڈمی اور دوردرشن کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ان دونوں اداروں کی بدولت ریاست میں اردو ڈرامہ نگاری کو بڑی تقویت ملی۔ان اداروں سے جن ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے منظر عام پر آئے۔ان میں علی محمد لون، پشکر ناتھ، حامدی کاشمیری، وجے سوری اور سوہن لال وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

دور حاضر میں ریاست کے جو فنکار ڈرامہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں منہمک ہیں ان میں شبنم قیوم، نور شاہ، وریندر پٹواری، آنند لہر، شوکت شہر، مشتاق کاک، نذیر جہانگیر، اشرف عادل وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ریاست میں صنف ڈرامہ پر مشتمل سرمایہ دیگر اصناف کے بہ نسبت بہت کم ہے۔پھر بھی جو ڈرامے یہاں کے ادیبوں نے لکھے ہیں وہ ملکی سطح پر لکھے گئے ڈراموں سے کسی بھی طرح کم اہم نہیں ہیں۔

اردو تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی ریاست جموں وکشمیر کے ادیبوں نے ناقابل فراموش

خدمات انجام دیں ہیں۔اس سلسلے کی ابتدا ریاست میں محمد الدین فوق کے تذکروں سے ہوئی۔فوق ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ بیک وقت ایک شاعر، مورخ، صحافی، افسانہ نگار، ناول نگار اور تذکرہ نگار تھے، موصوف نے ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ بقول برج پریمی:

> ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو تنقید کے ابتدائی نقوش محمد الدین فوق مرحوم کی بعض تحریروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔''[۲۰]

یادگار رفتہ، تذکرہ علمائے لاہور، تذکرہ شعرائے لاہور اور تذکرہ اخبار نویساں وغیرہ فوق کی وہ تصانیف ہیں، جن میں تحقیق اور تنقید کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ محمد الدین فوق کے بعد ریاست میں اردو تحقیق وتنقید میں ایک اہم نام محمد عمر نورالٰہی صاحبان کا ہے۔ یہ دو ادیب تھے، مگر مشترکہ نام سے لکھتے تھے۔انھوں نے اردو ڈرامہ کی پہلی تاریخ ''ناٹک ساگر'' کے نام سے لکھی۔ جو اردو ادب میں ڈرامہ پر لکھی گئی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔حامدی کاشمیری اس سلسلے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''محمد عمر نورالٰہی نے ۱۹۲۴ء میں ناٹک ساگر شائع کی۔ یہ اردو ڈرامہ نگاری پر پہلی کتاب ہے۔ جو لاہور سے شائع ہوئی۔محمد عمر اور نورالٰہی جموں کے تھے اور ڈرامہ اور اس کے اسٹیج سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔''[۲۱]

پروفیسر نندلال کول طالب کاشمیری اور عبدالاحد آزاد ریاست کے مقتدر ناقد اور محققین میں شمار ہوتے ہیں۔طالب اردو کے غالب شناسوں میں سے ایک معتبر نام ہے۔غالب کی شخصیت اور کلام کے مختلف جہات پر طالب نے بہت کچھ لکھا ہے۔غالب شناسی پر مشتمل ان کی کتاب ''جائزہ کلام غالب'' بہت ہی اہم مانی جاتی ہے۔عبدالاحد آزاد کی نادر کتاب ''کشمیری زبان اور اردو شاعری'' ریاست میں اردو تحقیق وتنقید میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ آزاد نے اس کتاب کو تیار کرنے میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ لل دید سے لے کر مہجور تک کشمیری زبان کے شعرا کا مفصل جائزہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ بقول حامدی کاشمیری:

> ''تحقیق وتنقید میں عبدالاحد آزاد کا نام نمایاں ہے۔انھوں نے کشمیری زبان وادب کی تاریخ اردو میں لکھی ہے۔''[۲۲]

آزادی کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں اردو تحقیق وتنقید میں جو پیش رفت ہوئی ہے۔اس کا مفصل جائزہ لینا یہاں مناسب نہیں، لیکن جن حضرات نے اس شعبے میں انمٹ نقوش قائم کیے ہیں، ان میں حامدی کاشمیری، اکبر حیدری، برج پریمی، محمد یوسف ٹینگ، ظہور الدین، زمان آزردہ، بشیر احمد نحوی، پروفیسر نذیر ملک، اسداللہ وانی، مجید مضمر اور فرید پربتی وغیرہ کے نام قابل ستائش ہیں۔

حامدی کاشمیری نے اردو تحقیق وتنقید میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، جس کا اندازہ ان کی تحقیقی و تنقیدی تصانیف ''جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، غالب کے تخلیقی سرچشمے، کارگہِ شیشہ گری، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب'' اور ''میر کا مطالعہ'' وغیرہ کے مطالعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

اکبر حیدری کا نام ملک کے معتبر محققین میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے تحقیق کے میدان میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ صنف مرثیہ اور مرثیہ نگاری پر قلم اٹھا کر انھوں نے کثیر تعداد میں تحقیقی کتابیں لکھیں، جن میں ''اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء، باقیات انیس، میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، مرثیہ دبیر'' اور ''مقالات حیدری'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جموں وکشمیر میں اردو تحقیق اور تنقید میں ڈاکٹر برج پریمی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سعادت حسن منٹو پر ان کی تصنیف ''سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے'' اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ انھوں نے ''حرف جستجو''، جلوۂ صد رنگ، ذوق نظر'' اور ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو نما'' وغیرہ جیسی بہترین تنقیدی و تحقیقی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

کشمیر اور کشمیریت کے حوالے سے متنوع تنقیدی و تحقیقی مضامین لکھنے والے نقاد و محقق محمد یوسف ٹینگ محتاج تعارف نہیں ہیں۔ انھوں نے ''لل دید، شیخ العالم، رسول میر اور مہجور جیسے کشمیر کے سربرآوردہ شعرا پر تحقیقی مضامین لکھنے کے علاوہ غالب، اقبال، منٹو اور ناصر کاظمی وغیرہ جیسے شہرت یافتہ سخن سنجوں پر بھی پُر مغز مضامین سپرد قلم کیے ہیں۔

پروفیسر ظہور الدین ریاست کے ایک نامور نقاد اور محقق ہیں۔ تحقیق اور تنقید پر مشتمل ان کی تصانیف میں ''بیسویں صدی کے اردو ادب پر انگریزی کے رجحانات، صوبہ جموں میں اردو زبان وادب کی ترقی'' اور ''جدید اردو ڈراما'' وغیرہ اہم ہیں۔

علاوہ ازیں جن حضرات نے ریاست میں اردو تحقیق اور تنقید میں پیش رفت کی ان میں محمد زمان آزردہ، ''مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے''، بشیر احمد نحوی ''مسائلِ تصوف اور اقبال''، نذیر احمد ملک ''اردو رسم الخط ارتقا اور جائزے''، مجید مضمر ''اردو افسانے میں علامت نگاری''، منصور احمد منصور ''اردو افسانے میں تہذیبی عناصر'' وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

جموں وکشمیر کی یونیورسٹیوں اور اقبال انسٹی ٹیوٹ میں بیرون ریاست کے جن مقتدر ادب نواز وں نے اپنی بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر منظر اعظمی، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر عابد پشاوری، پروفیسر

قدوس جاوید، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر محی الدین قادری زور وغیرہ کے اسمائے گرامی ناقابل فراموش ہیں۔ان حضرات کے ہی مساعی کی وجہ سے ریاست میں تحقیق وتنقید کا ذوق یہاں کے ذہین طالب علموں میں پیدا ہوا۔

دورِ رفتہ میں تحقیق وتنقید کی ریاست میں جو حضرات آبیاری کر رہے ہیں، ان میں عبدالغنی شیخ لداخی، خالد بشیر، غلام نبی خیال، شفق سوپوری، نذیر آزاد، اسداللہ وانی، جوہر قدوسی، پریمی رومانی، ایاز رسول نازکی، مشعل سلطان پوری، منصور احمد منصور، امین بنجارہ، منشور بانہالی، عبدالرشید خان، دیپک بدکی، مشتاق احمد وانی، ترنم ریاض، شفیقہ پروین، تسکینہ فاضل، مشتاق اُحمد گنائی، الطاف انجم وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تحقیق وتنقید کا فن خشک اور صبر آزما ہونے کی وجہ سے ریاست میں اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ کی گئی۔لیکن پھر بھی ریاست اور ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں ریاست کے ہونہار طلبہ تحقیقی کام انجام دینے میں مصروف ہیں۔یونیورسٹیوں کے اساتذہ صاحبان بھی وقتاً فوقتاً تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھتے رہتے ہیں، جو کہ ریاست میں اردو تحقیق وتنقید کے لیے ایک خوش آئند امر ہے۔

افسانوی ادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ جموں وکشمیر کے ادیبوں اور فنکاروں نے غیر افسانوی ادب میں بھی اپنے جوہر کامل دکھائے ہیں۔یہاں غیر افسانوی نثر کی ابتدا بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے تیرتھ کاشمیری کے انشائیوں سے ہوتی ہے۔تیرتھ کاشمیری ایک صاحب قلم ادیب تھے۔انھوں نے افسانہ، ڈراما، شاعری کے علاوہ مضمون اور انشائیہ میں بھی خاطر خواہ سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔انھوں نے سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تاریخی موضوعات پر سو کے قریب مضامین سپردِ قلم کیے ہیں۔صنف انشائیہ سے انھیں غیر معمولی رغبت تھی۔ان کے لکھے انشائیوں کی سب سے نمایاں خوبی منفرد انداز بیان اور دلکش اسلوب ہے۔ان کے چند مشہور انشائیوں میں ''پارس کا پتھر، سنسان بستی، کتاب، ہم ایک ہیں، میں نے کہا، پریم کا اوتار بھگوان کرشن، رام نومی کے پھول'' اور ''عہد اکبری میں کشمیر میں طلا دان'' وغیرہ بہت ہی دلچسپ انشائیے ہیں۔پروفیسر عبدالقادر سروری ان کی انشائیہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تیرتھ کا خاص میدان انشائیہ اور ادب لطیف ہیں۔انھوں نے سو کے قریب افسانے لکھے ہیں، اسی تعداد میں ان کے مضامین ہیں، جو مذہب، اخلاق اور تاریخ کے وسیع موضوعات پر حاوی ہیں۔ادب لطیف کے انداز کے مختصر انشائیے بے شمار لکھے۔''۲۳

تیرتھ کاشمیری کے بعد ریاست میں صنف انشائیہ اور مزاحیہ مضامین ہمیں پنڈت گنگادھر بٹ دیہاتی اور

جگن ناتھ خیبری نشتر کاشمیری کے یہاں ملتے ہیں۔گنگا دھر دیہاتی نے اپنے زرخیز قلم کی جولانیاں شاعری، افسانوں، خاکوں، انشائیوں اور مزاحیہ مضامین کی صورت میں بکھیری ہیں۔ بقول عبدالقادر سروری:

''ان کی تخلیقات کہانی سے لے کر مضمون، انشائیہ، ادب لطیف، ڈراما اور شاعری پر حاوی ہے۔''[۲۴]

''جوتا'' اور ''میری پیاری'' گنگا دھر دیہاتی کے مشہور انشائیہ ہیں، جن میں مزاح کا پہلو نمایاں ہے۔ نشتر کاشمیری نے مختلف موضوعات پر مضامین اور انشائیے لکھے۔انھوں نے مزاحیہ خاکے بھی لکھے ہیں۔ان کے مضامین کی خاص خوبی مزاح ہے، وہ سنجیدہ سے سنجیدہ مضمون میں بھی مزاح کا پہلو نکال ہی لیتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کا مشہور مضمون ''خیالی پلاؤ'' اہمیت کا حامل ہے۔

تقسیم ہند کے خونیں واقعات سے ملکِ کشمیر کے ادیبوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔متعدد شعرا اور ادبا ریاست چھوڑ کر پاکستان چلے گئے، جو یہاں رہ گئے انھوں نے شاعری اور افسانوی ادب کی طرف ہی زیادہ توجہ کی۔غیر افسانوی ادب پر بہت دیر تک جمود طاری رہا، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد غیر افسانوی نثر کو یہاں دوبارہ زندہ کرنے کا سہرہ پروفیسر محمود بیگ کے سر ہے۔ بیگ صاحب ریاست میں مشیر تعلیمات اور جموں و کشمیر یونیورسٹی کے پرو چانسلر کے عہدے پر فائز تھے۔ان کے لکھے ہوئے انشائیوں سے ریاست میں انشائیہ نگاری کی نئی روایت قائم ہوئی۔ان کے شہرت یافتہ مضامین میں ''میری جو شامت آئی شادی کی، یہ بھی ایک فن ہے دوست بنانا'' اور ''کیسے نبھائیں کماؤ بیوی سے'' وغیرہ کافی دلچسپ ہیں۔

بیگ صاحب کے بعد ریاست میں انشائیہ نگاری میں محی الدین حاجنی، اختر محی الدین، غ۔م۔طاؤس، ستار شاہد، غلام نبی فراق، محمد ابراہیم، محبوب بیگ، بلدیو پرشاد شرما، محمد زماں آزردہ وغیرہ نے نام پیدا کیا۔

مذکورہ بالا حضرات میں آخرالذکر محمد زماں آزردہ اردو انشائیہ نگاری میں ایک قدآور نام ہیں۔موصوف کو اس صنف ادب سے والہانہ دلچسپی ہے۔ان کے اب تک صنف انشائیہ پر مشتمل پانچ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔جن میں ''غبار خیال، بن تو سہی، شیریں کے خطوط، کانٹے'' اور کشمیری زبان میں لکھے انشائیوں کا مجموعہ ''ایسے'' شامل ہے۔زماں آزردہ نے نہ صرف ریاست بلکہ پورے برصغیر میں انشائیہ نگاری میں ایک بلند مقام پیدا کیا۔ بقول پروفیسر منصور احمد منصور:

''ان کی انشائیہ نگاری اپنی انفرادیت، تازگی اور شادابی کا احساس دلاتی رہی، چنانچہ پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، کے کے نیئر، سیدہ جعفر، پروفیسر قدوس جاوید اور دیگر ادیبوں نے کھلے دل کے ساتھ

اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔''۲۵

شمیم احمد شمیم ریاست کے ایک بے باک صحافی اور سیاست داں گزرے ہیں۔انھوں نے اپنے قلم سے انشائیہ، خاکہ اور مزاحیہ مضامین کا وافر ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔شمیم صاحب اپنے مشہور زمانہ اخبار ''آئینہ'' میں مذکورہ اصناف ادب پر مضامین لکھا کرتے تھے۔جوان کی قبل از وقت موت کے بعد ان کی ہمشیرہ محترمہ قرۃ العین نے ''آئینہ نما'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیے۔ریاست کے بعض ادیبوں نے مختلف ایام زندگی میں کیے اسفار کی روداد بھی قلمبند کی ہے۔جن کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلے کی پہلی کڑی غلام نبی خیال کا ''سفرنامہ عراق'' ہے۔اس میں خیال صاحب نے جولائی ۱۹۷۹ء میں اپنے عراق کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔اس سفرنامے کو انھوں نے اپنے اخبار روزنامہ ''اقبال'' میں سلسلہ وار چوالیس (۴۴) اقساط میں شائع کیا، اور بعد ازاں اس کی تلخیص ''کاروان خیال'' کے نام سے لکھی۔''

پروفیسر شکیل الرحمٰن کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں صدر کی حیثیت سے ایک مدت تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔انھوں نے اپنی زندگی کا ایک قیمتی حصہ ریاست میں گزارا، اس دوران انھوں نے روس کا سفر کیا۔روس میں گزارے اپنے شب وروز اور وہاں کی زندگی سے متعلق اپنے تجربات اور مشاہدات کو انھوں نے ''قصہ میرے سفر کا'' کا روپ دے کر ایک دلچسپ سفرنامہ لکھا۔

پروفیسر حامدی کاشمیری نے بھی ایک سفرنامہ ''انجمنِ آرزو'' کے نام سے قلمبند کیا ہے۔یہ سفر انھوں نے ہندوستان کے نامور ادیبوں کے ہمراہ پاکستان میں ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے کیا تھا۔یہ خالص ادبی سفر تھا۔اس میں مصنف نے پاکستان کے تئیں اپنے والہانہ محبت کے تاثرات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

کشمیر میں اردو صحافت کا ایک مشہور ومعروف نام خواجہ ثناء اللہ بٹ کا ہے۔انھوں نے بھی پاکستان کا سفر کیا ہے، اور واپسی پر اس سفر کے حالات وواقعات کو تواتر کے ساتھ اپنے شہرت یافتہ روزنامہ ''آفتاب'' میں قسط در قسط شائع کیا۔''سفرنامہ پاکستان'' موصوف کا پاکستان میں اپنے دوستوں کے ساتھ گزارے ایام، محفلوں اور مجلسوں کی روداد کا احاطہ کرتا ہے۔علاوہ ازیں غلام نبی شیدا مدیر روزنامہ ''وادی کی آواز'' کا ''سفرنامہ پاکستان'' اور وادی کے معروف وکیل غلام نبی ہاگرو کا ''سفرنامہ جنیوا'' بھی اہمیت کے حامل ہیں۔مزاحیہ تحریروں میں خواجہ ثناء اللہ بٹ اور شمیم احمد شمیم نے نام پیدا کیا ہے۔بٹ کی ''خضر سوچتا ہے ڈلر کے کنارے'' اور ''خبر زینہ کدل'' کے نام سے مزاحیہ اور خبریہ تحریریں ہیں، جبکہ شمیم احمد شمیم کی مزاحیہ تحریروں میں ''چراغ بیگ'' اور ''کشمیر کا جغرافیہ'' قابل ذکر ہیں۔

ریاست میں خودنوشت سوانح عمریاں بھی لکھی گئیں ہیں۔اس سلسلے کی اہم کڑی شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی خودنوشت ''آتش چنار'' ہے۔اس میں موصوف کے زندگی کے حالات وواقعات کے علاوہ ریاست کی تحریک آزادی کے بارے میں وافر معلومات ملتی ہیں۔ریاست کے ایک مشہور سیاستدان اور سابق وزیر اعظم سید میر قاسم نے اپنی زندگی کی روداد ''داستان حیات'' کے نام سے لکھی ہے۔کشمیر میں موجودہ تحریک آزادی کے روح رواں سید علی شاہ گیلانی نے اپنی زندگی کے نشیب وفراز کو ''قصہ درد'' میں سمیٹا ہے۔ریاست میں دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں غیر افسانوی ادب پر مشتمل سرمایہ اگرچہ کم ہے،لیکن لائق توجہ ضرور ہے۔ریاستی اخباروں میں آئے دن متنوع موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔جس سے اس صنف نثر کے مستقبل کی اچھی امید کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

١۔بحوالہ،محمد یوسف ٹینگ،ریاست میں اردو ادب،مشمولہ ''بازیافت'' ۱۹۸۴ءص ۵،شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

٢۔منشی ہرگوپال خستہ، ''گلدستہ کشمیر''،ص،۵۷

٣۔عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)،ص ۱۳۳

۴۔برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو نما،ص ۲۱

۵۔عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)،ص ۱۶۶

٦۔عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)،ص ۱۳۷

۷۔عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)،ص ۲۱

۸۔ ''تعمیر''، جموں وکشمیر میں اردو ادب نمبر،۱۹۸۳ء،ص ۲۵

۹۔ماہنامہ شیرازہ، سرینگر، جلد ۳۷،شمارہ ۳،ص ۸۴

۱۰۔عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)،ص ۳۸

۱۱۔برج پریمی، جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما،ص ۲۷

۱۲۔حامدی کاشمیری، ریاست جموں کشمیر میں اردو ادب، ص ۸۰
۱۳۔نور شاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، ص ۲۱
۱۴۔ماہنامہ شیرازہ، سرینگر، جلد نمبر ۵۲، شمارہ ۱۱۔۱۲، ص ۱۴
۱۵۔برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو نما، ص ۴۰
۱۶۔برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو نما، ص ۴۲
۱۷۔ماہنامہ شیرازہ، جلد ۱۵، شمارہ ۴، ص ۵۷
۱۸۔عشرت رحمانی، اردو ڈرامے کی تاریخ وتنقید، ص ۲۲۵
۱۹۔عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)، ص ۱۳۷
۲۰۔برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو نما، ص ۲۷
۲۱۔حامدی کاشمیری، ریاست جموں کشمیر میں اردو ادب، ص ۸۳
۲۲۔حامدی کاشمیری، ریاست جموں کشمیر میں اردو ادب، ص ۸۳
۲۳۔عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)، ص ۴۴۲
۲۴۔عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)، ص ۴۵۳
۲۵۔بازیافت، شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، شمارہ ۳۸۔۳۹، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۲

☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم

جموں و کشمیر میں اُردو غزل کا آغاز وارتقاء

غزل اُردو شاعری کا تاج ہے۔ اُردو کی دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں صنفِ غزل کی صورت میں جو شعری سرمایہ موجود ہے وہ اس بات کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اس کا فر صنف کو ہر عہد میں کثرت شعراء نے وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ قلی قطب شاہ سے لیکر موجودہ دور تک آتے آتے اردو غزل کی زلفیں سنوارنے اور اس کو نئی وسعتیں اور بلندیاں عطا کرنے میں ہزاروں شعراء نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اُردو شاعری میں صنفِ غزل کی اہمیت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر چہ اس کی ہیئت اور موضوعات کے پیش نظر اس پر وقتاً فوقتاً تنقید بھی کی گی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی شہرت ومقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ آج اکیسویں صدی میں بھی ملک کے اطراف واکناف میں کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک مشاعروں کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ جس میں غزل گو شعراء اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے ہیں، جو کہ غزل کی سدابہار مقبولیت کی ضامن ہے۔ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر اپنے داخلی جذبات کو فنی و جمالیاتی عناصر کے ساتھ مترنم الفاظ میں اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ قاری کو اس میں اپنی داستان سنائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر آل احمد سرور نے بجا طور پر کہا ہے:۔

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی ہے
سرور اس کے اشارے داستانوں پر بھی بھاری ہیں
غزل میں جوہر اربابِ فن کی آزمائش ہے

غزل کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ اردو کی واحد ایسی صنف سخن ہے جس نے اپنی ابتداء سے لیکر موجودہ دور تک قارئین کے دل میں گھر کر لیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ غزل کو ہر خاص و عام نے پسند کیا اور آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں غزل کو ہر دور اور ہر زمانے میں مختلف اور مشکل راہوں سے گزرنے کا گُر خوب آتا ہے۔ بقول عبادت بریلوی:

''اردو شاعری میں اس (غزل) کی کوئی دوڈھائی سوسال کی روایت موجود ہے۔ ان دوڈھائی سوسالوں میں ہماری زندگی کا قافلہ جن راہوں سے بھی گزرا ہے، ہماری تہذیب جن منزلوں سے بھی روشناس ہوئی ہے اس کی سچی اور صحیح تصویر ہماری غزل میں ملتی ہے۔ اس عرصے میں ہم نے جو کچھ محسوس کیا ہے، جو کچھ سوچا ہے، جو تصورات بھی قائم کئے ہیں، جن نظریات کی بھی تشکیل کی ہے، ان سب کی صحیح آئینہ داری جیسی غزل نے کی ہے شاید ہی کسی اور

صنف ادب نے کی ہو۔'' ؎۱

اُردو کی بستیاں دنیا میں جہاں کہیں بھی موجود ہیں۔ وہاں شاعری بالعموم اور غزل بالخصوص اپنی خوشبو سے فضا کو معطر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہندوستان جو اردو زبان کی جائے پیدائش ہے۔ یہاں کے اطراف واکناف میں ایک زمانے میں اردو شعر وادب کا دور دورہ تھا۔ جو بدقسمتی سے وقت کے ہاتھوں شکستگی کا شکار ہوکر چند مراکز تک ہی محدود ہوکر رہ گئی۔ اگر چہ اردو کے شیدائیوں اور چاہنے والوں کی تعداد آج بھی یہاں لاکھوں پر مشتمل ہے لیکن صحیح معنوں میں اردو کی صورت حال بہت ہی دگرگوں نظر آتی ہے۔ دور رفتہ میں جن علاقوں اور بستیوں میں اردو زبان وادب کی شمعیں روشن نظر آتی ہیں ان میں دلی، لکھنو، حیدرآباد، پٹنہ، علی گڑھ، بھوپال وغیرہ کے ساتھ ساتھ کشمیر بھی ایک اہم علاقہ ہے۔ کشمیر میں اردو زبان کو سرکاری زبان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ریاست جموں وکشمیر کے باشندے مادری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کو بھی دل وجان سے عزیز رکھتے ہیں۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں جب سے اردو زبان نے اپنے قدم جمانے شروع کیے ہیں اس وقت سے اردو زبان کے شعراء اور ادباء کا ایک کارواں مسلسل اپنے تخلیقی کارناموں کو پیش کرنے میں سرگرم سفر ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو غزل کی ابتداء میرزا کمال الدین حسینی رسؔوا سے ہوئی ہے۔ رسؔوا مغل بادشاہ اورنگ زیب کے صاحب زادے شہزادہ محمد اکبر کے دربار میں ملازم تھے۔ لیکن جب اکبر اپنے والد کے خلاف بغاوت کے لئے اتر گئے تو رسؔوا دربار چھوڑ کر کشمیر واپس آئے اور یہیں پر ان کی زندگی کے آخری ایام گزرے۔ موصوف کے انتقال کے بعد ان کے ایک لائق شاگرد بچھمی رام نے ان کے خطوط کے مجموعے کو ترتیب دیکر ''رقعاتِ خاتم الکمال'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ جس میں ان کے فارسی خطوط کے علاوہ اردو میں ایک مناجات اور پانچ غزلیں شامل ہیں۔ انہی پانچ غزلوں کی بنیاد پر ہمارے محققین نے ان کو ریاست کا پہلا غزل گو شاعر تسلیم کیا ہے۔ رسؔوا کی ان غزلوں کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں جن کو کشمیر میں صنف غزل کا نقش اول قرار دیا جاتا ہے۔

دل وجاں اُس لٹک اوپر فدا ہے
ستم گر بے وفا، یہ کیا ادا ہے
مرا من بے حلائق منہ دکھائے
ستم ہے ظلم ہے جو رو جفا ہے
محبت سب ہی معشوقوں میں کم ہے
نہ از عشاق پر واہے نہ غم ہے

بہت مشتاق ہیں تیرے و لیکن
ٹھکانے سب محبّ دو ٹوک گم ہے

میر کمال الدین حسینی رسؔوا کے ساتھ ساتھ عبدالغنی بیگ قبول، محمد حشمت اور علی تقی محشر کے نام بھی ریاست میں اردوغزل کے ابتدائی شعراء کے طور پر لئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا دستیاب کلام فارسیت سے مملو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست میں اردوغزل کی اولیت کا سہرا رسؔوا کے سرہی باندھا جاتا ہے۔ موصوف کی دستیاب شدہ غزلوں میں اُردوغزل کے آثار بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''سترویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل کے کشمیر الاصل شاعر مرزا کمال الدین حسینی اندرابی رسوا' کو کشمیر کا اولین اردوغزل گو تسلیم کیا جائے گرچہ رسؔوا کی غزلوں کے موضوعات گھسے پٹے ہیں، الفاظ کے برتاو میں کسی معتبر لسانی نظام کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر بھی رسوا شمالی ہند کے ابتدائی دور کے شعراء جعفر زٹلی، افضل اور فضلی کے معاصر اور رسؔوا کی غزلوں کی لسانی ساخت میر وسودا کی غزلوں کی لسانی ساخت سے قریب بھی نظر آتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ رسؔوا کو کشمیر کا اولین اردوغزل گو شاعر نہ تسلیم کیا جائے۔''

۲

رسؔوا کے بعد ریاست جموں کشمیر میں اردوغزل کے باقاعدہ ارتقاء کے سلسلے میں جس نام پر ہماری نظر ٹھہرتی ہے وہ شاعر کشمیر غلام احمد مہجؔور کا ہے۔ مہجور اگرچہ فارسی اور کشمیری زبان کے قدآور شاعر گزرے ہیں لیکن ایک زمانے میں انہوں نے اردو زبان کو بھی اپنا وسیلہ اظہار بنا کر اُردوغزل کی زلفوں کو بھی سنوارا۔ مہجؔور کی غزل ریاست میں ایک اہم اور ارتقائی منزل کی اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے روایتی موضوعات کو ہی بیان کیا ہے لیکن ان کی غزل ریاست میں ایک نئے موڑ کا پتہ دیتی ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں کشمیر کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ یہاں کے سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات کا احاطہ بھی کیا ہے۔ ان کی اردو شاعری بہت کم دستیاب ہے لیکن ریاست میں اردوغزل کی تاریخ میں ان کی حیثیت مسلم ہے۔ مہجور کی ایک غزل کے دو اشعار نقل کرتا ہوں۔

دل درد آشنا میرا کسی کا ہم زبان کیوں ہو
عیاں انجام ہو جس کا وہ میری داستاں کیوں ہو
نہ سوچا پہلے کیا انجام ہوگا دل کے سودا کا

دہر ہنگامہ آرائی غمِ سود وزیاں کیوں ہو

مہجور کی غزل زبان وبیان کی تازہ کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ان کی غزل روایتی غزل کی خصوصیات کو سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔غرض کشمیر میں اردو غزل کو صحیح سمت عطا کرنے میں مہجورؔ کی غزل مشعل راہ کا کام کرتی ہے۔بقول قدوس جاوید:

''ریاست جموں کشمیر کے اولین غزل گو شاعر میر کمال الدین حسین رسواؔ ہیں۔لیکن ریاست میں اردو غزل کا باضابطہ ارتقا مہجور کی غزلوں سے ہوتا ہے۔یہ مہجور کی غزل ہی ہے جس کے سبب جموں وکشمیر میں اردو غزل عصری ،لسانی وفکری اور فنی وجمالیاتی تغیرات اور تقاضوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے مسلسل ارتقاء کے مرحلے طے کرتی جارہی ہے۔''[۳]

جموں وکشمیر میں انیسویں صدی کے اواخراور بیسویں صدی کے اوائل میں جو شعراء منظرِ عام پر آکر صنف غزل میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں ان میں طالبؔ کاشمیری، میر غلام رسول نازکی، شہہ زور کاشمیری، غ۔م۔طاوسؔ، میکشؔ کاشمیری، رسا جاودانی، تنہاؔ انصاری، مرزا کمال الدین شیداؔ، شوریدہؔ کاشمیری، غلام علی بلبلؔ، قیصر قلندر وغیرہ شامل ہیں۔

نندلال کول طالب کاشمیری ریاست کے کہنہ مشق شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔موصوف نظم ونثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ان کے دو شعری مجموعے ''رشحات تخیل'' اور ''مرقع افکار'' شائع ہو چکے ہیں۔طالب کشمیر کے ابتدائی دور کے صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔انہوں نے پہلے سیماب اکبر آبادی اور بعد ازاں علامہ دتاتریہ کیفی سے فیض حاصل کیا ہے۔جن کی بدولت ان کے فن میں نکھار پیدا ہوا ہے۔ان کی نظمیں اور غزلیں ان کی فکری بلندی اور فنی بالیدگی کا آئینہ دار ہیں۔ان کے کلام میں موضوعات کی بوقلمونی ملتی ہے۔

میری آنکھوں میں حُسن یار کی تصویر پنہاں تھی
تو میرے روکنے سے پاسباں کے ہاتھ کیا آتا
چھائی ہوئی گھٹائیں گھنگور آسمان پر
برسا رہی تھیں موتی ابر بہار ہوکر

رساؔ جاودانی ریاست کے بھدرواہ علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کو عرف عام میں چھوٹا کشمیر کہتے ہیں۔ ان کی طبیعت بچپن سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل رہی ہے۔رسا جاودانی نے اردو ادب کو دو شعری مجموعے ''لالہ صحرا'' اور نظم ''ثریا'' دیئے ہیں۔رساؔ اردو نظم اور غزل کو برتنے میں یکساں قدرت رکھتے

ہیں۔لیکن غزل میں ان کی دلچسپی زیادہ رہی ہے۔اور غزل میں ہی ان کا فن زیادہ کھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ان کی غزلوں میں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی، اتحاد ملت اور مذہبی افکار جیسے موضوعات پر بھی خاطر خواہ اشعار ملتے ہیں۔

حسن ہے ناز ہے جوانی ہے
ان کے جلووں سے زندگانی ہے
نسل آدم کو کیا ہوا ہے رسا
ہے درندہ بشر، بشر کے لئے
ایسی بستی ہوں جہاں لوگ ہوں سارے انساں
کوئی ہندو ہو وہاں اور نہ مسلماں کوئی

میر غلام رسول نازکی کشمیر کے معتبر اور بزرگ شاعر گزرے ہیں۔نازکی اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی، کشمیری اور ہندی زبانوں پر بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔انہوں نے اپنے تخلیقی جواہر غزل کے علاوہ نظم، رباعی اور قطعات میں بھی دکھائے ہیں۔موصوف علامہ اقبال سے بڑے متاثر رہے ہیں۔جس کا اثر ان کی شاعری میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔اردو میں نازکی کے تین شعری مجموعے ''دیدہ تر''، ''متاع فقیر'' اور ''چراغِ راہ'' منظر عام پر آچکے ہیں۔نازکی کلاسکی شعری روایات کے ساتھ ساتھ نئے اور جدید موضوعات کا احاطہ بھی اپنی غزلوں میں کرتے ہیں۔انہوں نے متنوع موضوعات جیسے غمِ جاناں، غمِ روزگار، غم دوراں، حسن وعشق، بے ثباتی دنیا اور انکشافِ ذات کو اپنی غزلوں میں سمیٹا ہے۔

یہ مایوسیاں ہیں کہ مجبوریاں ہیں
نہ جینے کی خواہش نہ مرنا گوارا
محبت زندگی اور زندگی غم ہوتی جاتی ہے
خوشی تحلیل ہوکر غم میں مدغم ہوتی جاتی ہے
خواب تھا یا طلسم کا عالم
تیرے آنے سے تیرے جانے تک

میر غلام رسول نازکی کشمیر میں اردو غزل کے ایک اہم پڑاو کی حیثیت کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ان کا کلام ریاست کے علاوہ ہندوپاک کے موقر جراید جیسے ''کلیم، ادبی دنیا، ہمایوں، ساقی وغیرہ میں بھی شائع ہوتا رہا ہے۔وہ ریاست کے اساتذہ اور کہنہ مشق شاعر گزرے ہیں۔جس کا اظہار اپنے ایک شعر میں اس طرح کرتے ہیں۔

کشمیر کا رہنے والا ہوں اردوئے معلیٰ لکھتا ہوں
اس دیس میں مجھ سا کوئی اردو کا سخنور ہو نہ سکا

میر غلام رسول نازکی کی شاعرانہ عظمت اور ان کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات کے بارے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''غلام رسول نازکی وادی کشمیر کے کہنہ مشق شاعروں میں سے ہیں اور اردو زبان میں اظہاری نزاکتوں کے شعور بیان کے انداز پر قدرت نے انہیں اساتذہ کے مرتب پر پہنچادیا ہے۔ اساتذہ اردو کی روایات کے وفا شعار پابند ہیں، اسی لئے غزل کی صنف زیادہ تر ان کی فکر کا محور رہی ہے۔ لیکن اُن کی غزل نئے عہد کی نئی غزل ہے۔ جس میں ہمارے اپنے عہد کی فکر کا شعور موجود ہے۔ میرؔ کی سادہ بیانی کا پرتو اگر کشمیر کے کسی سخن سنج کے کلام میں نظر آتا ہے۔ تو وہ نازکی ہیں۔'' ؎

غلام قادر شہ زورؔ کاشمیری ریاست جموں کشمیر کے دبستان سیماب کے نمائندہ شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ موصوف علامہ سیماب اکبر آبادی کے فارغ الاصلاح تلازندہ میں اہم نام اور مقام رکھتے ہیں۔ وہ کشمیر کے برگزیدہ شاعر ہیں۔ انہوں نے نظم اور غزل دونوں اصناف میں نام پیدا کیا ہے۔ ان کے کلام پر سیماب کے علاوہ اقبال کے کلام کے اثرات بھی نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اردو زبان وادب کے ساتھ انہیں والہانہ شغف تھا۔ ان کی غزلوں میں روایتی موضوعات کے علاوہ ترقی پسند افکار اور خیالات بھی پائے جاتے ہیں۔ شہ زور اردو زبان کو برتنے میں غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ انہوں نے سیاسی، سماجی اور معاشرتی موضوعات کو بھی اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ ؎

متاعِ زندگی کا شکریہ، واپس اسے لے لے
اُٹھاوں اس کرم کا بوجھ اپنی روح پر کب تک
تجھے تو حشر میں آخر نقاب اٹھانا ہے
جو کام کرنا ہے اک دن وہ آج ہی کرتے
ہیں بلند اتنے عزائم ترے دیوانوں کے
خود جنون سیتا ہے چاک ان کے گریبانوں کے
شمع ہی کو نہیں محفل کو بھی گرماتے ہیں
رات بھر بڑھتے ہوئے حوصلے ارمانوں کے

شہ زور کاشمیری کی غزل کی رنگا رنگی کے پیش نظر ڈاکٹر محمد ریاض احمد لکھتے ہیں:

''شہ زور کشمیری بنیادی طور پر ایک کلاسیکی شاعر ہیں لیکن ان کی غزلوں میں رومانی اور ترقی پسند غزل کے اثرات بھی پنہاں ہیں۔علاوہ ازیں سیماب اکبر آبادی کے فنی وتخلیقی رویئے کا بھی احساس ہوتا ہے۔ساتھ ہی شہ زور کاشمیری اقبال کے اسالیب کی تقلید بھی کرتے نظر آتے ہیں۔اس لئے ان کے ہاں کئی رنگ نظر آتے ہیں۔'' ۵

غلام محمد طاوس جو غ۔م۔طاوس کے نام سے ادبی حلقوں میں پہچانے جاتے ہیں۔آپ ریاست کے زعفران زار پانپور سے تعلق رکھتے ہیں۔طاوس کشمیر کے صف اول کے غزل گوشعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں۔اگر چہ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں ہیں لیکن صنف غزل کو انہوں نے اپنے تخلیقی جواہر سے مالا مال کیا ہے۔ان کا ایک شعری مجموعہ ''موج موج'' کے نام سے منصۂ شہود پر آچکا ہے۔طاوس بھی ریاست کے متعدد شعراء کی طرح اقبال کے فکروفن سے متاثر نظر آتے ہیں۔علاوہ ازیں حفیظ جالندھری اور غالب کے کلام کا اثر بھی موصوف نے قبول کیا ہے۔طاوس حیات وکائینات کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اوران کو اپنی غزلوں میں اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتے ہیں۔

سکھائیں گے شہروں کو روبہ مزاجی
توقع کسے تھی یہ ارباب دین سے
زندگانی میں میسر ہو مجھے دل کا سکوں
موت آجائے تو مرکر نوحہ خواں کوئی نہ ہو
تیرے آسمانوں کی ہو خیر یا رب
کہ انسانوں نے تاروں پہ باندھے نشاں

شیخ غلام علی بلبل کاشمیری اسی دور کے ایک اہم غزل گوشاعر رہے ہیں۔انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو صنف غزل کی صورت میں اُجاگر کیا ہے۔ان کی غزل میں طنزومزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں۔بلبل کاشمیری اردو زبان پر کامل دسترس رکھتے تھے اوراس میں اپنے دل کی داستان غزل کی زبان میں پیش کرتے تھے۔ان کی غزل روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ سماجی اور ثقافتی پہلوؤں سے بھی آراستہ ہوتی ہے۔

رو رو کے میں جگاؤں سوتوں کو خواب شب سے
اے میری چشم گریاں شمع مزار بن جا

تری ابرو کماں، مژگان نازک خنجر ہے
تری ہر بات گولی ہے زبان پستول ہے ساقی
یہ چیچک کے داغوں کی رونق تو دیکھو
رخ یار کیا گلستان ہو رہا ہے

کشمیر کے اہم اور کہنہ مشق غزل گو شعراء میں تنہا انصاری بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کا اصلی نام حسین علی انصاری ہے لیکن تنہا انصاری کے قلمی نام سے ہی شہرت ملی ہے۔ان کی غزل کے اہم موضوعات میں حسن وعشق، مناظر قدرت اور تہذیبی وثقافتی زندگی شامل ہے۔تنہا زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔انہوں نے اردو زبان کے علاوہ کشمیری میں بھی اچھا خاصا شعری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ان کی غزل ان کے ذہنی اُپج اور فکری بلندی کو آئینہ کر دیتی ہے۔

گردش شام وسحر نے دے دیئے کیا کیا فریب
ہو رہا ہے آج کل اور کیا سمجھا تھا میں
نہ پوچھو ہم جیتے ہیں کیونکر تیری رنگین دنیا میں
سسکتی زندگی ہے اور زبان خاموش ہے ساقی
وہاں خم اور یہاں قطرے ترا انصاف بھی دیکھا
یہ پامال ستم تنہاؔ تو دریا نوش ہے ساقی

کمال الدین شیداؔ ریاست کی اردو غزل کی تاریخ میں ایک اہم نام ہے۔وہ اردو کے کلاسیکی ادب کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔اردو غزل ان کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔اور اسی میں اپنے مشاہدات اور تجربات کو پیش کرتے رہے ہیں۔ان کی غزل میں اخلاقی موضوعات کی کثرت ملتی ہے۔شیدا کی فکر کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ اخلاقی قدروں کے امانت دار اور پاسدار شاعر ہیں۔

صبح کا دل کش سماں، یہ کوہسار
آب جو صحن صحن صورت ہزار
تیری فطرت سے ناداں فتنہ سامانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نگہ کی تنگ دامانی نہیں جاتی
سمٹ سکتا نہیں بکھرا ہوا ملت کا شیرزہ
کہ جب تک نو جوانوں کی تن آسانی نہیں جاتی

قیصر قلندر کا نام بھی ریاست کے برگزیدہ غزل گو شعراء میں لیا جاتا ہے۔موصوف حسن وعشق کے لطیف اور

پُر پیچ پہلوؤں کو اپنے مخصوص انداز میں اظہار کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ قیصر کا شعری مجموعہ ساز جمال ’’ کے نام سے شایع ہوا ہے۔ ان کے یہاں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ ترقی پسند غزل کے اہم موضوعات بھی نظر نواز ہوتے ہیں۔ قیصر قلندر صنف غزل کی باریکیوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔

پہلے جو سکھا دیتے آداب محبت تو
ہونٹوں کو سیا ہوتا، اشکوں کو پیا ہوتا
جب درد کی شمعیں جلتی ہیں احساس کے نازک سینے میں
اک حسن سا شامل ہوتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں
بے باکیٔ اظہار سے مجبور ہوں قیصر
حق بات کہوں یا نہ کہوں سوچ رہا ہوں

کشمیر سے تعلق رکھنے والے اہم اور بڑے غزل گو شعراء میں شوریدہ کاشمیری کا نام کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ شوریدہ اُردو زبان کے استاد رہے ہیں انہیں اردو زبان سے بے پناہ محبت تھی۔ اردو میں ان کے دو مجموعے ’’جوش جنوں‘‘ اور ’’جذبۂ دروں‘‘ شائع ہو چکے ہیں۔ شوریدہ کاشمیری غزل میں اپنے خیالات کی بہترین ترسیل کرتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں ہیں لیکن غزل ان کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ ان کی غزل میں انسانی اقدار، رشتوں کی اہمیت، اخلاقی زندگی، سیاسی بدحالی وغیرہ جیسے موضوعات پر بہت اچھے اشعار ملتے ہیں۔ کشمیر کے استاد غزل گو شعراء میں شوریدہ شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے ریاست میں اردو غزل کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

میرے پُر درد نالے گونجتے ہیں آسمانوں میں
ترے جلووں کا ہنگامہ مری آہ و فغان تک ہے
وہیں کعبہ سمجھ لیا جائے
دل ادا جس جگہ نماز کرے
لوگ ہیں اور قید بے زنجیر
اپنا اپنا مکان زندان ہے

کیلاش ناتھ کول میکش کاشمیری کشمیر کے اقبال شناس شعراء میں سرفہرست ہیں۔ میکش اقبال کی شخصیت اور شاعری سے بہت متاثر رہے ہیں۔ اور اقبال کو اپنا معنوی مرشد بھی تسلیم کرتے ہیں۔ میکش کے تین شعری مجموعے ’’بال عنقا‘‘، ’’بالِ ہما‘‘ اور ’’شہپر طاؤس‘‘ کے نام بھی اقبال کی شعری تراکیب سے لئے گئے ہیں۔ اردو کو برتنے میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی غزل بھی روایتی موضوعات کے علاوہ

قومی یکجہتی، اتحاد واتفاق اور انسانیت کے بارے میں بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ موصوف مخصوص انداز بیان کے مالک تھے۔ عروض وآہنگ پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔

میں آدم زاد ہوں ہندو نہ مسلم
یہی ہے مختصر میری کہانی
سبھی ہیں ایک چمن کے طیور خوش الحان
وہ بھارتی ہو کہ پاکی، مصری وچینی
کفر واسلام گلے ملتے ہیں باہم میکش
باہم آغوش سِحر وشام ہوئی جاتی ہے

ریاست جموں وکشمیر میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اردو غزل میں بعض ایسے شعراء بھی منظر عام پر آئے ہیں جنہوں نے روایتی موضوعات سے کسی حد تک کنارکشی اختیار کر کے ترقی پسند افکار وخیالات کی ترجمانی کی ہے۔ ان میں خاص طور پر دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، فاضل کاشمیری، مہندر رینہ، امین کامل، مظفر عازم، غلام نبی خیال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دینا ناتھ نادم کشمیر کے نمائندہ ترقی پسند شاعر گزرے ہیں۔ نادم کشمیری زبان کے قد آور شاعر گزرے ہیں لیکن انہوں نے اردو زبان سے ہی اپنا شعری سفر شروع کیا ہے۔ اور اس زبان میں بھی ان کی نظموں اور غزلوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ نادم کارل مارکس کے خیالات سے بہت متاثر رہے ہیں۔ اور اس کا اظہار بھی انہوں نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ ان کی غزل میں سماجی نابرابری، ظلم و استحصال کے موضوعات نظر آتے ہیں۔

سحر تو فکر عمل سے جو بے نیاز ہوا
زیاں و سود کو دریا میں جا کے ڈال دیا
رات کا پچھلا پہر تارے ہوئے ہیں محو خواب
دامن بادل میں جا کر سو چکا ہے آفتاب

رحمان راہی کشمیری زبان کے گیان پیٹھ انعام یافتہ شاعر ہیں۔ لیکن انہوں نے ایک زمانے میں اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ ان کا شمار ریاست کے ترقی پسند شعراء میں کیا جاتا ہے۔ راہی ترقی پسند خیالات کی ترجمانی اپنی غزلوں میں بڑی بے باکی سے کرتے ہیں۔ بقول جاوید قدوس:

"رحمن راہی نے ابتدائی دور میں اردو میں بڑی پُر جوش ترقی پسند غزلیں کہی تھیں۔" ٦

رحمان راہیؔ کا اردو کلام بہت کم ہے لیکن اس میں روایتی، ترقی پسندی اور جدید غرض ہر نوع کی غزلیں ملتی ہیں۔ لیکن ترقی پسند خیالات برتنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

نقیب تو نے نئے دن کا صور پھونک دیا
اندھیرا ٹوٹ چکا سونے والوں کو تو جگاؤ
نہ بجھ سکے گا کبھی آندھیوں سے اب یہ چراغ
حیات نے نئی منزل کا پا لیا ہے سراغ

مہندر رینہؔ بھی کشمیر کے اہم ترقی پسند غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ رینہ نے اپنے قلم سے سیاسی، سماجی اور معاشرتی استحصال کے خلاف پر جوش غزلیں لکھیں ہیں۔ رینہ فیضؔ اور مجروحؔ سے بڑے متاثر رہے ہیں۔

چھوڑو بھی خزاں کے ہر قصے، تعمیر چمن کی بات کریں
کچھ لالہ و گل کا ذکر کریں، کچھ سرو و سمن کی بات کریں
آجائے گا آخر موسم گل، اکسیر بنے گی خاک چمن
ہر شاخ سے نغمے پھوٹیں گے اک ایسے قرن کی بات کریں

غلام احمد فاضل کاشمیری ریاست کے کہنہ مشق شعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روایتی موضوعات کے علاوہ ترقی پسند خیالات پر مشتمل اچھی غزلیں بھی ملتی ہیں۔

ظلم پرور تیری عادت ناشکیبا میرا غم
رحم تیرے دل میں کم ہے صبر میرے دل میں کم
تو نے دیکھی ہے غلط تقسیم زر کی مال کی
اہل زر کی خواجگی، مزدور کی بے چارگی

امین کاملؔ کشمیری زبان کے اچھے شاعر اور محقق گزرے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو غزل گوئی سے کیا ہے۔ انہوں نے شروع میں روایتی موضوع پر غزلیں کہی لیکن بعد ازاں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور اس کی ترجمانی غزل میں کرنے لگے۔ اُن کی اردو غزلیں پُر جوش ہوتی ہیں۔

جو آگ لگائیں کھیتوں میں
منہ بند کریں برساتوں کا
اس امن کی پیاسی دھرتی پر
کیا کام ہے ان بد ذاتوں کا

اندر جیت لطفؔ کا شمار بھی کشمیر کے ترقی پسند غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی غزل میں ایک نیا پن نظر آتا

ہے۔انہوں نے روایت سے انحراف کر کے ترقی پسند افکار کی بھرپور ترجمانی اپنی غزلوں میں کی ہے۔

اے رہ نو ورد آبلہ پائی کا ذکر چھوڑ
راہ طلب میں ہمت مرداں کی بات کر
تنگ آگیا ہوں، حسن وجوانی کے ذکر سے
لِللہ اب نہ خواب پریشاں کی بات کر

جموں وکشمیر میں ۱۹۴۷ء کے بعد اردوغزل کے منظرنامے پر مذکورہ شعراء کے ساتھ ساتھ نئے شعراء کی نسل ابھر کر سامنے آتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد موجودہ دور تک ریاست کے ان غزل گوشعراء کو آسانی کے لئے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک، دوسرا دور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک اور تیسرا دور ۱۹۸۰ء سے موجودہ دور تک۔ مذکورہ ادوار میں پہلے دور یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک جن شعراء نے ریاست جموں وکشمیر میں اردوغزل کو بطور خاص اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے ان میں عرش صہبائی، عابد مناوری، حامدی کاشمیری، ہمدم کاشمیری، حکیم منظور، مظفر ایرج، ودیا رتن عاصی، فاروق نازکی، سیفی سوپوری، سلطان الحق شہیدی وغیرہ کے نام خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔

عرش صہبائی ریاست جموں وکشمیر کے صوبہ جموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا اصلی نام ہنس راج ابروال ہے لیکن عرش صہبائی کے قلمی نام سے پہنچانے جاتے ہیں۔عرش صہبائی ریاست کے سربر آوردہ غزل گوشاعر ہیں۔ان کا شعری سفر پچھلے سٹھ برسوں پر مشتمل ہے۔عرش صہبائی اردوغزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ان کے ڈیڑھ درجن شعری مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔ریاست کے سب سے زیادہ لکھنے والے شاعر ہیں۔ان کی غزل میں روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ ترقی پسند اور جدید موضوعات بھی ملتے ہیں۔عرش کی غزل میں زندگی اور متعلقات زندگی کے بے شمار پہلو جلوہ افروز ہوتے ہیں۔وہ انسانی اقدار کی پاسداری کرنے والے شاعر ہیں۔ان کی غزل فکر واحساس کی تازہ کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔

کتنی آوازوں کا شور بپا ہے مجھ میں
ایسا لگتا ہے کوئی شہر بسا ہے مجھ میں
روداد ہم اے دیدۂ تر کچھ نہیں کہتے
کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کچھ نہیں کہتے
بدلنا ہے مجھے اے عرش زندگی کا نظام
بلا سے لاکھ رسوم کہن کے پہرے ہوں

شگفتہ گل، شکست جام، صلیب، ریزہ ریزہ وجود، جواز، عکس جمال' عرش کے شعری مجموعے ہیں۔عرش کی غزل میں روایت اور جدیدیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔عرش نے ساری زندگی غزل کے گیسو سنوار نے میں گزار دی ہے۔اگر چہ انہوں نے نظم اور قطعہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا فن غزل میں ہی صحیح انداز میں کھلتا ہے۔وہ بنیادی طور پر غزل کے ہی شاعر ہیں۔بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

''عرش صہبائی ریاست کے غزل گو شعراء میں نمایاں ہیں، کہنے کو وہ نظم پر بھی طبع آزمائی کرتے ہیں اور خارجی انداز کی شاعری بھی کی ہے۔لیکن ان کا مخصوص فن غزل کا فن ہے اور داخلیت ان کا شعری رجحان۔اس سے تجاوز کی انہوں نے کوشش بھی کم کی، اس لئے غزلیہ انداز کی شاعری میں انہیں خصوصیت حاصل ہوگئی ہے۔'' ۷

حامدؔی کاشمیری کشمیر میں اردو غزل کا روشن اور تابناک نام ہے۔ان کی غزل ریاست میں ایک اہم موڑ کا پتہ دیتی ہے۔اگر چہ انہوں نے ابتداً عشقیہ موضوعات کو نظم کیا ہے، لیکن ریاست میں جدید اردو غزل کا آغاز حامدی کی غزل سے ہوتا ہے۔ان کی غزل گہری معنویت کی عمدہ مثال ہے۔حامدی کی غزلیں پیکر تراشی اور علامت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔اردو غزل کے جدید شعراء کے کلام کا حامدی نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔جس کا اثر ان کے کلام میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔حامدی کی غزل فکر و فن اور انداز بیان کے لحاظ سے قابل دید ہیں۔حامدی غزل کے فن کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔

پوچھتے کیا ہو وادیوں کا حال
نوحہ گر ہیں چنار راہوں میں

میرے چہرے کی خموشی پہ نہ جا
ہے میرے سینے کے اندر کربلا

خون سے رنگین کرلو راستے
اک نہ اک دن بے گماں آجائے گا

سکوت گرد میں دیوار و در سوالی تھے
وہ لوگ کیا ہوئے شہروں کے شہر خالی تھے

عروس تمنا، لاحرف، شاخ زعفران، نایافت، وادی امکان، خواب رواں، اور یک شہر گماں' حامدی کے شعری مجموعے ہیں۔ان کی غزل میں حسن و عشق، فطرت کشمیر کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے متنوع حالات و واقعات کی عکاسی ملتی ہے۔ان کی غزل میں معنی کی تہہ داری اور فکر کی گہرائی پائی جاتی

ہے۔حامدی کی غزل گوئی کے بارے میں پریمی رومانی لکھتے ہیں:

''حامدی کاشمیری غزل کے فن سے واقف ہیں، ان کی غزلوں میں تہہ داری اور معنی آفرینی ملتی ہے۔وہ شاعرانہ اظہار کے لئے علامتی اسلوب استعمال کرتے ہیں اور اپنی لاشعوری گتھیوں کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔وہ شعر میں پیکریت کے قائل ہیں اور زیادہ سے زیادہ پیکروں کی علامتی اہمیت پر توجہ دیتے ہیں۔''[8]

عابد مناوری اس دور کے ایک اور اہم غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ان کے تین شعری مجموعے ''بہار غزل، شمیم گل اور برجستہ'' شائع ہو چکے ہیں۔غزل کی فنی باریکیوں پر اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔زبان اور لہجے میں نیا پن پایا جاتا ہے۔انہوں نے غزل میں حسن وعشق کے لطیف موضوعات کو نازک الفاظ میں برتا ہے۔ان کی غزل میں موضوعات کی بوقلمونی پائی جاتی ہے۔روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ عابد کے یہاں جدید حسی عناصر بھی موجود ہیں۔عابد مناوری غزل کے فن اور زبان کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔عابد کی غزل میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کے اہم موضوعات بھی نظر نواز ہوتے ہیں۔عابد مناوری کی غزل میں معنی آفرینی کے علاوہ فکر وخیال کی بلندی اور غنائیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

میں آندھیوں سے لڑوں گا یہ میں نے سوچا تھا
ہوا کا ایک ہی جھونکا بجھا گیا مجھ کو
میرے آنگن میں بھی اے قوس قزح ایک دن اُتر
زندگی میں تیرا اک اک رنگ بھرنا ہے مجھے
اس نے لکھا بھیجا ہے یہ پیپل کے پتے پر مجھے
کیا تجھے راس آگئی بجلی کے پنکھے کی ہوا

حکیم منظور کی غزل ریاست میں جدید غزل کی نمائندہ ہے۔ان کی غزل میں نئے میلانات اور عصری حسیت پائی جاتی ہے۔حکیم منظور کی غزل میں کشمیر کے خونین واقعات اور کشمیر کی تہذیب اور ثقافت اہم موضوعات ہیں۔حکیم منظور نے اردو غزل میں ترکیب سازی اور پیکر تراشی کا حیرت انگیز اضافہ کیا ہے۔ان کی غزلوں میں بعض تراکیب ایسی بھی ہیں جو کشمیر کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی عکاس ہیں۔

چنار چہرے ہیں ان کی کوئی زبان نہیں ہے
سلگ رہے ہیں پر کہیں دھواں نہیں ہے
سوکھے ہوئے پیڑوں پے ہواوں نے لکھا ہے

اس شہر کی مٹی میں نہ وہ خوشبو ہے نہ وفا ہے
لوگو لب کھولو کچھ تو بولو جہلم ہے مٹیالا کیوں

میں نے جب اس کو دیکھا یہ تھا اک آئینہ سا
کانگڑی بستر میں رکھ کر کھڑکیوں کو واکروں
برف گرنے کا کبھی میں یوں ہی نظارہ کروں

حکیم منظور کی غزل میں لہجے کی تازہ کاری معنی کی گہرائی اور گیرائی دل کو چھو لیتی ہے۔ حکیم منظور احساس کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں احساسات کا بے بہا سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ عصری تقاضوں کو اپنے شرطوں پر شعری پیرائے میں ڈالنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ناتمام، لہولمس چنار، برف رتوں کی آگ، خوشبو کا نام نیا، شعر آسمان وغیرہ موصوف کے شعری مجموعے ہیں۔ منظور ریاست کے ایسے غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے کشمیر اور کشمیریت کو اپنے فن کے ذریعے پوری دنیا میں متعارف کرایا ہے۔ ان کی غزل میں لسانی اور ہیتی تجربات کا انوکھا انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بقول مسعود منور:

> ''حکیم منظور کی غزلیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کی جڑیں اپنی زمین میں بہت گہری ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ارض سیب کی اخروٹ، نکہتوں، سکوت برف شی، نزول آفتاب، برف ملبوس، برف کا بستر، سلگتی برف، جیسی تراکیب وضع کر کے جہاں اپنے مقامی رنگ کو نمایاں کیا ہے وہاں غزل کے پیکر کو ایک تازہ تر، ایک بالکل منفرد، ایک غایت درجہ انوکھا ملبوس بھی دیا ہے۔ اور وہ اپنے اس رویے کی بنا پر اپنے ہم عصروں میں بالکل علیحدہ دکھائی دیتے ہیں۔'' 9

ہمدم کاشمیری ریاست کے ایک اور نمائندہ غزل گو شاعر ہیں۔ وہ خالص غزل کے شاعر ہیں۔ ان کا شمار ریاست کے جدید غزل کے صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی غزل میں حسن وعشق کی رنگارنگی، سوز وگداز اور حسرت ویاس کا خوبصورت امتزاج بھی ملتا ہے۔ ہمدم کی غزل کا لہجہ تازہ اور نیا ہے۔ ان کی غزل میں حیات وکائنات کے بے شمار موضوعات ذاتی تجربات کے حوالے سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہمدم کی غزلوں میں استعاراتی اور علامتی انداز ان کو جدید غزل گو شعرا میں ایک اہم مقام عطا کرتا ہے۔

آگ کا کوئی نشاں بھی تو نہ تھا
کیوں دھواں اُٹھتا رہا چاروں طرف
ہر طرف سے جڑی ہوئی ہے مگر

آسماں سے زمیں جدا ہے کہاں
کیوں ہمارے ہم سفر گم ہوگئے
کچھ ادھر اور کچھ اُدھر گم ہوگئے

ہمدم کاشمیری کی غزل میں انسانی درد و کرب کو بڑی شدت کے ساتھ تو محسوس کیا جاسکتا ہے۔وہ جذبے کے شاعر ہیں۔''دھوپ لہو کی'' اور ''ورقِ سادہ'' ہمدم کے شعری مجموعے ہیں۔غزل کی فنی باریکیوں سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ڈاکٹر شفق سوپوری ہمدم کاشمیری کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمدم کاشمیری خالصتاً غزل کے شاعر ہیں۔ان کی غزل جدید لسانی جمالیات کو مہذب اور پُر وقار بنانے کا ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔'' ۱۰

مظفر ایرج ریاست کے ایک اور معتبر غزل گو شاعر ہیں۔ان کے چھ شعری مجموعے ''ابجد، انکسار، ثبات، ہوادشت دیار، دل کتاب اور سخن آئینہ'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ایرج جدید غزل کے ایک نمائندہ شاعر ہیں۔ان کے یہاں جذبات کے اظہار کے لئے اردو کے ساتھ ہندی الفاظ کا خوبصورت التزام بھی ملتا ہے۔غزل سے ان کی طبعی مناسبت ہے۔ایرج کا مطالعہ گہرا اور لب ولہجہ تازہ ہے۔وہ فکر کے شاعر ہیں۔ان کی غزل میں فکری تازگی قاری کو فوراً متوجہ کرتی ہے۔انسانی اقدار کی پامالی، محرومی اور مایوسی ایرج کے اہم موضوعات ہیں۔

میری بستی میں بھی آکر دیکھئے
حشر سے پہلے ہی محشر دیکھئے
ہر طرف جاگی زعفران مٹی
جب بھی مہکا تمہارا جوگن روپ
چاند نگر میں ڈھونڈا آنگن میں دیکھا
ان کو پایا جب دل درپن میں دیکھا

مظفر ایرج کی غزل جدید حسیت کی بہترین عکاس ہے۔انہوں نے گردونواح کے حالات و واقعات کو اپنی ذات کے حوالے سے غزل کی صورت میں جلوہ گر کیا ہے۔

فاروق نازکی اس دور کے اہم غزل گو شاعر ہیں۔فاروق پیدائشی شاعر ہیں۔ان کی غزل میں فکر واحساس کی تازگی اور زبان وبیان کی ندرت دیکھنے کو ملتی ہے۔معنی آفرینی اور مضمون آفرینی فاروق کی غزل کی اہم خصوصیات ہیں۔فاروق ایک حساس اور دردمند سخن سنج ہیں۔ان کے ابتدائی دور کے کلام میں حسن وعشق کے پر کیف موضوعات کی خوبصورت عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔بعدازاں ان کی غزل میں جدید

عصری حسیت کے متنوع پہلو در آتے ہیں۔ فاروق کی زبان سادہ اور مترنم ہیں۔ چھوٹی بحروں میں غزلیں کہنے پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ''آخری خواب سے پہلے'' اور ''لفظ لفظ نوحہ'' ان کے دو شعری مجموعے ہیں۔

موسمِ گل سے برف زاروں تک
سینکڑوں رنگ میں بدلتا ہوں
وہی میں ہوں خالی مکاں ہے
میرے کمرے میں پورا آسماں ہے
میں ہوں مضطر بدن کی نگری میں
میرے حصے میں لامکاں لکھنا

اسی قبیل کے ایک اہم غزل گو شاعر ودیا رتن عاصی ہیں۔ عاصی روایتی اور کلاسیکی غزل کے امانت دار ہیں۔ ان کے یہاں ہجر و وصال، رنج و غم، غم جاناں اور غم دوراں جیسے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ عاصی خالص غزل کے شاعر ہیں۔ عاصی کی غزل میں جدید سیاسی اور سماجی مسائل کی عکاسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ زبان و بیاں میں سادگی اور اظہار و اسلوب میں تازگی عاصی کی غزلوں کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''دشت طلب'' شائع ہو چکا ہے۔

یہ وقت کے حاکم ہیں، سنا وقت کے حاکم
یہ کہتے ہیں مر جاؤ تو مر کیوں نہیں جاتے
اپنے جیسے ہزار ہیں عاصی
تیرے جیسا نظر نہیں آتا
تنکا تنکا نظر نہیں آتا
ہم کو کیا کیا نظر نہیں آتا

سلطان الحق شہیدی، سیفی سوپوری اور شبیب رضوی بھی اسی دور کے اہم شعراء ہیں۔ سلطان الحق شہیدی غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے روایتی غزل کی پاسداری کی ہے اور جدید دور کے تقاضوں کی پیش کش بھی۔ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ سیفی سوپوری ریاست کے کہنہ مشق اور بزرگ غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے یہاں بے ثباتی دنیا اور تصوف کے علاوہ انسانی اقدار کی پامالی جیسے موضوعات خاص طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ شبیب رضوی اردو زبان کے ماہر ہیں۔ ان کا تعلق اگرچہ ریاست سے نہیں ہے لیکن انہوں نے کشمیر میں آدھی صدی سے بھی زیادہ وقت گزارا ہے۔ اور اب یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ فن کے

ساتھ ساتھ زبان کی صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ان کے یہاں بھی روایتی موضوعات کے پہلو جدید اور نئے میلانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔موصوف نے ریاست کے کئی نومشق شعراء کی تربیت اور اصلاح کی ہے۔ان کی غزل زبان وبیان کا عمدہ نمونہ ہے۔

حاصل عمر گراں مایہ سمجھ لو اس کو
بزم احباب میں مل جائے جو انساں کوئی
خراب و خستہ ودلگیر ہوں میں
بس اتنا جانئے کشمیر ہوں میں
(سلطان الحق شہیدی)

اک آگ سی سینے میں ہے کیا نام ہے اس کا
اپنے بھی تو یاور کئی انداز بیاں تھے
خامشی میری بہ انداز فغاں ہے کہ نہیں
دل کی ہر بات نگاہوں سے عیاں ہے کہ نہیں
(سیفی سوپوری)

آج انساں بھی حقیقت سے خود آگاہ نہیں
یعنی انساں میں بشر کتنا ہے شر کتنا
تیز پا ہوں بس یہی تفسیر لکھی جائے گی
اس سفر میں پاوں پر زنجیر لکھی جائے گی
(شبیب رضوی)

ریاست میں اردو غزل ۱۹۴۷ء کے بعد کا دوسرا دور ۱۹۶۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔یہ دور اردو شعروادب میں ایک اہم اور نئے موڑ کا پتہ دیتا ہے۔دنیا بھر میں نئی نئی اور حیران کن ایجادات وانکشافات نے شعروادب کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا۔موضوع اور اسلوب کے حوالے سے اُردو شاعری میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ایک نئے عہد کا آغاز ہونے لگا۔اب شعراء روایتی موضوعات اور فرسودہ مضامین سے کنارہ کشی اختیار کر کے ذات کا اظہار علامتی پیرائے میں کرنے لگے۔ملکی مسائل،قدروں کی شکست و ریخت،عدم تحفظ،لاچاری اور بے یقینی اس دور کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔جموں وکشمیر میں اس نئے دور کا آغاز سب سے پہلے حامدی کاشمیری،حکیم منظور،مظفر ایرج،عرش صہبائی،عابد مناوری، ہمدم کاشمیری،فاروق نازکی وغیرہ جیسے نمائندہ غزل گوشعراء نے کیا ہے۔ان شعراء کے بعد ریاست میں نئی

غزل کی نمائندگی جن شعراء نے کی ہے ان میں ایاز رسول نازکی، رفیق راز، پرتپال سنگھ بیتاب، اقبال فہیم، خالد بشیر احمد، فاروق مضطر، احمد شناس، شجاع سلطان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایاز رسول نازکی کا شمار ریاست کے نمائندہ جدید غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ شاعری ان کو وراثت میں ملی ہے۔ ''خودار'' اور ''شام سے پہلے'' ایاز کے دو شعری مجموعے ہیں۔ ان کی غزل میں ازلی کیفیت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ فنی شعور اور جدید حسیت کا دلکش امتزاج ملتا ہے۔ ایاز انسان کی بے بسی، محرومی اور عدم تحفظ کو اپنی غزل میں پیش کرتے ہیں۔ فکر و احساس اور جمالیاتی ذوق ایاز نازکی کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ ایاز رسول نازکی کی زبان اور اسلوب و آہنگ بھی نیا اور تازہ ہے۔ وہ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

وہ آگئے کہ گئی رات دن ہوا روشن
چراغِ چشم ہوا تھا ابھی صبا روشن
سیب کے پیڑ سب ہرے لیکن
ان پہ اک بھی ثمر نہیں آتا
راستے میں پڑا ہوں مدت سے
وہ گزرتا مگر کہاں گزرا

ریاست میں جدید غزل کے اہم اور معتبر شعراء میں رفیق راز ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ رسالہ ''شب خون'' میں کشمیر کے سب سے زیادہ چھپنے والے شاعر رفیق راز کی غزل عصری حسیت کا دلکش مظہر ہے۔ راز کی غزلوں میں علامت سازی اور پیکر تراشی کی انوکھی کائنات دیکھنے کو ملتی ہے۔ ریاست میں جدید غزل میں راز کا لب ولہجہ اور انداز و اسلوب سب سے جداگانہ ہے۔ ان کے یہاں تجربات کی بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ ''انہار''، ''مشراق'' اور ''نخلِ آب'' رفیق راز کے شعری مجموعے ہیں۔ رفیق راز فکر کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں متصوفانہ عناصر بھی ملتے ہیں۔ موصوف علم عروض کے ماہر بھی ہیں۔

روح کی خاموشیوں کو جانے کیا سوجھی کہ بس
رات کے پچھلے پہر سر پر اُٹھایا آسمان
نخل ہوس کے سائے میں چلنے سے پیشتر
باغ بدن پہ چھائی کیسی بہار دیکھو
خزاں رسیدہ ہر ایک صفحہ قرار یہ ایک دن
سنہری یاد کے جھرونکوں نے سبز خواب لکھا

رفیق راز کی غزل حیات وکائنات کے بے شمار راز کھول دیتی ہے۔ زبان وبیان کی ندرت، موضوعات کی

بوقلمونی، ترکیب سازی اور پیکر تراشی رفیق راز کی فنی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''رفیق رازؔ کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں پہلو اس کا فکری آہنگ ہے۔ ان کے لہجے اور افکار دونوں میں تمکین اور پختگی نمایاں ہیں۔'' [11]

پرتپال سنگھ بیتابؔ نہ صرف ریاست بلکہ ملکی سطح پر اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ بیتابؔ نئی غزل کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے تجربات محسوسات اور خیالات کو اپنے منفرد انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی غزل علامتی اور استعاراتی پیش کش کا عمدہ نمونہ ہے۔ بیتاب معاصر حالات و واقعات کا اظہار اشاراتی پیرائے میں کرتے ہیں۔ بیتاب کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ زبان و بیان کا انوکھا انداز ہے۔ عام فہم اور سادہ زبان کو ہی خاطر میں لاتے ہیں۔ بیتاب کے کلام میں موجودہ عہد کے انسان کی روح تڑپتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ موج رنگ، پیش خیمہ، سراب در سراب، کیکٹس اور گلاب اور فلک آثار سے'' بیتاب کے شعری مجموعے ہیں۔

مجھے معلوم تھا میں اور سنور جاؤں گا
گھر سے نکلوں گا تو ہر سمت بکھر جاؤں گا

کچھ تو ہیں پتھر پریشان آرزوں کے درمیان
اور کچھ آزر پریشان پیکروں کے درمیان

اپنے زخموں کو اے دل بیتاب
اپنے ہی آنسوؤں سے دھونا ہے

خالد بشیر احمد بھی اسی دور کے اہم غزل گو شاعر ہیں۔ خالد نہایت ہی حساس طبعیت کے مالک ہیں۔ ان کی غزل جدید عصری میلانات کی آئینہ دار ہے۔ خالد عصری مسائل کا اظہار اپنی ذات کو حوالے سے کرتے ہیں۔ احساس کی گہرائی، فکر کی بلندی اور معنوی تہہ داری خالد کی غزل کے بنیادی مدار ہیں۔ خالد جدید حسیت اور عصری آگہی کا انعکاس اپنے منفرد لب ولہجہ اور مخصوص الفاظ و علائم سے کرتے ہیں۔ وادی کشمیر کے موجودہ حالات اور ان سے پیدا شدہ صورت حال کی پیش کش خالد علامتی انداز میں کرتے ہیں۔ خالد نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے الفاظ، استعارات اور علامات کا ایک مخصوص نظام قائم کیا ہے۔ جس کی بدولت انہوں نے اردو غزل میں اپنا انفرادی مقام قائم کیا ہے۔ ''صدائے نیم شب'' اور ''خواب پارہ'' خالد بشیر احمد کے شعری مجموعے ہیں۔

جنگل بارش بھینی خوشبو گھاس ہری
ایسا منظر اور آنکھوں کی پیاس ہری

بند کمرے میں جھانک کر سورج
کھڑکیوں سے لپٹ کر ہنستا ہے
میرے وطن میں سیاہ جنوں کے ہاتھوں نے
گلی گلی میں فروزاں کیئے ہیں ہو کے چراغ

نئی غزل کے اہم شعراء میں اقبال فہیم بھی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔وہ اپنی تازہ کاری اور لہجے کی نرمی کی بدولت دور سے پہچانے جاتے ہیں۔اقبال ایک ذہین شاعر ہیں۔انہوں نے اپنی غزلوں میں اپنی ذات کے حوالے سے جو تجربات پیش کیئے ہیں وہ قابل دید ہیں۔اقبال فہیم کے تین شعری مجموعے ''موج نفس''، ''سنگ برآب'' اور ''ندائے آوارگی'' شائع ہو چکے ہیں۔

خود آگہی کے قتل میں مرنا پڑا مجھے
چہرے بتا رہے ہیں کہ زور ادا نہ ڈھونڈ
اُگتے ہی منظروں کو یہ کیا ہوگیا فہیم
میں صاحب کتاب ہوں رقصِ انا نہ ڈھونڈ

شجاعؔ سلطان کا نام بھی اسی قبیل کے غزل گو شعراء میں آتا ہے۔آپ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔شجاع کا ایک شعری مجموعہ ''خواب زار'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔آپ جدید غزل کے معتبر شاعر تھے۔شجاع سلطان کے یہاں ذاتی کرب کی روداد سنائی دیتی ہے۔ان کی غزلیں فنی چابکدستی کا بہترین مظہر ہیں۔

ہم ایک منزل بے نام کے مسافر تھے
رسائی اپنی کہاں تیری رہگزر تک تھی
مقصود ہے گر خود سے ملاقات تو پھر کیوں
یہ دولت شب کردی چراغوں کے حوالے
گھر سے نکلے تو ہر اک سمت تھا چہروں کا ہجوم
ہم نے چاہا تھا کہ ہم خود کو اکیلا ڈھونڈیں

جدید غزل میں ریاست کا ایک معتبر نام فاروق مضطرؔ کا بھی ہے۔فاروق کی غزلوں میں انسانی درد و کرب اور بے چارگی کا پُر درد اظہار ملتا ہے۔ان کی غزلوں میں موضوع کے اعتبار سے تنوعت پائی جاتی ہے۔فاروق مضطر کی غزلوں میں عصر حاضر کے حالات و واقعات کا بے باکانہ اظہار ملتا ہے۔ان کا قلم کافی ذرخیز ہے۔مضطر نے اپنی فکر انگیز غزلوں سے ریاست کے جدید غزل گو شعراء میں خاص مقام حاصل

کیا ہے۔

گونج اُٹھیں گے درودیوار اپنے کرب سے
لفظ جو تشنہ ہے معنی آشنا ہوجائے گا
جانے اب کیوں رات دن گھر میں پڑا رہتا ہے وہ
پہلے یوں خود میں کبھی سمٹا ہوا رہتا نہ تھا

احمد شناسؔ کا نام بھی اسی عہد کے غزل گوشعراء میں شامل ہے۔وہ جدید ذہن کے مالک ہیں۔ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔احمد شناس اپنی بات علامتوں اور استعاروں میں بیان کرنے پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔اپنے خیالات کی خوبصورت ترسیل کے لئے انہوں نے بے شمار نئی تراکیب وضع کیں ہیں، جوان کی زبان دانی اور فکری وسعت پر دال ہیں۔

صبح وجوہوں کہ شب انتظار ہوں
میں آشکار ہوں کہ پسِ آشکار ہوں
پردیس کی راتوں میں بہت جاگ چکا ہوں
اب گھر کا سکوں اوڑھ کے سونے کے لئے ہوں

مرزا یٰسین بیگ ریاست کے ایک اور معتبر غزل گوشاعر ہیں۔ان کی غزلیں فنکارانہ چابکدستی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔یٰسین حسن وخوبصورتی کے پہلو بہ پہلو عصر حاضر کے گونا گوں مسائل کو اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔وہ شعری اظہار کے لئے نرم اور سبک لفظیات کو بروکار لاتے ہیں۔ان کی غزلیں موسیقیت سے پُر ہیں۔فرد کی تنہائی، لاچاری، بے بسی اور درد وکرب کو موصوف نے اپنی غزلوں میں پُر درد لہجے میں پیش کیا ہے۔''شاخ صنوبر تلے، دہر آشوب'' اور ''لہولکیر'' یٰسین کے شعری مجموعے ہیں۔

نئی زمین نیا آسماں ڈھونڈوں
جو مجھ پہ آگ اُگلے وہ کہکشاں ڈھونڈوں
زخم ہی زخم ہیں ویرانی ہی ویرانی ہے
اپنے اندر جو اترتا ہوں تو ڈر لگتا ہے .

تقسیم ہند کے بعد ریاست میں اردو غزل کا تیسرا دور ۱۹۸۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔یہ دور مابعد جدید دور کے آغاز اور جدیدیت کے عروج کا دور کہلاتا ہے۔ملک کے بڑے ادبی مراکز کی طرح ریاست کے غزل گوشعراء کے یہاں بھی جدیدیت کے ساتھ مابعد جدید عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔لیکن کشمیر کے شعراء نے اپنی ارضیت اور ثقافت کی پیش کش بھی نئے پیرائے میں کی ہے۔تہذیبی اقدار کی پامالی، رشتوں کی بے

وقعتی، بے چارگی اور بے مروتی جیسے موضوعات اس دور کے غزل گوشعراء میں خاص طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ برصغیر کے جدید اور مابعد جدید شعراء کے برخلاف یہاں کے غزل گوشعراء نے عصری حسیت اور مسائل کو برتنے میں کشمیریت کو بطور خاص ملحوظ نظر رکھا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''پاکستان اور ہندوستان کے بڑے ادبی مراکز کی اردو غزل میں جس مشینی زندگی، فرد کی تنہائی، ذات کی شکستگی، عدم تحفظ اور تشکیک کی باتیں عام تھیں۔ جموں کشمیر کی جدید غزل میں بھی ان کا اظہار ہوا ہے لیکن توازن و اعتدال کے ساتھ کیونکہ دلی اور ممبی، لاہور اور کراچی جیسی سماجی اور ثقافتی صورت حال جموں کشمیر میں نہ تو ۶۵۔۱۹۶۰ء کے آس پاس تھی اور نہ آج ہے۔ پھر بھی جموں کشمیر ذہن اور تخلیقی شعور تازہ ہوا کے جھونکے کو اپنا تا جھیلتا اور برتتا رہا ہے۔اس لئے جموں کشمیر کے غزل گوشعراء نے بھی جدیدیت کے رجحان کے تحت تازہ ترین موضوعات اور اسالیب اپنائے لیکن اپنے ثقافتی اقدار کو ذہن میں رکھتے ہوئے۔''[۱۲]

۱۹۸۰ء کے عشرے سے لیکر موجودہ دور تک جن شعراء نے ریاست جموں وکشمیر میں صنف غزل کو نئی بلندی عطا کرنے میں نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اُن میں فرید پربتی، شفق سوپوری، سید رضا، نذیر آزاد، بلراج بخشی، لیاقت جعفری، اشرف عادل، پرویز مانوس، خالد کرار، سلیم ساغر، شیخ گلزار وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

فرید پربتی ریاست کے ایسے غزل گوشاعر ہیں جنہوں نے قلیل مدت میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ان کی غزل میں روایت کی پاسداری اور جدیدیت کی رواداری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔فرید فکر واحساس کے شاعر ہیں۔ان کی غزلوں میں زندگی اور متعلقات زندگی کے کئی مسائل موضوع کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔علامت سازی اور پیکریت میں بھی فرید پربتی نے اپنی ذہنی فراست اور فنی پختگی کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔

سکوت مرگ نہ شورِ ثبات سے مجھکو
ملا رہا ہے کوئی میری ذات سے مجھکو
سہہ رہا ہوں دیر سے لاسمیت کا اک عذاب
کٹ گیا اپنوں سے خود کو آسماں کرتا ہوا

شفق سوپوری ہمارے عہد کے نمائندہ غزل گوشاعر ہیں۔ان کے یہاں تجربات کی رنگارنگی ملتی

ہے۔فرید کی طرح شفق عروض و آہنگ پر کامل دسترس رکھتے ہیں۔شفق سوپوری کی غزلوں میں لہجے کی متانت اور زبان و بیان کی ندرت انہیں اپنے معاصرین میں اہم مقام عطا کراتے ہیں۔موصوف موسیقی کی بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں موسیقیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔شفق کی غزل جدیدیت کی نمائندہ ہے۔شفق سوپوری کا نام نہ صرف ریاست بلکہ بیرون ریاست کے اہم اور صاحب فکر جدید غزل گو شعراء میں شمار ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے عہد کے مسائل کا بے ساختہ اظہار نرم اور مترنم الفاظ کے سہارے سے کیا ہے۔ؔ

پتہ ہے کس کو کب اپنا ہی خواب دیکھیں گے
ہم آئینے کی نظر سے سراب دیکھیں گے
وہ طاق پر جلے یا رہگزر میں روشن ہو
چراغ سے ہوا کی دشمنی پرانی ہے

شفق سوپوری کی غزل میں نئی لفظیات اور تراکیب کے ساتھ ساتھ معنی کی تہہ داری اور احساس کی گہرائی بھی حد درجہ موجود ہے، جو قاری کو فوراً متوجہ کرتی ہیں۔شفق سوپوری کا شاعرانہ انفراد ان کی فکری بلندی اور احساس کی تازگی میں مضمر ہے۔زبان و بیان، علم و آگہی، فکر و فن، معنی و مضمون، عروض و آہنگ، تخیل و احساس وغیرہ غرض ہر سطح اور ہر اعتبار سے شفق سوپوری ریاست کے کامیاب اور نمائندہ غزل گو شاعر ہیں۔

نذیر آزاد کا تعلق بھی اسی قبیل کے شعراء سے ہیں۔آزاد کی غزلوں میں جدید تخلیقی رویوں کا گہرا عمق نظر نواز ہوتا ہے۔ان کی غزل فنی چابکدستی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔آزاد کا شمار ریاست کے ماہرین علم عروض میں ہوتا ہے۔نذیر آزاد اپنی فکر کی تازہ کاری سے اردو غزل میں نئے نئے رنگ بھرتے ہیں۔زبان و بیان پر غیر معمولی دستگاہ رکھتے ہیں۔اردو میں ان کے دو شعری مجموعے ''نغمہ زنجیر پا'' اور ''سبوچہ'' منظر عام پر آچکے ہیں۔کشمیر میں جدید غزل کو نئی وسعتیں عطا کرنے میں نذیر آزاد کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ؔ

تھوڑی خلش ہے، ٹیس ذرا، لطف جا بہ جا
پوچھو ہمارے دل سے کہ یہ تیر ہے کہ تو
جس میں رہ جائیں سمٹ کر ترے دل کے افلاک
وہی پرواز ابھی تک میرے شہپر میں نہیں

بلراج بخشی کی غزل بھی مابعد جدید عناصر کی نمائندہ ہے۔بلراج کے یہاں عصری مسائل کے ساتھ ساتھ ذاتی واردات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ان کی غزلیں گہری معنویت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔بلراج اپنے جذبات کے

اظہار کے لئے مروجہ لفظیات کے علاوہ علامتوں اور استعاروں کا بھی بھرپور استعمال کرتے ہیں۔فکر وفن، احساس، ادارک اور لسانی وجمالیاتی اعتبار سے بلراج کی غزلیں قابل تعریف ہیں۔

کوئی سراغ نہ چہرے پہ چھوڑتا بلراج
خزانے درد کے دل میں چھپائے جاتے ہیں
بارود کے موسم نے کھلائے ہیں نئے گل
سُنتے ہیں کہ اب ڈل میں شکارا نہیں ہوتا

جموں وکشمیر میں مابعد جدید دور کے غزل گوشعراء میں سید رضا کا نام کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔موصوف بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔آپ زبان کے برتاو کا دلکش انداز رکھتے ہیں۔ان کی غزل میں فرد کی تنہائی، بے بسی اور عدم تحفظ کے علاوہ قدروں کی شکست وریخت اور انسانی رشتوں کی پامالی جیسے موضوعات مخصوص لب ولہجہ میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔علاوہ ازیں کشمیر کی تہذیب، ثقافت اور کلچر کی رنگا نگی کو بھی موصوف نے غزل میں سمیٹنے کی احسن کوشش کی ہے۔

زخم در زخم سماں تازہ کیا کرتے ہیں
گھول کر شوخی مقتل کو حنا میں ہم لوگ
میں جس سے کٹ کے جُدا ہوگیا تناور تھا
ہے اُس کے نام رقم سایۂ شجر کرنا

لیاقت جعفری عصری حسیت کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔انہوں نے بہت مختصر مدت میں اپنا شعری انفراد قائم کیا ہے۔لیاقت جعفری غزل میں اپنے ماحول کے پیچیدہ مسائل کو نئی علامتوں کے سہارے سمیٹتے ہیں۔موصوف نہ صرف ریاست بلکہ ملک گیر سطح پر اپنے انوکھے انداز شعر کی بدولت پہچانے جاتے ہیں۔ان کا لہجہ اپنا ہے۔وہ تجربات کو جدید شعری تقاضوں کے تحت پیش کرنے کا منفرد انداز رکھتے ہیں۔

جس کے مرجانے کا احساس بنا رہتا ہے
مجھ سے بڑھ کر کوئی بیمار ہے میرے اندر
آنکھ لگتے ہی کی آسیب آتے تھے نظر
میری ہر اک نیند میں اک سانحہ موجود تھا

شیخ گلزار کا انداز شعر جداگانہ ہے۔وہ اپنے تجربات اور احساسات کو شیریں وسبک الفاظ میں بیان کرنے کے روادار ہیں۔ان کے یہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔گلزار کی غزل میں انسان کے دردوکرب، تنہائی اور محرومی کا شدید احساس ہوتا ہے۔

بہت مشکل ہوا آدم کا جینا
چلی ہر سو یہ اب کیسی ہوا ہے
غم کی دنیا سے میں نہ تھا محروم
کاش تو بھی رُلا نہیں دیتا

اشرف عادل کا شمار نئے غزل گوشعراء میں ہوتا ہے۔ حسن وعشق کے نازک جذبات اور موجودہ دور کے گونا گوں سماجی مسائل عادل کی غزل کے اہم موضوعات ہیں۔ سادگی اورفکری تازگی اشرف عادل کی غزل کے نمایاں اوصاف ہیں۔

اک وفا ہم ڈھونڈتے پھرتے رہے
اک دغا بس خوب رو کرتے رہے
سورج کی غلامی میں تنویر مبارک ہو
آزاد فضاؤں کی زنجیر مبارک ہو

ریاست میں نئی غزل کا ایک اور اہم شاعر پرویز مانوس ہیں۔ان کی غزلیں زبان وبیان اور موضوع ومضمون کے اعتبار سے جدید فکر کی نمائندہ ہیں۔ عشق اور معاملات عشق کی متنوع کیفیات کا دلکش اظہار بھی مانوس کے یہاں دیکھنے کوملتا ہے۔انہیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کے برمحل استعمال پر بھی پوری دستگاہ حاصل ہے۔

روز سجتے ہیں جو منتظر جھیل کی آغوش میں
ہے کوئی پُر نور پیکر،جھیل کی آغوش میں
کتنے ہیں کم ظرف یہ شعلے،میرے گھر تک آپہنچے
بھول گئے کہ برسوں ہم نے ان کی خوب ستائش کی

سلیم ساغر بھی اس قبیل کے نوجوان غزل گوشاعر ہیں۔ان کی غزلوں میں نئے افکاراور تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ساغر کی غزلوں میں فنی محاسن کا خوبصورت انصرام نظر آتا ہے۔ان کا لب ولہجہ تازہ اور نیا ہے۔

ہر درد کیا اُس نے میرے نام سے منسوب
الفت میں مری ذات ہے الزام سے منسوب
عجب مزاج ہے ساغر ترا بھی کیا کیجیے؟
ابھی تھا شوخی کا پیکر ابھی اُداس لگے

شیخ خالد کرار جواں نسل کے نمائندہ غزل گوشاعر ہیں۔مختصر مدت میں خالد نے اپنا شعری وجود

قائم کرنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ان کی غزل جدید عصری مسائل اوران سے پیدا شدہ صورت حال کی عکاسی کرتی ہے۔خالد غزل کے فنی لوازمات کا گہراادراک رکھتے ہیں۔

عجب پہرے مرے افکار پر رکھے ہیں خالد
عجب کھٹکا مرے احساس سے باندھا ہوا ہے
جسم شل اور سفر تازہ ہے
روح بیتاب لئے چلتا ہوں

مذکورہ شعراء کے علاوہ ریاست میں اردو غزل کے گیسوسنوارنے والے کئی دوسرے شعراء بھی ہیں جواپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے ریاستی سطح پر اردو غزل کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کرنے میں پیش پیش ہیں۔ان کی فہرست بہت لمبی ہے یہاں پر چند اہم نام گنائے جاتے ہیں۔فاروق احمد فاروق، وحید مسافر، بشیر احمد بشیر، فاروق آفاق، علمدار عدم، محتشم احتشام، گلشن خطائی، ع۔ع عارف، غضنفر علی شہباز، سبط رضا، غلام نبی غافل، سجاد پونچھی، لیاقت نیر، اقبال صدیقی، اطہر بشیر، شاد سجاد وغیرہ کے اسم گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔یہ شعراء حضرات دور حاضر میں صنف غزل کو اپنے تجربات اور محسوسات کے اظہار کے لئے بروکار لاتے ہیں۔ان کے یہاں موجودہ دور کے ریاست کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال کی بھر پور پیش کش نظر آتی ہے۔مذکورہ شعراء کی تخلیقی صلاحیت اور فکری انفرادیت کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کا مستقبل امید افزااور روشن ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں صنف غزل میں جہاں مرد شعراء نے خوب آبیاری کی ہے وہیں خواتین شعراء نے بھی اس کے گیسوسنوارنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ملک کشمیر میں شاعرات کی تعداد اگر چہ کم ہے لیکن جو شاعرات منصۂ شہود پہ آچکی ہیں ان کے فکر وفن کی اہمیت مسلم ہے۔اس سلسلے کی پہلی کڑی زینب بی بی مجوب ہے۔ان کا ایک شعری مجموعہ ''گلبن نعت'' منظر عام پر آچکا ہے۔جس میں حمد، نعت، منقبت شامل ہیں۔موصوفہ نے غزلیں بھی کہیں ہیں۔ان کے بعد شہزادی کلثوم کا نام لیا جاتا ہے۔جو اُردو غزل کا اچھا مذاق رکھتی تھیں۔ان ایک شعر نقل کرتا ہوں۔

جب اہلِ دل کو عشق کا عرفان ہوگیا
حسنِ فریب کار پشیمان ہو گیا

شہزادی کلثوم کی فنی اور فکری بصیرتوں کے پیش نظر ان سے کافی امیدیں وابستہ کی جاسکتی تھیں، مگر افسوس کہ وہ عالم جوانی میں ہی وفات پا گئیں۔اس ضمن میں ایاز رسول نازکی لکھتے ہیں:

''کشمیر کے اردو شعری اُفق پر جو خواتین نہایت آن بان کے ساتھ روشن

ہوئیں ان میں ایک نام اپنی کم عمری میں ہی انتقال کرنے والی شہزادی کلثوم کا
بھی ہے۔" ۱۳؎

تقسیم ہند تک ریاست جموں وکشمیر میں جن شاعرات نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے ان میں سلمٰی فردوس، عائشہ مستورا، عابدہ احمد کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ریاست میں خواتین شاعرات کی اچھی خاصی تعداد ۱۹۶۰ء کے بعد ہی منظر عام پر آئی ہے۔ جنہوں نے اپنی تخلیقی بالیدگی اور فکری بلندی سے اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان میں رخسانہ جبین، ترنم ریاض، سیدہ نسرین نقاش، نصرت آرا چودھری، صاحبہ شہریار وغیرہ کے نام کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔

رخسانہ جبین کا نام ریاست جموں وکشمیر کی نمائندہ غزل گو شاعرات میں سرفہرست ہیں۔ گذشتہ تیس چالیس برس سے اردو شاعری کی خدمت میں منہمک ہیں۔ آپ کا کلام ملک کے نامور رسائل و جرائد میں ایک عرصہ سے شائع ہوتا رہا ہے۔ رخسانہ جبین کے یہاں روایت کی پاسداری بھی ملتی اور جدیدیت کی رواداری بھی۔ ان کا غزل کہنے کا انداز مختلف اور منفرد ہے۔ اشعار دیکھئے۔

کھلی جو آنکھ تباہی کا خوف ختم ہوا
لرزتے ٹوٹتے گھر بھلا دیئے میں نے
گھٹن سی سانوں میں جن کے طفیل ہوتی تھی
وہ سارے خوف، وہ ڈر سب بھلا دینے میں
بدلتی رُت کے تقاضوں سے تُو پریشاں ہے
میں مطمئن ہوں، خدا نے مزاج سادہ دیا

رخسانہ جبین کی غزلیں زبان وبیان، اظہار واسلوب اور معنی ومفہوم کی بدولت انہیں اپنے معاصرین میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔ قدوس جاوید رخسانہ جبین کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کشمیر کی غزل گو شاعرات میں سب سے زیادہ فعال رخسانہ جبین ہیں۔ شعر گوئی کا ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد رخسانہ جبین کا شمار آج ہندوستان کی نمائندہ شاعرات میں ہوتا ہے۔ رخسانہ جبین کی غزلوں میں خود آگہی اور زمانہ شناسی کا اظہار روایتی اور کئی دیگر معروف شاعرات سے الگ انداز میں ہوا ہے۔" ۱۴؎

ریاست کی ایک اور اہم شاعرہ ترنم ریاض ہیں۔ جو کہ محتاج تعارف نہیں ہیں۔ آپ کثیر الجہت

شخصیت کی مالکہ ہیں۔آپ شاعری، افسانہ، ناول، تنقید، ترجمہ، صحافت غرض ہرفن مولا ہیں۔شاعری میں غزل اور نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بناتی ہیں۔غزل کی فنی باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ہم عصر غزل کے مروجہ موضوعات کے علاوہ ترنم ریاض اپنی ذات کا انکشاف بھی شعری پیرائے میں پیش کرنے کی روا دار ہیں۔لب ولہجہ میں نرماہٹ اور مخصوص نسائی آہنگ ترنم ریاض کی غزلوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔''پرانی کتابوں کی خوشبو'' کے نام سے ترنم کا شعری مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔

وہ میری فکر کے روزن پر کیل چڑاتا ہے
میں آگہی کے تجسس کو خون روتی ہوں
ہر مرحلہ شوق نہیں اس قدر آساں
دیوانگیِ دل کے ہیں آثار نمایاں

نصرت چودھری ایک مخصوص تخلیقی وجدان رکھتی ہیں۔ان کی غزلیں نسائی لب ولہجہ اور اظہار و ادائیگی کا بہترین نمونہ ہیں۔نصرت کی غزلوں میں حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کی عورت کے گونا گوں مسائل کا پر درد اظہار ملتا ہے۔نصرت چودھری کا ایک شعری مجموعہ ''ہتھیلی پر چاند'' منصہ شہود پر آچکا ہے۔اپنے واردات قلبی کو نصرت فنی مہارت کے ساتھ کچھ اس انداز سے شعری پیکر عطا کرتی ہیں۔

فریاد کیا کروں کہ زمانے سے تنگ ہوں
جو خود سے لڑ رہی ہوں میں اک ایسی جنگ ہوں
میں شمع انتظار فروزاں کیے رہی
چاہت کا اُس طرف سے اشارا نہ ہوسکا
جو بھی چہرے ہیں خون سے تر ہیں
ہر طرف غم زدہ سے پیکر ہیں

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نصرت چودھری کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نصرت چودھری کی شاعری میں جمالیات، رومانیت اور نئی حسیت کے پرتو دکھائی دیتے ہیں۔ان کے نسائی لب ولہجہ اور واردات قلبی کے اظہار سے ایک مظلوم اور بے بس عورت کی داستان ترتیب پاتی ہے۔'' ۱۵

سیدہ نسرین نقاش ریاست کی غزل گو شاعرات میں ایک الگ پہچان رکھتی ہیں۔ان کی غزلیں ان کے واردات قلبی کی ہر درد کی داستان بیان کر رہی ہیں۔نسرین نقاش کا مطالعہ گہرا ہے۔ان کی غزلوں

میں ایسی عورت کی روداد ملتی ہے جو مرد اس معاشرے میں اپنی شناخت اور وجود کے تشخص کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔نسرین نقاش کا لب ولہجہ بھی منفرد اور جداگانہ ہے۔''دشت تنہائی'' اور'' روحیں جناب کی'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔

یہ فرمان ہے اہل فکر وہنر کا
محبت کی دولت ہوس میں نہیں ہے
پہنے خوشی کے ہار سبھی نے مگر مجھے
غم بھی نہ راس آیا، یہ میرا نصیب تھا
نسرین اس کی یاد سے روشن ہے کائنات
ہر لمحہ مری جاں سے جو یکسر قریب تھا

صاحبہ شہریار کو شاعری وراثت میں ملی ہے۔ان کے والد مہندر رینہ ریاست کے کہنہ مشق شاعر گزرے ہیں۔صاحبہ شہریار غزل کی شاعرہ ہیں۔ان کی غزل انسانی دردمندی اور سوز وگداز کی خوبصورت عکاس ہیں۔آج کے دور کی عورت کیا سوچتی ہے، کیا برداشت کرتی ہے اور کیا محسوس کرتی ہے، اس کا برملا اور بے ساختہ اظہار صاحبہ شہریار نے اپنے مخصوص نسائی لب ولہجے میں کیا ہے۔صاحبہ شہریار کی غزلوں میں عصری حسیت اور خود آگہی کے ساتھ ساتھ نغمگی، اثر آفرینی اور خلوص نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔''شاخ لرزاں'' اور ''برگ چنار'' صاحبہ شہریار کے شعری مجموعے ہیں۔

تجھ کو سوچوں تو میں اک پیار کا دریا دیکھوں
جس طرف دیکھوں ترا جلوہ ہی دیکھوں
کون تھا اپنا یہاں مجھ کو جو دیتا حوصلہ
اپنے غم کا بوجھ تنہا خود ہی میں ڈھوتی رہی

جموں وکشمیر میں ان مستورات کے علاوہ نگہت فاروق نظر، پروین راجہ، روحی جان، شفیقہ پروین، درخشاں اندرابی، مدثرہ لالی، روبینہ میر، نرگس ستارہ، نگہت صاحبہ وغیرہ کے نام ایسے ہیں جو موجودہ دور میں ریاست میں اردو غزل کو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے بروکار لاتی ہیں۔ان میں سے اکثر کے شعری مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔اور یہ شاعرات اپنے تجربات اور مشاہدات، محسوسات اور تخیلات سے ریاستی سطح پر اردو غزل کو متنوع رنگوں سے رنگنے میں مصروف ہیں۔

شب گئے خود سے کیا کرتے ہیں اکثر یہ سوال
غم زدہ رہتے ہیں کیوں ہم راحتوں کے باوجود

بیتی یادوں کے چراغوں کو لئے ہاتھوں میں
دشت دردشت بھٹکتی ہوں سحر ہونے تک

(نکہت فارق نظر)

غضب کی خامشی ہے وادیوں میں
نشیمن میں ہیں بے ساماں پرندے
یہ ڈھونڈتے ہوکسے تم لہو کی جھیلوں میں
پکار تے ہیں تمہیں دیکھ چشم تر کیسے

(پروین راجہ)

کس قدر دشوار ہے ان اجنبی شہروں میں رہنا
گھر کی چوکھٹ ڈھونڈنے میں ہجرتوں کے درد سہنا
لب پہ توحید تو دل میں لئے بُت خانہ پھروں
سب کے ہمراہ چلوں ،سب سے جُداگانہ چلوں

(درخشاں اندرابی)

سانس لیتے ہیں ہم کیسے ماحول میں
جو بھی ہے منظر وہ کربلا سا لگے
زمانے پہ گری نظر کرتے کرتے
بہت تھک چکی ہوں سفر کرتے کرتے

(روبینہ میر)

تیری خوشبو سے وحی کوئی اتاری ہو تی
ہم نے ہر رات عبادت میں گزاری ہوتی
ہم سے یوں لوگ پیار کرتے ہیں
پالتے ہیں شکار کرتے ہیں

(نگہت صاحبہ)

ریاست جموں وکشمیر میں اردوغزل کے اس ارتقائی سفر کے تجزیے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں جب سے اردوزبان نے قدم جمانے شروع کیے ہیں اس وقت سے لیکر موجودہ دور تک مسلسل مختلف ادوار میں سینکڑوں شعراء منظرعام پرآتے رہے ہیں۔جنھوں نے ہرعہد میں صنف غزل

میں اپنے جذبات اور محسوسات کو شعری جامہ پہنایا ہے۔ ملک کے دیگر اہم ادبی مراکز کی طرح کشمیر میں بھی غزل کے روایتی موضوعات، ترقی پسند خیالات، جدید اور مابعد جدید تصور کی پیش کش یہاں کے شعراء نے کی ہے، اور یہ سلسلہ آج بھی بدوستور جاری ہے۔ مذکورہ شعراء کے علاوہ سینکڑوں شعراء آج ریاست میں اردو کو وسیلہ اظہار بنا کر اسے نئی بلندیوں سے ہم کنار کرنے میں منہمک ہیں۔ جو کہ ریاست میں اردو غزل کے لئے فعال نیک خیال کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔(ڈاکٹر عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل، ص:۶)
۲۔(مشمولہ ماہنامہ ''شیرازہ'' سرینگر، جلد ۵۲، شمارہ ۷۔۶، ص: ۵۷۔۵۸)
۳۔(مشمولہ ماہنامہ، شیرازہ، سرینگر جموں و کشمیر میں اردو شاعری نمبر، ص: ۶۰)
۴۔(پروفیسر عبدالقادر سرور، کشمیر میں اردو، حصّہ دوم، ص: ۳۸۵)
۵۔(جموں و کشمیر میں اردو غزل ۱۹۴۷ کے بعد، مشمولہ شیرازہ، ص: ۱۷۳)
۶۔(مشمولہ سہ ماہی، سرسبز، دھرمشالہ، جلد سوم، شمارہ ۲۰، ص: ۴۰)
۷۔(عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، حصّہ سوم، ص: ۱۷)
۸۔(پریمی رومانی، اظہار، ص: ۴۳)
۹۔(ماہنامہ شیرازہ، سرینگر، حکیم منظور نمبر، ص: ۱۹۱)
۱۰۔(مشمولہ، جہات، شفق سوپوری، ص: ۳۶)
۱۱۔(شمس الرحمن فاروقی، رفیق راز، انہار، فلیپ سے)
۱۲۔(مشمولہ سہ ماہی، سرسبز، جموں و کشمیر میں غزل نمبر، ص: ۴۵)
۱۳۔(مشمولہ، شیرازہ، جموں و کشمیر میں اردو شاعری نمبر، ص، ۸۴)
۱۴۔(مشمولہ، سہ ماہی، سرسبز، دھرم شالہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴، جلد سوم، شمارہ ۲، ص؛ ۵۲)
۱۵۔(مشمولہ، شیرازہ، جموں و کشمیر میں اردو شاعری نمبر، ص: ۲۰۲)

☆☆☆☆☆☆☆

باب سوم

جموں و کشمیر کے نمائندہ غزل گو شعراء ۱۹۴۷ء کے بعد

(ا) صوبہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے شعراء

شاعر ہماری سوسائٹی کا ایک حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ دیگر لوگوں کے مقابلے میں اپنی ذات اور وجود کے علاوہ اپنے اطراف واکناف کی ہر چیز کو ایک مخصوص نظر سے دیکھتا ہے۔ غور وفکر کرتا ہے اور جو کچھ محسوس اور مشاہدہ کرتا ہے اس کا اظہار شاعری کے پیرائے میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری دنیا کے ہر ملک اور علاقے میں پسند کی جاتی ہے۔ شاعری میں دلکشی اور دلفریبی کے عناصر بہ درجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ شعراء حضرات نے شاعری کے ذریعے حیات وکائنات کے بے شمار راز کھولے ہیں۔ غزل اُردو شاعری کی وہ صنف سخن ہے جو اپنی ہردلعزیزی کی وجہ سے ہر دور میں پسند کی گئی ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں غزل واحد ایسی صنف سخن ہے جو ہر عہد میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ رہی ہے۔ اگرچہ اس پر مختلف ادوار میں طرح طرح کے حملے بھی کئے گئے لیکن یہ صنف ہر مشکل دور سے گزرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ ابتداء سے تاحال غزل نے مختلف نشیب وفراز دیکھے ہیں اور ہر دور میں اس نے اپنی سحر انگیزی سے قارین ادب کی ایک کثیر تعداد کے دلوں کو لبھایا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ آج بھی بہت سے لوگ شاعری سے مراد غزل ہی لیتے ہیں۔

اُردو دنیا کی بے شمار زبانوں میں ایک اہم زبان ہے۔ جس کے پڑھنے لکھنے اور بولنے والے دنیا کے مختلف مما لک میں آباد ہیں۔ وادیٔ کشمیر دنیا بھر میں اپنی قدرتی خوبصورتی کی بدولت مشہور ہے۔ یہاں کے باشندے مختلف زبانیں بولتے ہیں جن میں اردو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں اردو کے شیدائیوں اور عقیدت مندوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ جب سے کشمیر میں اردو شاعری کا آغاز ہوا ہے اس وقت سے لیکر دورِ حاضر تک متعدد شعراء نے ریاست کے علاوہ ملکی سطح پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ کشمیر میں اردو شاعری خاص طور پر اُردو غزل کی آبیاری کے لئے جن شعراء نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اس سلسلے کی ابتداء مرزا کمال الدین اندرابی رسوا کی فارسی آمیز غزلوں سے ہوئی ہے۔ ان کے دور کے دیگر شعراء میں مرزا عبدالغنی بیگ قبولؔ، مرزا محمد جان بیگ سامیؔ، خواجہ امین الدین امینؔ، خواجہ احسن اللہ خان بیانؔ، محمد علی حشمتؔ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مذکورہ شعراء کا کلام فارسیت سے مملو ہے۔ کشمیر میں اُردو غزل کی باقاعدہ شروعات انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔ اس حوالے سے جن شعراء نے یہاں صنف غزل کے گیسو سنوارے ہیں اُن میں غلام احمد مہجور خاص طور پر قابلِ ہیں۔ ان سے ہی وادی میں اُردو غزل کے ایک نئے موڑ کا آغاز ہوتا ہے۔ موصوف کے بعد ۱۹۴۷ء تک آتے آتے کشمیر میں اُردو غزل میں طبع آزمائی کرنے والے شعراء کی اچھی خاصی تعداد منظر عام پر آئی، جن کی شہرت نہ صرف ریاست بلکہ ملکی سطح تک پھیل گئی۔ ان شعراء

میں طالب کاشمیری، میر غلام رسول نازکی، شہ زور کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدؔا، غ۔م طاؔوس، تنہا انصاری، شوریدہ کاشمیری وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کشمیر میں اُردو غزل کا اہم دور ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ آزادی ہند کے بعد کشمیر میں اُردو غزل کے حوالے سے جن شعراء نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے ان میں حامدی کاشمیری، ہمدم کاشمیری، حکیم منظور، فاروق نازکی، سلطان الحق شہیدی، مظفر ایرج، رفیق راز، شبیب رضوی، ایاز رسول نازکی، اقبال فہیم، خالد بشیر احمد، رخسانہ جبیں، شفق سوپوری، نذیر آزاد، فرید پربتی، سید رضا، شجاع سلطان وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مذکورہ ناموں میں ۱۹۴۷ء کے بعد جن شعراء نے وادی میں اُردو غزل کی نمائندگی کی ہے، ان کے مختصر حالات زندگی اور کلام کا تفصیلی جائزہ آگے آنے والے صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔

حامدی کاشمیری

کشمیر کے گلستان شعر وادب میں حامدی کاشمیری ایک معروف اور معتبر نام ہے۔ حامدی ریاست کے سربر آوردہ شعراء میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ موصوف نے اُردو نثر ونظم کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف کو برتنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، تنقید، تحقیق، صحافت، غزل، نظم، حمد، نعت، سلام وغیرہ غرض ہر شعبہ میں حامدی نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ حامدی کاشمیری کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہر فن مولا ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

حبیب اللہ بھٹ المعروف حامدی کاشمیری ۲۹ جنوری ۱۹۳۲ء کو سرینگر کے محلّہ بہوری کدل میں ایک آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ آپ کے والد کا نام خواجہ محمد صدیق تھا جو بڑے ہی نیک دل، خوش اخلاق، عبادت گزار اور کم گو انسان تھے۔ موصوف اپنی مقامی مسجد کے متولی اور موذن بھی تھے۔ حامدی کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی خورشیدہ بیگم تھا۔ وہ بھی نہایت ہی شریف، ملنسار، معاملہ فہم، خوش فکر، خوش گلو اور بڑی نیک بخت خاتون تھیں۔ اپنے والدین کے علاوہ حامدی کاشمیری کی پرورش میں ان کے چچا جان خواجہ غلام نبی بھٹ نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ حامدی مشترکہ خاندان میں ہر کسی کے لاڈلے اور آنکھ کا تارا تھے۔ حامدی کو ان کے چچا نے ہی باقاعدہ تعلیم کے لئے بہوری کدل کے پرائمری اسکول میں داخل کرایا ہے۔ جہاں سے ان کی تدریسی زندگی کی شروعات ہوئی ہے۔ یہاں سے حامدی نے پانچویں کا امتحان پاس کیا۔ سرپرتاب مڈل اسکول شمس واری سے آٹھویں کا امتحان ۱۹۴۳ء میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان سٹیٹ ہائی اسکول باغ دلاور خان سے ۱۹۴۷ء میں پاس کیا۔ تعلیمی سفر کو بدستور

جاری رکھتے ہوئے حامدی کاشمیری نے ایس۔ پی کالج سرینگر میں داخلہ لیا۔ جہاں سے موصوف نے انٹر میڈیٹ ۱۹۵۰ء اور بی۔ اے ۱۹۵۲ء کے امتحانات اچھے نمبرات سے پاس کیئے۔ اس کے بعد حامدی نے پہلے انگریزی میں ایم۔ اے کیا اور بعد ازاں اُردو میں بھی پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کیا۔ حامدی نے اپنی تعلیمی پیاس کو بجھانے کے لئے اعلیٰ سند (پی۔ ایچ۔ ڈی) کشمیر یونیورسٹی سے ۱۹۶۶ء میں حاصل کی ہے۔

حامدی نے اپنی معاشی زندگی کا آغاز ایس۔ پی کالج میں ۱۹۵۴ء میں بحیثیت انگریزی لیکچرر سے کیا۔ چار پانچ سال یہاں اپنے فرائض انجام دینے کے بعد حامدی کاشمیری کا تقرر کلچرل اکیڈمی کشمیر کے اسسٹنٹ سیکریٹری کے طور پر ہوا۔ اکیڈمی کا دفتری ماحول اور کام وکاج حامدی کو راس نہیں آیا۔ کیونکہ وہ تعلیم و تعلم سے زیادہ رغبت رکھتے تھے۔ اسی دوران ان کا تقرر کشمیر یونیورسٹی سرینگر کے شعبہ اُردو میں بحیثیت لکچرر کے ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ اس کے بعد حامدی کاشمیری اسی شعبہ میں مصروف عمل رہ کر ترقی کے مختلف زینے طے کرتے رہے اور بالا آخر صدر شعبہ اُردو کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ علاوہ ازیں حامدی کاشمیری دین فیکلٹی آف آرٹس اور وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کے اعلیٰ اور معزز ترین عہدے پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ شیخ العالم چیئر کشمیر یونیورسٹی کے پہلے چیئر مین ہونے کا اعزاز بھی حامدی کو حاصل ہے۔

اُردو ادب میں نمایاں کارنامے انجام دینے کے عوض حامدی کاشمیری کو وقتاً فوقتاً انعام واکرام سے بھی نوازا گیا ہے۔ اس سلسلے کا آغاز ''عروس تمنا'' کو دیئے گئے کلچرل اکیڈمی کے انعام سے ہو گیا تھا۔ جن دوسرے اداروں سے حامدی کو اعزاز سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ان میں اتر پردیش اُردو اکیڈمی، بہار اُردو اکیڈمی، بنگال اُردو اکیڈمی اور ساہتہ اکیڈمی قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں حامدی کاشمیری کو ۲۰۰۶ء میں غالب ایوارڈ اور ۲۰۱۰ء میں پدم شری انعام سے نوازا گیا ہے۔

حامدی کاشمیری اُردو دنیا میں ایک معتبر شاعر، منفرد افسانہ نگار، معقول ناول اور ڈرامہ نگار کے علاوہ ایک نظریہ ساز نقاد کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ انہوں نے جس صنف کو بھی چھوا ہے اس کو کندن بنا لیا ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ لیکن اس موضوع کے پیش نظر ہم موصوف کو نہ نقاد کی حیثیت سے، نہ فکشن نگار کے بہ طور اور نہ ڈرامہ نویس کی نظر سے زیر بحث لائیں گے بلکہ ہم ان کی غزل گوئی کے اہم اور امتیازی پہلوؤں پر گفتگو کریں گے۔

حامدی کاشمیری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نعت گوئی سے کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ حامدی کے والد محترم مسجد کے موذن اور متولی تھے۔ وہ اپنے نور چشم، حامدی کو بھی روزانہ مسجد لے جایا کرتے تھے۔ وہاں نماز کے علاوہ ذکر واذکار، قران خوانی اور نعتیں بلند آواز میں پڑھی جاتی تھیں۔

حامدی بھی اس عمل میں برابر والد کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں حامدی کاشمیری کے والد بزرگوں اور صوفی سنتوں کی خدمت بھی خوب کرتے تھے اور آئے دن کسی نہ کسی بزرگ کو اپنے گھر مدعو کر کے ذکر واذکار اور صوفیانہ موسیقی کی محفلوں کا انعقاد کرتے رہتے تھے۔ ایسے ماحول میں حامدی کاشمیری کی ذہنی اور فکری نشونما ہونے لگی اور وہ بھی شعر گوئی کی جانب توجہ کرنے لگے۔ جس کی ابتدا انہوں نے نعت گوئی سے کی۔ ان کی لکھی ہوئی نعتیں بھی بعد میں ان کی مقامی مسجد میں پڑھی جاتی تھیں۔ اس حوالے سے مصرہ مریم لکھتی ہیں:

> ''حامدی ایک پیدائشی شاعر ہیں۔ انہوں نے چودہ سال کی عمر میں نعتیں لکھیں حالانکہ خاندان میں شعروشاعری کی کوئی بھی رویت موجود نہ تھی۔۔۔ حامدی کے والد صاحب خواجہ محمد صدیق بھٹ صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ وہ درویش صفت اور متوکل تھے تاہم مجذوبوں اور فقیروں کی صحبت میں رہنے کے باوجود وہ شرعی احکام کی پابندی کرتے تھے اور نماز پنجگانہ کے عادی تھے۔ کوئی بھی موسم ہو یہاں تک کہ سخت برفباری میں بھی وہ صبح سویرے حامدی کو اپنے ساتھ لے کر گاڑیار مسجد زینہ کدل میں بلا ناغہ نماز فجر ادا کرتے تھے۔ آئے دن وہ کسی بھی مجذوب یا قلندر کو گھر لاتے اور موسیقی کی محفلیں جماتے۔ حامدی ان محفلوں سے بہت متاثر اور مرغوب ہوتے تھے۔۔ انہوں نے ابتداً کشمیری زبان میں نعتیں لکھی جو مسجد کے امام مرحوم مبارک شاہ صاحب دیگر شعراء کی نعتوں کے ساتھ مسجد میں پڑھتے تھے۔[1]

کم عمری میں ہی شعر گوئی کی طرف رغبت نے حامدی کاشمیری کو مطالعے کا عادی بنا دیا۔ وہ اسکول کی لائبریری میں رسائل و جرائد کا بغور مطالعہ کرتے تھے۔ اور ان میں چھپی غزلوں اور نظموں سے ان کو بھی تحریک ملی اور وہ بھی آہستہ آہستہ اپنے جذبات اور احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنانے لگے۔ اس طرح اپنے شوق کو تقویت دیتے رہے۔ کالج میں شعروشاعری کا ایک اچھا خاصا ماحول حامدی کو میسر آیا۔ یہاں ان کی شعری کاوشوں کو اور زیادہ جلا ملی اور اس طرح حامدی کاشمیری باقاعدہ شاعری کے سفر پر گامزن ہونے لگے۔ حامدی نے اُردو ادب کی جملہ اصناف سخن میں نظم اور غزل کو بطور خاص اپنے جذبات کی ترسیل کا وسیلہ بنا دیا ہے۔ دونوں اصناف سخن کو برتنے میں موصوف کامل دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے اب تک چھ شعری مجموعہ شائع ہو کر داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ''عروس تمنا'' حامدی کاشمیری کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس کے بعد ''نایافت'' ۱۹۷۶ء ''لاحرف'' ۱۹۸۴ء ''شاخ زعفران''

۱۹۹۱ء ''وادیِ امکان''۱۹۹۹ء ''خواب رواں'' اور ''یک شہر گماں'' یکے بعد دیگرے شائع ہوئے ہیں۔

حامدی کاشمیری کی یہ شعری کائنات اُردو ادب میں ایک نادر سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔انہوں نے ابتدا سے لیکر تا حال شعری گلستان میں منفرد گلکاری کی ہیں۔اگر چہ حامدی کاشمیری نے فکشن اور تنقید میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن شاعری ان کا پہلا پیار رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اپنے تخلیقی سفر میں آگے بڑھ کر موصوف نے فکشن کی جانب توجہ کم کردی اور شاعری ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا دیا ہے۔اس بات کا اعتراف اپنے ایک مضمون ''میرا تخلیقی سفر'' میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''۱۹۶۰ء کے بعد میری تخلیقی سرگرمیوں میں ایک اہم موڑ یہ آیا کہ میں فکشن سے قطعی طور پر دست بردار ہوگیا اور ہمہ وقت شاعری کا ہو کے رہ گیا'' ۲

آگے اس کے وجوہات بھی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس تبدیلی کے چند اسباب ہیں اوّل خارج سے لاتعلق ہو کر باطن دوستی کے نتیجے میں منصوبہ بند موضوعات سے کنارہ کش ہوگیا اور افسانہ نگاری کے لئے بے معروف ہوگیا۔دوسرے اپنے باطنی سفر میں جن نازک، بے چہرہ، متضاد اور گریزاں تجربوں سے متصادم ہوا ان کی لسانی تجسیم کے لئے شعر کی خودمرتکز علامتی اور کفایتی صنف موزوں بلکہ ناگزیز تھی' تیسرے لاشعوری محرکات کے ادراک نے فکشن کے بجائے شعر سے نسبتِ ذہنی کو استحکام عطا کیا'' ۳

حامدی کاشمیری کے ابتدائی کلام میں روایتی شاعری کے اثرات صاف طور پر نظر آئے ہیں۔''عروس تمنا'' میں شامل غزلوں میں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ الفاظ کے برتاؤ اور انداز بیان میں بھی روایت کی کسی حد تک تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

وہ بھی دن تھے غیر تھے اپنے
آج اپنوں کا بھی اعتبار نہیں

جہاں کا رنگ تو بدلا ہے حامدیؔ لیکن
ہوا زمانے کی ناسازگار آج بھی ہے

خرام ناز سے سیکھی ہیں تیرے
سبک رفتاریاں باد سحر نے

ماہ انجم ہیں آسماں پر رواں

جیسے انوار کے سفینے ہیں

روایت کی پاسداری اور روایتی موضوعات اور لفظیات کی تقلید جو کہ حامدی کاشمیری کے پہلے دور کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے بارے میں محترمہ مصرہ مریم رقمطراز ہیں:

''حامدی کی اس دور کی شاعری کو مجموعی طور پر روایت کے تسلسل کی شاعری قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور سماجی زندگی کی حقیقتوں سے گزرتے ہوئے اپنے تاثرات کو روایتی انداز میں نظم کرتے ہیں۔ موضوعات کے انتخاب اور لفظوں کے برتاؤ میں بھی وہ اپنی اپچ کو بھرپور انداز میں کام میں لانے کے بجائے روایت پر انحصار کرتے ہیں۔''[۲۴]

حامدی کے پہلے دور کی غزلوں میں ترقی پسند رجحان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ ملک کے دیگر علاقوں کی طرح ریاست میں بھی کئی ادیب اور شعراء ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ جن میں پریم ناتھ پردیسی، قیصر قلندر، اختر محی الدین، علی محمد لون، بنسی نردوش، رحمان راہی، مہندر رینہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ فن کار ریاستی عوام کی مفلسی، تحقیر وذلت، ناداری، ظلم و زبردستی، جہالت اور غلامی کو موضوع بنا کر اپنی نگارشات میں پیش کرتے تھے۔ انہی ادباء اور شعراء کی صحبت میں حامدی بھی اپنی شاعری کے ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ فن کار اپنے سماج کا اہم حصّہ ہوتا ہے اور وہ اپنے گردوپیش کے ماحول سے کسی بھی حال میں بے گانہ نہیں ہوسکتا ہے۔ اسی ماحول کے اثرات کی وجہ سے حامدی کی ابتدائی غزلوں میں ترقی پسند عناصر در آئے ہیں ذیل میں حامدی کے چند اشعار سے ان کی سماجی آگہی اور ترقی پسند اثرات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ دار و رسن، مفلسی، آزادی، غضب خون جگر، محفل عشرت، غلامی، لذت آزادی وغیرہ جیسے الفاظ اور تراکیب کو موصوف نے منفرد انداز میں برتا ہے۔

تمہارے شہر کے عشرت کدے ہیں خوب مگر
یہاں بھی کیوں ہمیں دار و رسن کی یاد آئی

غضب ہے کبر بہاراں سے ہیں وہیں محروم
چمن کو خونِ جگر سے جو رنگار کرتے ہیں

سمجھ لیا میں نے مفہوم دور آزادی
یہی کہ حالت مفلس ہوئی خراب بہت

وہ کیا سمجھے گا آزادی کی لذت
غلامی میں جو اپنے دن گزارے

عشق حامدی کے کلام میں ایک اہم موضوع کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ خاص طور پر ان کے پہلے شعری مجموعے ''عروس تمنا'' کی غزلوں میں عشقیہ عناصر پر مشتمل متعدد اشعار دیکھے جاسکتے ہیں ۔ یہ دراصل ان کے عالم شباب کا کلام ہے۔ جب حامدی عشق کے گوناگوں پہلوؤں کو سمجھنے میں مصروف تھے۔ عشق ایک ایسا جذبہ ہے جس سے شاید ہی کوئی دل خالی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عشق اُردو غزل کا ایک اہم اور بنیادی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ شعراء کے تصورات اور مشاہدات کی توجہ کا خاص مرکز بھی رہا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی غزل میں عشق کے موضوع کی مرکزیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''غزل کا سب سے اہم موضوع عشق ہے۔ غزل کے ہر دور میں عشق اور اس کی مختلف کیفیات کی ترجمانی کا سلسلہ ملتا ہے۔ اس موضوع سے متعلق کم و بیش ایک ہی طرح کے خیالات مختلف شعراء پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت کی جھلک اس موضوع کی ترجمانی میں صاف نظر آتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے محبوب کے حسن کا تذکرہ کیا ہے۔ عاشق کی کیفیات بیان کی ہے۔ عاشق و معشوق کے تعلقات کو واضح کیا ہے۔ معاملات عشق پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ان سب میں اس شاعر کی ذہنی کیفیت، اس کی افتادِ طبع، اس کا اپنا ذہنی رجحان، اس کا مخصوص سماجی پس منظر، اس کی مخصوص تہذیبی روایت اثر انداز ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔'' [5]

حامدی بھی اپنے مخصوص انداز میں سماجی اور تہذیبی پسِ منظر کے تحت اپنے جذباتِ عشق کو غزل کا جامہ پہناتے ہیں۔ ''عروس تمنا'' کی غزلوں میں حامدی کے اس جذبے کو بڑی حد تک محسوس کیا جاسکتا ہے۔ عشق ان کی شاعری اور شخصیت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ان کی غزلوں میں محبوب کا جو تصور اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ خیالی وجود نہیں بلکہ ایک زندہ اور جیتا جاگتا انسان ہے۔ جس کا تعلق خیالستان سے نہیں بلکہ اسی سرزمین سے ہے۔ حامدی اپنے محبوب کے عشق میں اس قدر گرفتار نظر آتے ہیں کہ ان کا محبوب ایک مثالی روپ اختیار کر لیتا ہے۔ حامدی اپنے محبوب کی خوبصورتی، دلکشی، رنگینی و رعنائی وغیرہ کی تعریفیں اپنے مخصوص انداز اور اسلوب میں کچھ اس طرح کرتے ہیں۔ ؎

جب سے تیرے عارض رنگین پہ ٹھہری ہے نظر
کتنی گلپوش بہاروں کا خیال آتا ہے

ترے عارض نے دیا ہے مرے گیتوں کو جمال
تری زلفوں نے بُنا ہے مرے خوابوں کا فسوں

تیرے خیال کی رعنائی و نزاکت نے
کسی کا جذبۂ احساس وفن نکھارا ہے
کچھ اور اپنے تبسم کے پھول بکھرا دو
سنور رہے ہیں مری آرزو کے ویرانے
تری نگاہ کے اُٹھنے کی دیر ہے بس
تو میری روح کی خلوت میں آسمائی تھی

حامدی اپنے محبوب کے مختلف جمالیاتی پہلوؤں کونرم و نازک لفظیات کے سہارے بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔انھیں اپنے محبوب کے سرخ عارض دیکھ کرخوبصورت بہاروں کا خیال آتا ہے۔اسی طرح محبوب کی ریشمی زلفیں انہیں خوابوں کا افسانہ بنتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔معشوق کی رعنائی و نزاکت کا خیال حامدی کے جذبۂ فن کونکھارتا ہے۔اوراس کے مسکرانے سے حامدی کی آرزو کے ویرانے سنور جاتے ہیں۔غرض حامدی کاشمیری اپنے محبوب کے ہرعشوے اور ہرادا سے عشق کرتے ہیں۔بقول مصرہ مریم:

> ''حامدی کی شخصیت کی پہچان ان کا جذبۂ عشق ہے۔جذبۂ عشق ان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔وہ انسانی رشتوں سے عشق کرتے ہیں، وہ انسان سے عشق کرتے ہیں، حسن سے عشق کرتے ہیں، خوبصورت چیزون سے عشق کرتے ہیں اور حسین خوابوں اور خیالوں سے عشق کرتے ہیں۔۔۔حامدی کی شاعری میں محبوبہ ایک زندہ شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کی پروردہ ہے، اس نے کشمیری تہذیب اوراقدار کی فضا میں آنکھ کھولی ہے، وہ کشمیرکی حسین وادیوں میں پروان چڑھی ہے''۔[٦]

''نایافت'' جوحامدی کاشمیری کادوسراشعری مجموعہ ہے کے منظرعام پرآنے کے بعدہم حامدی کی شاعری کے نئے روپ سے متعارف ہوتے ہیں۔اس میں حامدی کاشمیری کی شاعری کانیااورجدید رنگ نظرنواز ہوتا ہے۔''نایافت'' کے بعد''شاخ زعفران''اور''لاحروف''میں بھی حامدی کی شاعری میں حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھنے کوملتی ہیں۔فکروفن، موضوع، زبان اور اسلوب وغیرہ غرض ہرسطح پر حامدی کاشمیری کی شاعری ایک نئے سفرپرگامزن نظرآتی ہے۔یہاں سے حامدی کی شاعری کاایک اہم دورشروع ہوتا ہے۔دراصل یہ اُردو میں جدیدیت کادورتھا جس نے پورے ملک کےفن کاروں کومتاثر کیا ہے۔حامدی کاشمیری بھی اس نئے رجحان سے متاثرنظرآتے ہیں۔جدیدیت کی مقبولیت کاایک بڑاسبب یہ بھی

تھا کہ یہ ادیبوں اور شاعروں کے لئے ذہنی آزادی کی خوشخبری لے کر آ گئی، ترقی پسندی عام انسانوں کے سماجی اور معاشی مسائل پیش کرنے پر اصرار کرتی تھی۔ جدیدیت نے فکر و خیال کی تمام پابندیوں کو توڑ دیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا رجحان ساز رسالہ ''شب خون'' جدیدیت کی ترویج و اشاعت کا ایک اہم آلہ کار ثابت ہوا۔ اس کے قارئین ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور اس کے توسط سے جدیدیت کے فکر و فلسفہ کو خوب فروغ ملا۔ ریاست جموں و کشمیر میں بھی جدیدیت کے اس نئے رجحان کے اثرات پڑے۔ یہاں کے شعراء اور ادباء بھی روایت اور تقلید کے طوق کو اُتار کر اپنے داخلی جذبات کو اُجاگر کرنے لگے۔ کشمیر میں جدیدیت کے آثار سب سے پہلے حامدی کاشمیری کے یہاں ہی نظر آتے ہیں، کیونکہ ذہنی اور فکری سطح پر ان کی شخصیت میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں تھیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر منیب الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''نئی شاعری کے سلسلے میں جس کی ابتداء ریاست میں ۶۵ء کے بعد ہوئی حامدی کاشمیری نے پیش رفت کی۔ روایتی اور رومانی شاعری سے کنارہ کش ہو کر انہوں نے موضوع اور اسلوب کو بے جا جکڑ بندیوں سے آزاد کرا کے نئے شعری تقاضوں کے مطابق کر دیا۔ حامدی کاشمیری کی شاعری نہ صرف اسلوب اور آہنگ کے لحاظ سے ایک نئی سمت اختیار کر گئی بلکہ ان کے موضوعات عصری تقاضوں کے پیش نظر زیادہ پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہو گئے۔ ان کی شاعری میں ان تبدیلیوں کے نتیجے میں زبان و بیان کی چستی اور دروبست وجود میں آئے۔''[۷]

ریاست جموں و کشمیر میں جدید اور نئی غزل کی شروعات حامدی کاشمیری ہی سے ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات اور جذبات کو نئے فکری اور فنی تصورات کے پیش نظر بیان کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں نئی نسل اور نئی شاعری کے علمبرداروں میں حامدی کاشمیری کا نام سرفہرست ہے۔ مظہر امام اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اگر جموں و کشمیر میں نئی نسل وہ نسل ہے جس نے جدید عصری حسیت اور نئے مزاج کو سب سے پہلے قبول کیا، تو پھر یہ نسل حامدی کاشمیری سے شروع ہوتی ہے۔''[۸]

اس بات کا اعتراف محمد یوسف خان عادل بھی اپنی تصنیف ''کشمیر میں اُردو شاعری ۱۹۴۷ء کے بعد'' میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''حامدی کاشمیری سے ہی کشمیر میں جدید اُردو شاعری شروع ہوتی ہے۔ حامدی کا دائرہ کار نہ صرف وسیع ہے بلکہ وہ ادب کو خالص ادبی نقطۂ نظر سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی غزلیں جدید احساس اور طرز بیان سے آراستہ ہوکر دوآتشہ ہوگئی ہیں۔'' 9

حامدی کے کلام میں جدید غزل کے عناصر پوری فنی چابکدستی کے ساتھ ''نایافت'' سے ''شاخ زعفران'' تک کے ہر مجموعے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن وہ جدید رنگ میں بھی اپنی انفرادی شان کو قائم رکھتے ہیں۔ عصری تقاضوں اور جدید حسیت کو کچھ اس طرح شعری سانچوں میں ڈال دیتے ہیں:

شہ پروں پر دھوپ لے کے آئے ہیں
بند و کمروں کے دریچے واکرو

دشت خود ہے رواں سفر کیسا
منزلیں کیسی رہ گزر کیسا

ان ظلمتوں سے اُبھر گئی جیسے کوئی کرن
میں ساری ساری رات انہیں گھورتا رہا

نکل پڑی ہیں تعاقب میں ہانپتی سڑکیں
کہیں یہاں سے بس اک آدھ بات ہو تو چلیں

خلوتوں میں وہ درآئے کوئی دربان نہ تھا
چاند کیوں ٹہنی پہ مصلوب تھا ہمراز نہ تھا

دشت ظلمت میں خورشید اُگا یا جائے
خالی آنکھوں کو کوئی خواب دکھا یا جائے

مذکورہ بالا اشعار جدید غزل کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ ان میں حامدی کاشمیری کے فکر وفن کی بدلی ہوئی روش کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے مختصر مدّت میں ہی ایک منفرد جدید شاعر کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، اور اس جدید اور نئے رجحان سے اپنی ذہنی ہم آہنگی کو قائم کیا۔ تاہم جدید شعراء کی اس کثیر تعداد میں حامدی کاشمیری نے اپنی انفرادیت کو اپنے مخصوص لہجے، ڈکشن اور دلکش اسلوب کی بدولت برقرار رکھا۔ وہ اپنے ہم عصر شعراء کی بھیڑ میں انہی خوبیوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ جدید شعراء میں حامدی کاشمیری کی شعری انفرادیت کے حوالے سے مخمور سعیدی لکھتے ہیں:

''جدید شاعری میں آوازوں کا جو تنوع نظر آتا ہے اس کی تازہ مثال کے طور

پر ''نایافت'' کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کے اچھے اشعار میں کسی ہمعصر کی صدائے بازگشت آپ کو سنائی نہ دے گی۔'' ۱۰

ڈاکٹر برج پریمی بھی اس حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حامدی نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''عروس تمنا'' سے ''نایافت'' اور ''لاحرف'' تک ایک طویل ذہنی سفر طے کیا ہے۔ حسن و جمال کی عشوہ طرازیوں اور روحانی اظہار خیال کے بعد ان کے شاعرانہ لہجے، آہنگ اور ڈکشن میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی ہے۔'' ۱۱

حامدی اپنے تخلیقی سفر میں ظاہر سے باطن کی طرف جدیدیت کے دوران ہی بڑھنے لگے۔ وہ وجود اور ذات کی گوناگوں پیچیدگیوں میں ڈوبنے کے بعد اپنے تجربات اور خیالات کی ترجمانی غزل کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ انسانی حیات، اللہ کی وحدانیت، مذہب کی اہمیت، خود شناسی کے علاوہ زندگی کے دیگر اہم تجربات کو موصوف نے فنکارانہ مہارت کے ساتھ اُبھارا ہے۔ حامدی اپنے تخیلات، تجربات، احساسات اور خیالات کو پیش کرنے کے لئے علامتی اور رمزیاتی انداز بیان کو بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ اختصار اور ابہام سے بھی کام لیتے ہیں، جو کہ جدیدیت کا خاصہ رہا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

جانے کس تہہ میں اتاریں گے
بہتے رنگوں کے آتش گرداب

ان ظلمتوں سے اُبھرے گی کوئی کرن
میں ساری ساری رات انہیں گھورتا رہا

ہر قدم اُٹھے گا نور جزیروں کی طرف
سوچتے کیا ہو سیہ موجوں پر چل کر دیکھو

مرد نجوم سے کیا اکتساب نور کروں
یہ آفتاب جہاں دست رس میں میرے ہے

مایوسی، ناامیدی، غیر یقینیت، عدم تحفظ، محرومی، خوف دہشت، ظلم و جبر جیسے موضوعات باقی جدید شاعروں کی طرح حامدی کاشمیری کے کلام میں بھی نظر آتے ہیں۔ حامدی کے یہاں خوف و دہشت محرومی اور نااُمیدی کے اظہار کے لئے مخصوص علامتوں کا استعمال ہوا ہے۔ ان کی غزلوں میں لفظ ظلمت سے متعلق متعدد علائم اور تراکیب دیکھنے کو ملتی ہیں، جو ان کے کلام میں کلیدی رول ادا کرتی ہیں۔ ظلمت ظلمات، ورطۂ ظلمات، تہہ ظلمات، بحر ظلمات، دشت ظلمات، شہر ظلمات، ظلمت سیال وغیرہ حامدی کی

غزلوں میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، جن کی بدولت حامدی کی فکر اور ذہنی کیفیات تک رسائی ہوتی ہے۔اس حوالے سے چند اشعار دیکھئے ۔

سب کہاں ورطۂ ظلمات سے نکل کے آئے
ایک ہمیں روشنی کے خواب میں ڈھل کے آئے

جاگتے نین بھولے بھٹکے خواب
دشت ظلمت میں روشنی کے سراب

ہم ہیں اور ظلمات سیال کا بے سمت سفر
جانے کس دشت میں تھک ہار کر مہتاب رہے

دشت در دشت اندھے سائے ہیں
کس سے پوچھوں میں اپنا نام و نشاں

دشت ظلمات میں خورشید اگا یا جائے
خالی آنکھوں کو کوئی خواب دکھایا جائے

دشت ظلمات سے ہم سر کی ہے
خون اچھالا ہے روشنی کی ہے

حامدی کے کلام میں ''ظلمات'' کے کثیر استعمال سے ان کی ناامیدی اور مایوسی کا اندازہ ہوتا ہے ، کیونکہ کسی لفظ یا علامت کا بار بار استعمال شاعر کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ظلمات ' تاریکی اور تیرگی جیسے الفاظ حامدی کے لاشعور کا پتہ دیتے ہیں۔ان کے وجود کی گہرائیوں کا اندازہ بھی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔مگر دوسری جانب حامدی کی غزلوں میں ایسے خوش آئند اور امید افزا عناصر بھی نظر آتے ہیں، جہاں وہ ظلمت کے خاتمے اور روشنی و نور کے آنے کی امید رکھتے ہیں۔حامدی کی غزلوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود کی تلاش و جستجو میں اندھیری اور تاریک راہوں سے گزر کر روشنی کو تلاشتے ہیں اور وہ اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ اندھیرا چاہے کتنا خوف ناک اور گھنا کیوں نہ ہو روشنی کی ایک تجلی کے سامنے اپنا وجود کھو دیتا ہے۔اس طرح کے نئے اور دلچسپ تجربات حامدی کی غزلوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ظلمات اور نور کا متضاد استعمال وہ ان خوبصورت اشعار میں کرتے ہیں ۔

ہر قدم اُٹھے گا پرنور جزیروں کی طرف
سوچتے کیا ہو' سیہ موجوں پر چل کر دیکھو

دشت ظلمت میں کہیں شعلہ لبریز تھا کوئی

کہتے ہیں منتظر نورِ سحر تھا کوئی
دشت ظلمت میں خورشید اگایا جائے
خالی آنکھوں میں کوئی خواب دکھایا جائے
پسِ ظلمات ہیں ظلمات کتنے
کہیں اک عالم انوار بھی ہے
کوہ شب سلسلہ در سلسلہ تھا
منبع نور سحر دور نہ تھا
یہ مرگ شب ہے ابھی تیرگی گھنی ہو گی
لہو بہاتے رہو روشنی زیادہ ہو گی

حامدی کاشمیری کی غزلوں میں تاریکی سے روشنی کے اس انوکھے سفر کو مصرہ مریم نے ان کی شاعری کا خوشگوار تغیر قرار دیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ وہ ظلمات سے ظلمات کا نہیں بلکہ تاریکی سے روشنی کے عالم کا خوبصورت شعری سفر طے کر رہے ہیں۔ چنانچہ لکھتی ہیں:

''ان (حامدی) کے اس روحانی سفر میں نئے شعری مجموعوں سے جس نمایاں اور خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوتا ہے وہ ظلمات سے ظلمات کا سفر نہیں بلکہ ظلمات سے روشنی کے عالم کا سفر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جہاں ظلمت کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہیں وہاں نور کی ازلی قوت کا سراغ بھی لگا چکے ہیں یہ زندگی کی اصلیت تک پہنچنے کا عمل ہے۔ جو زندگی کو ایک مثبت رُخ عطا کرتا ہے۔ نور کا پیکر ان کی شخصیت کی اصلی قوتوں کا اشارہ ہے' حامدی کی نظر ''من الظلمات الی النور'' کی قرآنی آیت پر ہے۔ وہ ظلمت میں نور کو دیکھتے ہیں۔ اور یہ مشاہدہ ان کے یہاں نور کے پیکروں کی صورت اختیار کرتا ہے۔ نور ان کے یہاں سچائی، اقدار، ایمان' یقین اور نیکی کی ترجمانی کرتا ہے۔'' [۱۲]

حامدی نے اپنے جذبات کو علامتی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ علامت سازی میں حامدی معنی و مفاہیم کے دفتر کھولتے ہیں۔ بنیادی طور پر حامدی کا ذہنی میلان علامتی ہے۔ واضح اور راست بیان سے ان کو کوئی رغبت نہیں ہے۔ وہ اپنے سنجیدہ و تہہ دار تجربات کو علامتوں اور استعاروں کے ذریعے متشکل کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں نہ ختم ہونے والا علامتی سلسلہ نظر آتا ہے۔ بعض علامتیں اور استعارے ایسے ہیں جن کو حامدی نے متعدد غزلوں میں برتا ہے، جنگل' پر چھائیاں' سمندر' شجر' دیوار' برف' ظلمت' دشت' نور' خوف'

کھنڈر، آندھی، پتھر، سنگ، حروف، سراب، ساحل، صحرا، سائے، سورج وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کو حامدی علامتی شکل دیتے ہیں۔ ان علامتوں کا استعمال وہ کثرت سے کر کے معنی ومفاہیم کی تہہ داری کو اُبھارتے ہیں۔ حامدی اپنے داخلی جذبات کو مذکورہ علامتوں کے سہارے یوں شعری لباس عطا کرتے ہیں ؎

جانے کب ریگِ سیاہ سے شجر نور اُگے
تم میرے واسطے دیدہ تر لے آنا

مقفل گھر کے دروازوں کو کرلو
سمندر خوں تشنہ ہو گیا ہے

جلائے رکھو لہو کے چراغ پلکوں پر
سرکتی دھوپ کا کیا اعتبار ہے لوگو

رنگ ہونگے نہ روشنی ہو گی
برف آنکھوں میں جم رہی ہو گی

جانے کس کی تلاش تھی اس کو
رات بھر دربدر پھرا مہتاب

وہ شب کالی آندھی کی یلغار تھی
اکیلا شجر تھا سوجلتا رہا

بڑے شاعر کی پہچان اس کی زبان واسلوب سے کی جاتی ہے۔ حامدی نے بھی اپنے کلام میں نئی مگر خود ساختہ استعاراتی اور علامتی زبان کو بروئے کار لایا ہے، اسی جدت طرازی میں ان کی انفرادیت مضمر ہے۔ انہوں نے اپنے جذبات اور تجربات کے تخلیقی اظہار کے لئے ایک نیا اور منفرد ڈکشن وضع کیا ہے۔ ان کے کلام میں نئے استعارے، نئی علامتیں اور ترکیبیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ حامدی کے کلام کا استعاراتی اور علامتی نظام اُردو غزل میں نئے اور قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ حامدی کے کلام سے ان کی وضع کردہ مخصوص تراکیب اور استعاروں کو یہاں مثال کے طور پر نقل کرتا ہوں: ہانپتی سڑکیں، صدف چشم، سیاہ دھوپ، برف نوائی، نواحِ خواب، چادر آب، گونگے چہرے، اجاڑ پلکیں، اونگھتے کھنڈر، لاحرف شعلہ رنگ، جلتا لہو، احمریں ابابیلیں، برفیلے بنجر، سنگ زاد، نیلی ہوا، پتھریلے قدم، خلائے تیرہ، لانظری، پتھریلی خموشی، گونگی پرچھائیاں، منجمد پیڑ، زرد دوپہر، کالے شبد، منجمد وادی، نیلی دھوپ وغیرہ۔ حامدی کاشمیری کی غزلوں میں اس نئی حیرت انگیز اور انوکھی علامت، استعارہ اور ترکیب سازی نے ادبی حلقے کو متاثر کیا ہے۔ اس ضمن میں نشاط انصاری لکھتے ہیں:

''حامدی صاحب کی شاعرانہ بلندی اس بات میں پوشیدہ نہیں کہ وہ وقت کے
حسی کرب اور آشوب فکر کو علامتوں سے ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کی عظمت اس
امر میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے شاعری خاص کر آج کی غزل میں ایک نیا
اور منفرد شعری اسلوب پیدا کر کے ایک نئے آہنگ اور مزاج سے آشنا کیا ہے
''۔[۱۳]

پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی بھی حامدی کاشمیری کی علامت نگاری، استعارہ اور ترکیب سازی کو ان کی شاعرانہ انفرادیت کا موجب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حامدی کے خلاقانہ شعور اور فن کارانہ امتیاز کا بہترین مظہر ان کے وہ
استعارے، علامتیں اور شعری تراکیب ہیں جو کسی بھی قابل ذکر شعری و تخلیقی
تجربے کے استناد و امتیاز کی پہلی ضروری شرط کہی جاسکتی ہیں۔''[۱۴]

پیکر تراشی حامدی کاشمیری کے شعری فن پاروں کا نمایاں وصف ہے۔ان کے کلام میں پیکروں کا خوب صورت نظام موجود ہے۔حامدی کی شاعری میں پیکر تراشی کے دلکش اشعار کو پڑھ کر قاری وجد میں آتا ہے، ان کا ہر جذبہ پیکر بن جاتا ہے۔ وہ اپنے غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر زندہ اور متحرک پیکر تراشتے ہیں۔ان کے پیکر کائنات کے تخلیقی عناصر سے تعلق رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حامدی اپنے خیالات اور تجربات کی فراوانی کو خوبصورت پیکروں کی صورت میں کچھ اس طرح جلوہ گر کرتے ہیں:

ساگر ساگر کالی چپ
ساحل ساحل ہے کہرام

ہاں امید گوہر رکھ
آنکھ میں سات سمندر رکھ

شگوفوں پر خنجر برسنے لگے
اک اک پل میں منظر بدلتا رہا

مجھ کو پہچاننا نہیں ممکن
برف رات تھی بسر کی ہے

سب کچھ کہنے والے تھے
دروازوں پر تالے تھے

صبا سے کہو آنچل کو سنبھالے

چمن کا ہر گل ترآتشیں ہے
جلائے رکھو لہو کے چراغ پلکوں پر
سرکتی دھوپ کا کیا اعتبار ہے لوگو

کم الفاظ میں بڑی بات یا بڑا تجربہ بیان کرنا اچھے شاعر کی خوبی ہوتی ہے۔حامدی کے کلام میں یہ وصف بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔انہوں نے اپنے تجربات اور خیالات کو علامتوں اور پیکروں کی شکل میں مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ان کے کلام میں زبان اور اسلوب کی جدت اور ندرت دیکھنے کو ملتی ہے۔اس حوالے سے حامدی کاشمیری اپنے شعری مجموعے ''لاحرف'' کے دیباچے میں اپنی زبان اور نئی لفظیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو میرے تجربوں کی لسانی تشکیل کی ممکنہ صلاحیت کو بروئے کار لاسکیں۔اس عمل میں میں نے الفاظ سے پیکریت کی جانب مسلسل سفر کو رواں رکھ کر حرف وصوت کو سکہ بند معانی کی حد بندیوں سے آزاد کرانے اور ان علامتی امکانات کو روشن کرنے کی سعی کی ہے۔''
۱۵

حامدی کی غزلوں کی زبان اور پیکر سازی کی خوبی سے متاثر ہو کر بل راج کومل لکھتے ہیں:

''مجھے حیرت اور مسرت کا احساس ہوا کہ حامدی کاشمیری نے شخصی تجربات کے اظہار کے لئے روایتی غزل کی زبان یکسر رد کر کے جس لسانی ڈھانچے کی تشکیل کی ہے وہ بلاشبہ ان کے محسوسات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے''۔
۱۶

کشمیر کی خوبصورتی اور رعنائی کو بھی حامدی نے اپنی غزلوں میں ایک موضوع کے طور پر برتا ہے۔حامدی کی شاعری میں کشمیر کے موسم اپنے متنوع رنگوں میں جلوہ افروز ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ اپنے وطن کی مٹی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ان کے روم روم میں کشمیر بسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔یہاں کی بہاروں، قدرتی نظاروں، وادیوں، مرغزاروں کی دلفریب عکاسی حامدی کے کلام میں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔انسان جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس کا اثر دور پار رہتا ہے۔حامدی نے اپنی زندگی قدرت کی بنائی ہوئی اس جنت نظیر وادی میں گزاری ہے۔یہاں کی خراماں ہواؤں، مہکتی فضاؤں، میٹھے پانیوں، برف زاروں، چناروں اور کوہساروں کے درمیان حامدی نے اپنی عمر کے حسین پل گزارے ہیں۔وہ کشمیر کی بہاروں کے مداح ہیں۔یہاں کے نظارے ان کے وجود کا اہم حصّہ بن کر شعری سانچوں میں کچھ یوں ڈھلتے ہیں۔

ہر اک گام پہ نغموں کے پھول کھلتے ہیں
سحر طراز ہے مانگ ہزار کیا کہیے
شگفتگی کا وہ عالم وہ کیف جواب جمال
نہ پوچھ کیفیت صبح و شام ما نسبل
نظر وارفتگی نظار گی معلوم ہوتی ہے
خزاں میں بھی گلوں کی دلکشی معلوم ہوتی ہے
ازل سے حامدی پروردہ ٔ بہار ہوں میں
خزاں سے کہہ دو ہے نسبت مجھے بہاروں سے
ہجوم لالہ گل میں ہوں میں بھی چپ لیکن
یہ کیسی آگ دہکتی ہے دل کے تاروں میں
چمن میں ، باغ میں ، کوہ دمن میں ، صحرا میں
ہے رنگ ونکہت و نور و طرب کی ارزانی

حامدی کی غزلوں میں کشمیر کے حسین اور دلکش مناظر کی عکاسی کے حوالے سے محترمہ مصرہ مریم رقمطراز ہیں:

”وہ (حامدی کاشمیری) کشمیر کے ذرے ذرے اور چپے چپے سے پیار کرتے ہیں۔ انہوں نے یہاں کے شگوفہ بار پیڑوں، نغمہ بار آبشاروں، رنگ بدلتے موسموں نظاروں اور برف پوش پہاڑوں کو اپنی شخصیت کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی شاعری کشمیر کی مشکبار صبحوں، رنگین شاموں، مہکتے پھولوں، بادام کے شگوفوں، سرسبز کوہساروں، شفاف جھیلوں، چاندنی راتوں، چمکتے ستاروں، تاریک خنک راتوں، خوش نوا پرندوں، صبح بہاراں، شام خزاں کی دلفریب اور نظر نواز تصویروں کا مجموعہ ہے۔“ ۱۷

حامدی کی غزلوں میں صرف وادیٔ کشمیر کے دلکش و دلفریب نظاروں کی ہی دید نہیں ہوتی بلکہ وہ یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کا بھی گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کی بے بسی اور مظلومیت کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ باشندگان کاشمیر کی محکومیت اور بے چارگی ختم ہونے کے بجائے ہر دور میں بڑھتی ہی رہی ہے۔ یہاں تک کہ آج کے موجودہ دور میں اہل کشمیر سخت مشکلات اور خونین صورت سے گزر رہے ہیں۔ حامدی کاشمیری ایسے حساس شاعر کے دل میں اپنے ہم وطنوں کے دکھ درد اور بے چارگی کو ان کے کلام میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں حامدی

نے وادی کی ویرانی، بے چارگی اور خونین صورت حال کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

وہ محافل ، وہ ملاقاتیں کہاں
ملنے کی جگہ مقابر رہ گئے ہیں
خاک و خون سے نہلا کے ہوئے جزو زمین
میرے اجداد کی عالی نسبی کیسی ہے
اک اک چپے پر سو پہرے لگے ہیں
پرندہ بھی کہاں پر مارتا ہے
بس اتنا یاد ہے شب کو چلتی تھی تیز ہوا
سحر ہوئی تو کوئی نہ تھا مکانوں میں
منتظر کتنی قتل گاہیں ہیں
دوست سر فروش ہیں کتنے
منجمد وادیوں میں آگ لگائی کس نے
جان کو رکھ کے ہتھیلی پہ صدا دی کس نے
بند کمروں میں پڑے تھے شام سے پہلے ہی وہ
چوک تھے سنسان کوئی عیش گاہوں میں نہ تھا
بستی کی بستی ہے لرزاں خوف سے
پابہ جولاں بھی ہے زندانی بھی ہے

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ حامدی علامتی انداز کو مرغوب رکھتے ہیں۔ یہاں پر بھی انہوں نے اسی انداز کو بروئے کار لایا ہے۔ موصوف نے کشمیر اور اہل کشمیر کی کرب ناکی، محرومی اور بے بسی کو علامتوں اور استعاروں میں سمونے کی احسن کوشش کی ہے۔ لہو، کمرہ، دریچہ، دیوار، سائے اور برف جیسی علامتوں سے انہوں نے کشمیر کے روح فرساں اور کربناک حالات و واقعات کو اشعار کے لباس پہنائے ہیں۔ وہ اپنے اس دکھ درد کو علامتوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا درد اس قدر شدید ہے کہ وہ علامتوں کے پردوں میں بھی بے حجاب ہوتا ہے۔ اس حوالے سے انور سدید لکھتے ہیں:

''حامدی کاشمیری نے جس کرب کا سامنا کیا ہے اسے فنی ضرورتوں کے تحت چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن تصویر کے پردے اور علامات کے تہہ در تہہ دھند لکے سے بھی ان کا کرب عیاں ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔ چنانچہ ان کی

شاعری سے کشمیر کی آواز ہی سنائی نہیں دیتی بلکہ جبر کو حوصلہ وصبر وشکیبائی سے برداشت کرنے کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔''[۱۸]

کشمیر کے پُر درد حالات کا اثر یہاں کے ہر کس وناکس پر پڑا ہے۔فن کار بے حد حساس ہوتا ہے لہٰذا وہ عام انسان سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔اس حوالے سے حامدی اپنے شعری مجموعہ''شاخ زعفران'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ہوش سنبھالنے کے لمحے سے لیکر آج تک جب کہ میں عمر کی کئی منزلیں طے کر چکا ہوں' خارجی حالات کی تبدیلیوں اور چیدہ دستیوں نے مجھے قدم قدم پر ذہنی طور پر جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے اور میں گہرے دکھ''Angush'' اور ابتلا سے آشنا ہوں، یہ دکھ یہ ابتلا جس طرح میری شخصی زندگی پر محیط ہے اسی طرح من حیثیت الکل اہل کشمیر کا مقدر بھی رہا ہے۔''[۱۹]

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں یہ سائنسی انقلاب کا دور ہے۔سائنس کی نئی نئی ایجادات اور دریافت نے عالم انسانیت کو ایک عالمی گاؤں (Global village) میں تبدیل کیا ہے۔دنیا کے کس شہر اور کس علاقے میں کیا ہو رہا ہے اس کی خبر آج کے دور کے ہر انسان کو گھر بیٹھے ملتی ہے، لیکن جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے ہزار طرح کے عیش و آرام آج کے انسان کو میسّر آئے ہیں، وہیں دوسری طرف اس مادیت اور دنیا پرستی کی وجہ سے انسان میں رشتوں اور قدروں کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے ۔اگر چہ انسان ظاہری اعتبار سے بہت ہی ترقی یافتہ نظر آتا ہے لیکن وہ اپنی صفاتِ انسانی کے جذبے سے خالی نظر آتا ہے۔حامدی کاشمیری کو انسان کے اس بے گانہ روّیہ کا بہت افسوس ہے۔ان کا ماننا ہے کہ مادیت اور دنیا پرستی نے انسان کے دل اور روح پر ایک ایسا پردہ ڈالا ہے کہ وہ رشتوں کی اہمیت اور ضرورت کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔موصوف کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں وہ انسانیت کے جنازے کا رونا روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔دراصل حامدی کاشمیری نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے اس میں چھوٹے بڑے کی تمیز' حیا' پردہ' رشتہ' ایمانداری' وفاداری' امانت داری' دیانت داری وغیرہ جیسی صفات کو ایک انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھیں۔لیکن آج کے دور کے انسان ان اہم انسانی صفات کو بالائے طاق رکھ کر صرف مال و دولت اور آرام و آسائش کو ترجیح دیتے ہیں۔ انسانی قدروں کی شکست وریخت اور انسانوں کے بے گانگی اور رشتوں کی بے قدری سے حامدی افسردہ ہو کر اپنے جذبات کو شعری پیکروں میں یوں ڈھالتے ہیں ؎

ٹھٹھرتے ہیں وہی بے چہرہ سائے

ہے میرا کون، کس کا آشنا ہوں
کاٹ لیتے ہیں زبان پھر
پوچھ لیتے ہیں کہ خواہش کیا ہے
پلک جھپکنے میں شہروں کے شہر نگلے ہے
زمیں سے دور نئی بستیاں بسائیں گے
جانے کیا پوچھ لے پھر مجھ سے بوڑھا بالک
اب اسے تھپکیاں دے دے کر سلا جائے
فصیل شہر کے اندر نہ جانا
وہ سارے لوگ گرگ صورت ہو گئے ہیں
ہاں ملو ایک ایک کر کے کاروان رفتہ سے
درد بن کر چپکے سے سینے میں گھر کرتے رہو

مصرہ مریم حامدی کاشمیری کی غزلوں میں انسانیت کے خون ناحق' بے دردی اور بے گانگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ان کی شاعری انسانیت کے بے توقیری' خستگی اور لاچاری کا نوحہ ہے۔ وہ انسان کو کائنات کا مرکز سمجھتے ہیں' لیکن موجودہ مشینی اور خودغرضانہ معاشرے میں انسان انسان کے ساتھ جو تجارتی اور غیر انسانی برتاؤ کرتا ہے۔ وہ ان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ انہوں نے اکثر اشعار میں انسانیت کے زوال اور انسانوں کی بے گانگی اور بے بسی کے بارے میں اپنے غم کا اظہار کیا ہے' ان کے خیالات میں موجودہ مادی دور میں انسان روحانی صفات سے محروم ہوگیا ہے اور اس کے اندر کا درندہ جاگ اُٹھا ہے اور وہ انسانیت کو خاک اور خون میں شہلا رہا ہے۔'' ۲۰

حامدی کاشمیری صنف غزل کی فنی باریکیوں' ضابطوں اور اصولوں سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک بحور کے انتخاب کا تعلق ہے اس میں وہ چھوٹی اور بڑی دونوں نوع کی بحروں کو برتنے کے روادار رہے ہیں۔ البتہ چھوٹی بحروں کو برتنے میں زبردست ملکہ رکھتے ہیں۔ صنائع وبدائع کا استعمال بھی موصوف نے موقع ومحل کی مناسبت سے خوب کیا ہے۔

بہر کیف ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حامدی کاشمیری اُردو غزل کی ایک اہم آواز ہیں۔ موصوف کا

انتقال ۲۶ دسمبر ۲۰۱۸ء کو سرینگر میں ہوا ہے۔لیکن وہ اپنی ادبی خدمات کی بدولت ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہیں گے۔ جب بھی ریاست میں جدید اُردو غزل کا تذکرہ کیا جائے گا تو اس کا آغاز حامدی کے نام سے ہوگا، جنہوں نے اپنے جذبات اور تجربات کو علامتی الفاظ اور منفرد انداز میں پیش کر کے دامن غزل میں نئی وسعتیں پیدا کیں ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حکیم منظور

کشمیر میں اُردو غزل کے منظرنامے پر ۱۹۴۷ء کے بعد آنے والے نمائندہ شعراء میں ایک اہم اور معروف نام حکیم منظور کا ہے۔ حکیم منظور صنف غزل کو برتنے میں غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔موصوف اُردو زبان کے شیدائی اور شعری روایات کے امانت دار ہیں۔انہوں نے نہ صرف کشمیر بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنی انفرادی حیثیت بطور غزل گو منوائی ہے۔

حکیم محمد منظور نام حکیم منظور قلمی نام ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سرینگر کے شہر خاص علاقہ آخون صاحب گوجوارہ میں ایک آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد صاحب حکیم علی محمد مشہور مطبع تھے۔بحیثیت طبیب ان کی شہرت شہر کے علاوہ دیہاتوں تک پھیلی تھی اور دور دراز علاقوں سے آپ کے پاس مریض آتے تھے۔منظور کی والدہ ماجدہ صدیقہ بیگم مخصوص کشمیری وضع کی خاتون تھیں۔وہ نہایت ہی شریف، ملنسار اور صوم صلواۃ کی پابند تھیں۔ایسے مخلص والدین کی محبتوں اور شفقتوں کے سائے میں حکیم منظور کی پرورش ہوئی۔گھر میں اچھا خاصا علمی اور ادبی ماحول تھا۔تعلیم کا باقاعدہ آغاز مقامی اسکول سے کیا۔اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔مزید تعلیم کے لئے سری پرتاپ کالج میں داخلہ لیا،اسی کالج میں آپ کے اندر چھپی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملی۔یہاں اپنے وقت کے معتبر اساتذہ پروفیسر جیالال کول، پروفیسر طیب شاہ صدیقی، پروفیسر محی الدین حاجنی کی صحبت عزیز ان کی نصیب ہوئی۔منظور نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا لیکن بہت جلد اس صنفِ نثر سے دلچسپی کم ہوگئی اور شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ان کی طبیعت شاعری کی طرف خاص طور پر غزل گوئی کی جانب مرکوز ہونے لگی۔ایس۔پی کالج کی ادبی فضاؤں میں منظور نے ۱۹۵۵ء کے آس پاس اپنے شعری سفر کا باقاعدہ آغاز کیا۔ان کی ابتدائی شعری کاوشیں کالج میگزین ''پرتاپ'' کے علاوہ ریاست کے دیگر اہم رسائل اور اخبارات میں چھپنے لگیں۔بعد ازاں انہوں نے ملک کے نامور اور موقر رسائل اور جرائد میں بھی اپنا کلام بھجنا شروع کیا جو تواتر کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔

حکیم منظور شاہانہ وضع قطع والی شخصیت کے مالک تھے۔وہ بہت ہی نفاست پسند تھے،جس کی

خاص وجہ یہ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ملازمت کے دوران وہ کبھی سرینگر، کبھی جموں اور کبھی دہلی میں مقیم رہے ہیں۔ لیکن ادب سے کبھی بھی خود کو الگ نہیں ہونے دیا۔ ریاستی اور ملکی سطح پر جن اعلیٰ عہدوں پر اپنے فرائض انجام دیتے رہے ان میں ''کسٹوڈین آف ایویکویز پراپرٹی''، جموں، ''اسٹنٹ کمشنر سیکریٹر'' جموں، ''ریزیڈنٹ کمشنر حکومت جموں وکشمیر'' دہلی، ''ایڈیشنل سیکریٹری''، ''ڈائریکٹر ایگریکلچر دیپارٹمنٹ جموں وکشمیر''، ''ڈاریکٹر سکول ایجوکیشن کشمیر''، ''ڈپٹی کمشنر بارہ مولہ'' کشمیر وغیرہ شامل ہیں۔

حکیم منظور نے ادبی دنیا میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ مقامی سطح کی چھوٹی بڑی ادبی انجمنوں اور محفلوں میں بھی شرکت کرنا شروع کی۔ بعض انجمنوں کے وہ باقاعدہ رُکن بھی رہے ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر کی جن اہم ادبی انجمنوں اور اداروں کے ساتھ حکیم منظور منسلک رہے ہیں ان میں ''بزم فروغ اردو جموں، کل ہند اردو رائٹرس اینڈ ایڈیٹرس فورم کشمیر، انجمن ترقی اردو ہند جموں، کل ہند اردو ہندی سنگم کشمیر، جموں وکشمیر رائٹرس کونسل، بزم شعراء سرینگر، اربابِ ذوق سرینگر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی تصنیف ''مباحث'' میں کشمیر کی ایک ادبی انجمن کے بارے میں منظور اور دیگر اراکین کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ہم نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے حلقہ علم وادب نام کی ایک تنظیم بنالی تھی۔ ریاست کی سیاسی اتھل پتھل نے اس تنظیم کے اراکین میں نظریاتی اختلاف پیدا کردیئے تھے۔ ہم نے بھی حلقے سے الگ ہوکر انجمن ''ارباب ذوق'' کے نام سے ایک علحیدہ انجمن منظّم کرلی تھی۔ اس کے اراکین میں جانے پہچانے ادیب تھے۔ حکیم منظور، مخمور بدخشی تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، وجیہ احمد، محی الدین شال، راقم الحروف اور دوسرے بہت ادیب اس انجمن کے ساتھ وابستہ تھے۔'' [۲۱]

اس اقتباس اور مذکورہ انجمنوں کے ساتھ وابستگی سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکیم منظور اپنی ادبی زندگی میں کس قدر فعال اور متحرک رہے ہیں۔ اس امر کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ پچاس سالہ تخلیقی سفر میں ان کے دس شعری مجموعے اردو اور کشمیری میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ علاوہ ازیں ''اقبال ایک تذکرہ'' کے نام سے ایک کتاب نثر میں بھی یادگار چھوڑی ہے۔ منظور کا پہلا شعری مجموعہ ''ناتمام'' ۱۹۷۷ء میں منصۂ شہود پر آیا ہے جس کو اہل شوق اور عاشقانِ فن شاعری نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جسے موصوف کو کافی حوصلہ افزائی ملی اور انہوں نے اس کے بعد اپنی دفتری مصروفیات کے باوجود تواتر سے لکھنا

شروع کیا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے ''لہولس چنار ۱۹۸۲ء، برف رتوں کی آگ ۱۹۹۰ء، خوشبو کا نام نیا ۱۹۹۱ء، پھول شفق آنگن کے ۱۹۹۳ء، شعر آسمان ۱۹۹۷ء، صبح شفق تلاوت ۱۹۹۸ء، برف آفتاب ۲۰۰۰ء، سخن برف زاد ۲۰۰۳ء، قلم زبان شگاف ۲۰۰۵ء'' جیسے پھول نما مجموعے گلستانِ شاعری کو اپنی منفرد مہک و بو سے معطر کرتے رہے۔

حکیم منظور کو ادبی خدمات کے عوض میں مختلف ادبی انجمنوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ان میں ''جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی، مردبار ہمولہ، مہجور فاونڈیشن'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو کی جملہ شعری اصناف میں غزل حکیم منظور کی پسندیدہ صنف سُخن رہی ہے۔اگر چہ انہوں نے نظمیں، مرثیے، نعت اور قطعات وغیرہ بھی لکھے ہیں۔لیکن اردو ادب میں وہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔منظور نے شاعری کی دنیا میں اس وقت قدم رکھا جب ترقی پسند تحریک اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور ایک نیا رجحان جدیدیت کے نام سے ملک کے طول و عرض میں اپنا قدم جما رہا تھا۔منظور اس نئے رجحان سے کسی حد تک متاثر ضرور ہوئے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص نظریے یا تحریک کے پابند ہونا تسلیم نہیں کرتے۔ان کے کلام میں روایت کی پاسداری بھی ملتی ہے اور جدت طرازی بھی، اس کے باوجود انہوں نے اپنے احساسات کے اظہار کے لئے ایک نئی راہ اختیار کی جس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔منظور روایت کی اندھی تقلید اور پیروی سے بڑی حد تک پرہیز کرتے ہیں۔وہ روایت سے صحت مند شعری عناصر کو اخذ کرتے ہیں اور بیشتر جدت طرازیوں سے ہی کام لیتے ہیں۔پروفیسر عبدالقادر سروری منظور کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کی غزلوں میں موضوعات اور اسلوب دونوں میں روایت پسندی بہت کم ہے، یہ نئے عہد کی غزل ہے جس کا رجحان حقائق اور اخلاقی آدرشوں پر ہے کچھ استعارے وہ اپنے انداز سے برتتے ہیں۔''[۲۲]

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ حکیم منظور کی شاعری اس عہد کی پیداوار ہے جب اردو ادب میں پہلے جدیدیت اور پھر مابعد جدیدیت کا دور دورہ تھا۔ادب میں ترقی پسند تحریک کے بعد ان دونوں رجحانات نے مختلف اصناف پر گہرے اثرات مرتب کئے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس دور کی اردو شاعری اسی مخصوص رنگ میں رنگی ہوئی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔اردو ادب میں جدیدیت کا رجحان ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا ہے۔یہ رجحان ایک رویہ کی صورت اختیار کر گیا جس کے امتیازی نشانات میں اظہار کی آزادی، ادب میں ذات کا اظہار اور فن برائے فن شامل ہیں۔یہ ایک عالمی سطح کا رجحان رہا ہے

جس نے دنیا کی بڑی زبانوں سے لیکر چھوٹی چھوٹی زبانوں کے ادباء اور شعراء کو بڑی حد تک اثر انداز کیا ہے۔ایک اہم بات یہ ہے کہ اس نئے رویے کو بعض حضرات نے فیشن کے طور پر اپنایا ہے۔لیکن حکیم منظور نے اس رجحان کے مثبت پہلوؤں کو ملحوظ رکھا ہے اور اکثر وہ اس سے اپنا دامن بچاتے ہی رہے۔ڈاکٹر مشعل سلطان پوری اس سلسلے میں منظور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حکیم منظور کی شاعری میں اس کی (جدیدیت) پر چھائیاں تو نظر آتی ہیں لیکن اکثر و بیشتر وہ پہلو تہی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔وہ اس منفی فلسفے کے شکار ہو بھی نہ سکے ہیں۔عقیدہ کی پختگی، اسلامی اقدار کی پاسداری اور زندگی کی صالح قدروں پر ایمان نے انہیں بچائے رکھا۔'' ۲۳

منظور کی شاعری جدید حسیات، مشاہدات اور تجربات کا حسین امتزاج ہے۔ان کا کلام عصری آگہی کا عمدہ نمونہ ہے۔انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اردو غزل کو نیا اور تازہ لب و لہجہ عطا کیا ہے۔جو ان کی تخلیقی شخصیت کا غماز بھی ہے اور جس کی بدولت وہ اپنے ہم عصروں میں ایک انفرادی شان رکھتے ہیں۔آپ جدید اور تعمیری فکر کے شاعر ہیں۔حکیم منظور کے کلام میں فکر کی بلندی اور تازہ کاری کے پیش نظر راجندر منچندہ بانی مرحوم لکھتے ہیں:

''ان (حکیم منظور) کے کلام میں فکر اور جذبہ کی ہم آہنگی موثر اظہار کی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ان کا شعری احساس کشادہ نظری اور دروں خبری سے عبارت ہے۔آج کے دور میں لکھی جانے والی ہم اسلوب غزلوں کے دور میں ان کی غزل تازہ ہوا کی طرح محسوس ہوئی۔متجسس اندازِ مشاہدہ، الفاظ کو برتنے کا منفرد زاویہ، ڈکشن کی تازہ کاری۔یہ سب کچھ ان کے یہاں ایک نیا اسلوب ترتیب دیتا ہوا نظر آتا ہے۔مجھے یقین ہے کہ نئی غزل کے منظر نامہ میں ان کی غزل کا نقشہ آسانی سے تلاش کیا جا سکے گا۔ اُن کی حرکی شعریات میں غزل کی امکانی قوتوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔''

۲۴

منظور اپنے اسلوب اور لہجے کی تازگی اور انفرادیت کا خود بھی ایک جگہ اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے ذاتی طور پر احساس ہے اور بجا طور پر کہ میرے لہجے اور اسلوب کے ساتھ ساتھ میرے فکر کے تانے بانے بھی اسی سرزمین سے پیوست

ہیں۔اس لئے اچھا بُرا جیسا بھی ہے میرا اسلوب، میرا لہجہ اور میرا فکر صرف میرا ہے اور کسی کا نہیں۔'' ۲۵

منظور اردو غزل کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔انہوں نے اردو غزل کے اساتذہ کا خوب مطالعہ کیا ہے۔لیکن وہ روایتی شاعری میں اسیر ہو کر نہیں رہتے بلکہ ان کی غزل اردو شاعری میں نئی وسعتیں پیدا کرتی ہیں۔موصوف کی غزلیہ شاعری نئی غزل کی بہترین مثال ہے۔ان کی غزلوں میں نئے احساس کی فراوانی ہے اور اس احساس کو ان کے اسلوب اور افکار میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔اگر چہ ان کے دیگر معاصرین یا تو روایت یا پھر جدیدیت میں الجھ کر رہ گئے ہیں لیکن حکیم منظور نے اپنی فکر کی بلندی اور گہری شعری بصیرت کے بل پر ایک درمیانی راہ اختیار کی ہے جس میں قدیم رسم ورواج اور جدید طرزِ احساس کی دلفریب آمیزش نظر آتی ہے۔انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہے اور یہی ان کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں سے الگ اپنی نئی پگڈنڈی پر چلنا پسند کیا جو آگے چل کر ان کی پہچان کا سبب بنی۔شمیم حنفی حکیم منظور کی غزل گوئی میں رویت اور جدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''شعری سطح پر ہمارا زمانہ مسلمات سے انحراف کے معاملے میں خاصا پُر جوش رہا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ رسموں اور روایتوں کی پاسداری کا سلسلہ بھی جاری ہے۔کچھ شاعروں نے ایک بیچ کی راہ یوں نکالی ہے کہ آزمودہ اور پرانے اسالیب اور نئے طرز احساس کا قصّہ اُن کے یہاں ساتھ ساتھ چلتا ہے۔حکیم منظور کی شاعری نئے اور پرانے رنگوں کی آمیزش کے سبب مختلف حلقوں کے لئے یکساں اپیل رکھتی ہے اور عام حد بندیوں کو قبول نہیں کرتی۔''

۲٦

جہاں تک حکیم منظور کی غزلوں میں موضوعات کا تعلق ہے۔اس سلسلے میں ان کا سب سے اہم اور توانا موضوع کشمیر اور کشمیریت ہے۔منظور اپنے مادر وطن سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔انہیں یہاں کے ذرے ذرے سے دیوانگی کی حد تک چاہت ہے جس کی بے شمار مثالیں ''ناتمام'' سے ''قلم زبان شگاف'' تک ہر شعری مجموعے میں ملتی ہیں۔انہوں نے اپنی غزلوں میں اس موضوع کو بہت ہی عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔وادی کشمیر قدرت کا ایک دلکش شہکار ہے۔منظور نے عالمی سطح پر کشمیر کی خوبصورتی کو مقامی تلازموں اور ترکیبوں کے سہارے سے غزل کی صورت میں جلوہ افروز کیا ہے۔ان کے کلام میں ایسے اشعار کی کثیر تعداد ہے جو کشمیر کی صدا بہار مقبولیت پر دال ہیں۔یہاں کے نظاروں اور بہاروں کی خوبصورت

تصویر کشی منظور اپنی غزلوں میں مخصوص انداز اور اسلوب میں کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

اہربل کی موج کا اپنا خرام اپنی ادا
سو گیا یہ بھی اگر ہمسر کہاں سے لایئے

تازہ دم نمکین چائے، کانگڑی ہنستی ہوئی برف
گل بو پہنچے پھر مدعا کیا پوچھنا

کانگڑی بستر میں رکھ کر کھڑکیوں کو وا کروں
برف گرنے کا کبھی میں یوں ہی نظارہ کروں

بکے ہیں کس لئے اخروٹ میرے سنگ کے بھاو
بس ایک بات فقط یہ میں پختہ کار نہ تھا

لگتے ہیں سب خوش سیب صورت آج بھی منظورؔ
کہ میں اپنے کسی عہدے شکستہ کا اعادہ ہوں

گہری ہوئی ہیں اور بھی ڈل کی خموشیاں
جہلم پر جو رواں تھی وہ گفتار سوگئی

اے میرے کشمیر آنکھوں میں تیری
میں سجاؤں عرش سے آگے کے خواب

مذکورہ بالا اشعار سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حکیم منظور کس حد تک وطن عزیز سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر پریمی رومانی ایک جگہ لکھتے ہیں:

"حکیم منظور کا موضوع خاص کشمیر رہا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں اس موضوع کو نہایت ہی سلیقے سے برتا ہے۔ اُن کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جس سے اس سرزمین کی خوشبو ٹپکتی ہے۔ وہ تازہ اور جاندار تراکیب اور علائم بروئے کار لانے کے قائل ہیں جن سے کشمیر کی سدا بہار تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ان کا اسلوب کشمیر کی بہاروں کی طرح خوشنما اور ملائم ہے۔" ۲۷

حکیم منظور نے اپنی ثقافت اور کلچر سے تادم حیات مضبوطی کے ساتھ رشتہ جوڑے رکھا ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے بیش بہا ورثے کو جان سے بھی عزیز رکھتے تھے۔ اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو اور اپنی تہذیب وثقافت کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر منظور نے اپنی غزلوں کے ذریعے متعارف کرایا ہے۔ شاعر جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس کو اپنے کلام میں ضرور منعکس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حکیم منظور کی غزلوں

میں اپنی ثقافت اور کلچر کی پیش کش کے لئے پروفیسر قدوس جاوید ان کی غزل کو سُخن ثقافت زاد کہتے ہیں۔ چنانچہ رقمطراز ہیں:

"حکیم منظور کی شاعری میں چمن ہو کہ چنار برف ہو کہ لہو اشجار، ڈل اور وُلر کی جاں گسل سکموں سے لیکر شفق کی نرم ٹھیکروں تک ہر جگہ اپنی زمیں اپنی ثقافت سے وابستگی کی ایک فطری حرارت رقصاں نظر آتی ہے۔ کشمیر اور کشمیری ثقافت کے بیان کے حوالے سے حکیم منظور کی غزل کو سخن ثقافت زاد قرار دینے کا جواز رولاں بارتھ (Rollan Barth) کے اس فقرے میں بھی ڈھونڈا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی (Geneune) فنکار خواہ کتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے اپنے معاشرے، اپنی ثقافت کی جانب سے آنکھیں بند کر کے عمدہ فن پارے کی تخلیق نہیں کرسکتا۔۔ حکیم منظور کے تخلیقی عمل میں اس کا (Cutural Passage) ایک اہم بلکہ کلیدی کردار ادا ہے۔اسی لئے حکیم منظور کی غزل کو سخن ثقافت زاد کہنا غلط نہیں ہوگا۔" ۲۸

جہاں ایک طرف منظور کشمیر کی خوبصورتی اور مناظر قدرت کی عکاسی اور اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی نمائندگی بہ زبان غزل کرتے ہیں۔ وہیں دوسری جانب کشمیر کے پُر آشوب حالات کی پیش کش میں بھی وہ پیش پیش رہے ہیں۔ وادی گذشتہ تیس چالیس برسوں سے جن خونین حالات سے گزر رہی ہے اس کی بھر پور عکس بندی اپنے اپنے انداز اور محسوسات کے مطابق یہاں کے ہر چھوٹے بڑے شاعر نے کی ہے۔ منظور جو کہ حد درجہ حساس ہیں، وہ ان ناساز حالات کو دیکھ کر خون کے آنسوں روتے ہیں۔ اپنے گردونواح میں روز افزاوں رونما ہونے والے حالات وواقعات کو منظور اپنی مخصوص لفظیات اور منفرد انداز میں شعری جامہ کچھ اس طرح پہناتے ہیں

خون تشنہ شام رو سیہ ،زخم آفتاب
پاؤں سے سرتک آنکھ کا منظر اُداس ہے
چنار چہرے ہیں ان کی کوئی زبان نہیں ہے
سلگ رہے ہیں پر کہیں دھواں نہیں ہے
ہیں گل بے صدا سو طرح کے جواز
ہیں اس شہر میں سنگ بھی بے صدا
خبر خبر ہے لہو عبارت، نظر نظر میں فساد کیا ہے

مجھے خبر کچھ نہیں ہوا کو شجر شجر سے عناد کیا ہے
میں کہوں کیسے مجھے معلوم ہے اس شہر کا منصف ہے کون

جسم تو محفوظ ہے منظور صاحب صرف سر ہے بے امان
تمہارے آموں پر کیا گزری جانتا ہوں

لہو ہیں اخروٹ میرے ،موسم کی سازشوں سے
موسم آنکھوں کی شفق کو بے سماں ہوتے ہوتے

میں نے دیکھا ہے چناروں کو دھواں ہوتے ہوتے
رستے عجب ہیں، راہی عجب، پیڑ عجب ہیں، پات عجب

میں جس شہر کا رہنے والا اس کے ہیں حالات عجب
لوگو لب کھولو کچھ تو بولو جہلم ہے مٹیا لا کیوں

میں نے جب اسے دیکھا تھا یہ تھا اک آئینہ سا
دھواں کہیں سے اُٹھے میں سوچوں جلا ہے کوئی چنار میرا

یہ خوف میراث میں ملا ہے یہی ہے اب اعتبار میرا

مذکورہ اشعار میں خبر خبر کا لہو ہونا، چناروں کا دھواں ہونا، اخروٹوں کا لہو ہونا، موسموں کی سازش کرنا، جہلم کا مٹیالا ہونا، خوف کا میراث میں ہونا، چناروں کا جلنا، سر کا بے اماں ہونا، منظر کا اداس ہونا، سنگ کا بے صدا ہونا، وغیرہ کے ذریعے حکیم منظور نے کشمیر میں رونما ہونے والے حالات کی دلدوز تصویر کشی کی ہے۔ ان کا دل وطن عزیز میں رونما ہونے والے قتل وغارت گری کے واقعات سے کس قدر رنجیدہ ہوتا ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے وطن اور قوم کی حالتِ زار دیکھتے ہیں تو بہت مایوس اور افسردہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے دل کے پیمانے میں یہ درد حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو وہ اس کو غزل کے ساغر میں انڈھیلتے ہیں۔ ڈاکٹر پریمی رومانی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''حکیم منظور نے اپنی غزلوں میں اس دور کا آشوب پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منظور کی شاعری میں عصر حاضر کے انسان کا درد و کرب کھل کر سامنے آیا ہے۔ اس درد و کرب اور ذہنی افسردگی کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری میں قوم پرستی اور وطن پرستی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس طرح کے احساسات اور خیالات انہوں نے جس انداز سے اپنی شاعری میں پیش کئے ہیں وہ قابل داد ہیں۔''[۲۹]

منظور کی غزلوں میں نہایت پاکیزہ اور عمدہ جذبات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ بنیادی طور پر جذبے کے شاعر ہیں۔ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے انہوں نے ایک منفرد انداز اختیار کیا ہے۔ کلام منظور میں قلبی واردات اور کیفیات کے ساتھ ساتھ معاملات عشق کی عمدہ اور نادر مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ان کا لہجہ دھیمہ ہے جس میں کشمیر کے پانیوں کی سی ٹھنڈک اور مٹھاس پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں اسلوب کی تازگی جذبات کی فراوانی اور فکر کی بالیدگی متاثر کن ہے۔ منظور اپنے جذبات پیش کرنے کا انوکھا انداز رکھتے ہیں جس میں بلا کی تاثیر موجود ہے۔ چند اشعار دیکھئے ۔

ہاں میں ہی کھردرا وہ سلیقہ پسند ہے
میں خود شناس ہوں وہ زمانہ پسند ہے

نہ دے سکا مجھے وسعت سمندروں کی مگر
سمندروں کا مجھے اضطراب دے کے گیا

تھا سفر بھی میرا اپنا اور راستہ بھی میرا
یعنی سچائی بھی میری تھی فسانہ بھی میرا

ہر سمت مرے صرف طلسمات طلسمات
میں ایک طلسمات مری ذات طلسمات

روٹھی ہوئی ہواؤں کے پیغام آئیں گے
پھر لوٹ کے پرندے سر شام آئیں گے

چنار آنگن میں سرمئی دن، شفق نظر میں خمار سارا
عجیب منظر تمام تر شک، کبھی کبھی اعتبار سارا

حکیم منظور اپنے جذبات کو اپنے اندر میں بیان کرنے پر زیادہ یقین رکھتے ہیں، جس سے ان کی فکر کی تازگی کو اور احساس کی شدت کو متاثر کن حد تک محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک شگفتہ لہجہ اختیار کرتے ہیں، جو بالکل ان کا اپنا ہے۔ جس کی بدولت وہ نہ صرف ریاست بلکہ بیرون ریاست کے ادبی حلقوں کو بھی متوجہ کرتے ہیں۔ جس کا اعتراف وہ اپنے ایک شعر میں کچھ اس طرح کرتے ہیں ۔

میں کہ تقلید کا پابند نہیں ہوں منظور
یہ غزل میری نئی سوچ کی تغیر کی تھی

کلام منظور میں فکری تازگی اور فنی بالیدگی کے پیش نظر پروفیسر گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:
''بہت عرصے کے بعد کشمیر سے غزل میں ایک ایسی آواز اُٹھی ہے جو فکر و

احساس کی تازگی اور اظہار کی صلابت و حلاوت سے دلوں میں گھر کرتی جاتی رہی ہے۔ ان کا ہنر اس میں ہے کہ وہ بظاہر سادہ گو معلوم ہوتے ہیں لیکن بہ باطن معنی آفرینی اور تہہ داری کا حق بھی ادا کر جاتے ہیں۔'' ۳۰؎

حکیم منظور نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو غزل کی زبان دینے کے لئے لفظیات کا ایک مخصوص نظام بروئے کار لایا ہے، جس میں اس عہد کے مروجہ الفاظ، علامات تراکیب کے علاوہ اپنی زمین سے جڑی ہوئیں بے شمار ترکیبوں اور اضافتوں کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے۔ حکیم منظور کی غزلوں میں معنی آفرینی کو کشمیری تلازموں سے نئی وسعتیں ملی ہیں۔ جس کی بدولت ان کے اشعار میں مقامیت کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ منظور نے کبھی بھی رعایت لفظی کو اپنا شعار نہیں بنایا ہے۔ وہ ہمیشہ الفاظ کی جگہ افکار کو ترجیح دیتے ہیں، جس کی بدولت ان کی غزلوں میں منفرد تخلیقی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ منظور بصارت سے زیادہ بصیرت، علم سے زیادہ تجربے، مطالعے سے زیادہ مشاہدے کے قائل ہیں۔ جس کی بدولت ان کے کلام میں تہہ داری اور معنی آفرینی میں اضافہ ہوا ہے۔ کلام منظور میں جو الفاظ، تراکیب، استعارات اور علامات کلیدی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کا استعمال متعدد مرتبہ ہوا ہے، ان میں برف زاد، شہر گماں، چنار چہرے، دھوپ لہو، دھوپ بدن، سراپا جمال، درونِ جسم، صبح آتش پا، سیب شگوفے، سنگ ہوا زاد، قلم گریزاں، برف نم، لہو شجر، پھول نظر، آسمان تختی، چپ آنگن، پھول قبا، شاخ ثمر، گجر ساعتیں، برف رُت، شفق تلاوت، صبح شفق، شام شفق، شفق رنگوں، پیاسی ہوا، شفق سراب، سایہ شجر، شفق زاد، سیب صورت، لہو عبارت، پھول بستر، سنگستان، موسم سنگ، سورج امکان وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مذکورہ الفاظ علائم اور تراکیب کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مجھے لگتے ہیں خوش سب سیب صورت آج بھی منظور
کہ میں اپنے کسی عہد شکستہ کا اعادہ ہوں

حاصل اس ایک رنگ کا چشم پُر آب ہے
اب سایہ برف زاد کا سرد آفتاب ہے

اہرہ بل کا کتنا پانی بہہ گیا
کون سنگستان سے یہ پوچھے کہو

کس لئے اخروٹ کے چھلکوں سے رستا ہے لہو
کون رکھتا ہے یہاں اس کی خبر میرے سوا

چھپا کے خود کو کہیں رکھ نہ پائے گی خوشبو

کہ برف جب بھی گرے مجھ تک آئے گی خوشبو
ذراسا مطمئن ہوتا چناروں میں ہے دم باقی
میں ان کے نام گروی جان کیا پنی انا رکھتا
شفق بدن بے قرار، ہرلمس خواہشوں سے
میں تنگ آیا ہوں اپنے دل کی نوازشوں سے

حکیم منظور کے کلام میں جو لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ وہ ''برف'' ہے۔ موسمِ سرما میں وادی کشمیر کے طول وعرض میں برف باری کم یا زیادہ ہر سال ہوتی ہے۔ برف گرنے کا موسم قابل دید ہوتا ہے۔ برف پوری وادی کو سفید چادر میں لپیٹ لیتی ہے۔ جو ایک خوش نما نظارہ پیش کرتی ہے۔ حکیم منظور کو برف کے ساتھ بہت ہی زیادہ انسیت رہی ہے۔ اس مناسبت سے بعض مفکرین انہیں برف رتوں کا شاعر بھی کہتے ہیں۔ انہوں نے برف اور برف سے متعلق متعدد الفاظ اور تراکیب وضع کیں ہیں۔ جو کہ اردو غزل میں ایک اہم اور نادر اضافہ ہے۔ یہاں تک کہ ان کے چند شعری مجموعوں ''برف رتوں کی آگ، برف آفتاب، سخن برف زاد'' کے ناموں سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برف کے ساتھ ان کی دلی وابستگی کس حد تک رہی ہے۔ برف سے متعلق تراکیب میں'' برف بدن، برف رُت، عالی برف، برف زاد، خون برف، برف شب، برف زاروں، برف نواح، برف بے قلم، برف تن اشجار، برف سمندر، سلگتی برف، برف آزار سناٹے، برف ملبوس، برف شگوفے، برف آشنا، برف نم وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس حوالے سے چند اشعار دیکھئے:

بارش بلا کی برف بدن بھی نہ تر ہوا
سایا کہ مستِ خواب رہا بے شجر ہوا
وُلر آبدیدہ ہے جہلم اُداس
سبب صرف بے لمس تاثیر برف
میرا بس چلے برف زاروں کے بیچ
بناؤں میں کوئی مکاں دھوپ کا
برف بے قلم کب تک میرے رنگ لکھے گی
چاہتا ہوں اک شعلہ آسماں بھر رکھوں
دعا میرا جہلم نہ سوکھے کبھی
دعا برف کی ہے دعا برف کی

قرطاس گل مرگ پہ جب سوچا اک منظر لکھوں
یا بارش ہی بارش برسی یا پھر خالی برف گری
ہر صنوبر پر شفق فریاد لکھی جائے گی
برف قلموں سے نئی روداد لکھی جائے گی

برف کے ساتھ ساتھ دھوپ خوشبو اور چنار ایسے الفاظ ہیں جو کلام منظور میں کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان الفاظ کو مختلف اوقات میں موصوف ظاہری معنوں کے ساتھ ساتھ علامتی معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ جس کی بدولت ان کے کلام میں معنی آفرینی اور افہام وتفہیم کی گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے ۔

جب بھی دشت آنگن میں صبح گنگنائے گی
دھوپ اور چمکے گی ریت مسکرائے گی
موسم آنکھوں کی شفق کو بے سماں ہوتے ہوئے
میں نے دیکھا ہے چناروں کو دھواں ہوتے ہوئے
جس کی خوشبو سے نو آسودہ ہوتے ہیں گلاب
میری بستی پر ابھی جاگا نہیں وہ آفتاب
پاس منظور ہے خوشبوؤں کا خرمن لیکن
اس خزانے کے خریدار کہاں سے آئیں؟
چنار چہرے ہیں ان کی کوئی زبان نہیں ہے
سلگ رہے ہیں پر کہیں دھواں نہیں ہے
چھپا کے خود کو کہیں رکھ نہ پائے گی خوشبو
کہ برف جب بھی گرے مجھ تک آئے گی خوشبو
کس نے توڑے میرے آئینے کہو!
گم چناروں کے ہیں کیوں سائے کہو!

حکیم منظور کی غزلوں میں ان خوش نما اور وسیع المانی تراکیب اور علائم کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جناب مسعود منور یوں رقمطراز ہیں:

''حکیم منظور کی غزلیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کی جڑیں اپنی زمین میں بہت گہری ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ارض سیب کی اخروٹ نکہتوں، سکوت

برف شمی، نزول آفتاب، برف ملبوس، برف کا بستر، سلگتی برف جیسی تراکیب وضع کر کے جہاں اپنے مقامی رنگ کو نمایاں کیا ہے وہاں غزل کے پیکر کو ایک تازہ تر، ایک بالکل منفرد، ایک غایت درجہ انوکھا ملبوس بھی دیا ہے۔ اور وہ اپنے اس رویے کی بنا پر اپنے ہم عصروں میں بالکل علیحدہ دکھائی دیتے ہیں۔'' [۱۳]

حکیم منظور اپنی غزلوں میں خیال آفرینی اور معنی آفرینی کو ملحوظ رکھتے ہوئے بسا اوقات ہندی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ جس سے ان کی غزلوں میں معنوی وسعتیں بڑھ جاتی ہیں۔ انہیں اردو کے علاوہ ان زبانوں پر بھی اچھا خاصا عبور حاصل رہا ہے۔ اس سلسلے میں چند شعر ملاحظہ ہوں: ؎

ہے لاکھوں بولتے رنگوں کا درپن
پھرن پہنی ہوئی پریوں کا آنگن
بجز جذبات کے منظور آخر
کرے گا اے قلم کیا تجھ کو ارپن
نادر منی کا رقص ابھی تک کہاں تھا
نادر منی کے ساتھ شنکر ہے رقص میں
آئے گا بادشاہ میرا اسپ نور پر
فی الحال شب سیاہ سمندر ہے رقص میں
میری چلتی اگر میں بے جان راستوں کو
ولر کے آب میں گوندھی ہوئی اک آتما دیتا

منظور نے غزل میں ہئیتی اور لسانی اعتبار سے بھی نئے تجربے کیے ہیں۔ انہوں نے بعض غزلوں میں دو دو ردیفیں اور دو دو قافیوں کا التزام کیا ہے۔ اور کچھ غزلوں میں سوال جواب کا مکالماتی انداز بھی اپنایا ہے جو بہت ہی انوکھا تجربہ ہے۔ اس نئے اور نرالے تجربے سے اردو غزل میں ہئیتی اعتبار سے نئی وسعتیں اور نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ جس میں منظور کی انفرادی شان مضمر ہے۔ وہ غزل کی روایتی ساخت کو پوری طرح بدلنا نہیں چاہتے ہیں البتہ اس میں کسی حد تک نیا پن دیکھنا چاہتے ہیں۔ منظور کی غزل کی یہ ساختیاتی ندرت دل کو چھو لیتی ہے اور ان کی فکری و فنی بالیدگی کا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ منظور کا یہ انداز توجہ طلب ہے کیونکہ اردو غزل جیسی ہیتی صنف میں اس قسم کا بدلاو مستقبل میں نئے در وا کر سکتی ہے۔ اس نئی

ہئیتی کے چند اشعار دیکھئے:

سوال: کیا حرف ابتدا تھا؟ جواب: اب یہ سوال کیا ہے؟
سوال: میں حرف آشنا ہوں؟ جواب: تیرا خیال کیا ہے؟

وہ مسافت راستوں کے راستے سونے لگے
وہ سماعت پھول لفظوں کے بدن دکھنے لگے

دعا! کہ پرواز کی حدوں میں کہیں کوئی آسمان نہ آئے
دعا کہ ہاتھوں میں بزدلوں کے کچھ آئے لیکن کمان نہ آئے

تسلیم آنکھ آنکھ خیابان چاہنا
تقدیم! رنگ رنگ کا وجدان چاہنا

میں اگر لکھتا کہ شاداب ہے ویری ناگ جہلم کا حریف
تم جواباً لکھتے ایسا ہو کبھی تم نے چاہا نہ تھا

منظور کی غزلوں میں اس نئے نظام اور استفامیہ انداز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پروفیسر قدوس جاوید اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حکیم منظور کے یہاں غزل کی خارجی ہئیت اور فنی و جمالیاتی نظام کو توڑنے، بدلنے اور ان کے امکانات کو وسیع کرنے کی کوششیں بھی ملتی ہیں۔ان کی غزلوں میں سوال و جواب، دعا اور اصطلاحات کی تعبیر کے حوالے سے جو ہئیتی لسانی اور تخلیقی رویئے اپنائے گئے ہیں وہ غزل کی مروجہ ساخت میں بدلاو کا سبب تو بنتے ہی ہیں ساتھ ہی استغراقی قرآت کے نتیجے میں ان کی غزلوں میں موجود نئی فکری اور جمالیاتی ابعاد بھی کھل کر اشعار کے تاریخی، ثقافتی، مذہبی، علمی اور فلسفی التباسات کو بے نقاب کرجاتے ہیں۔''

۳۲

منظور کے اس اندازِ شعر، فنی بصیرت اور ہیتی تجربے کے پیش نظر محمد یوسف خان عادل رقمطراز ہیں:

''استفسارانہ اور استفہامیہ انداز اور لب ولہجہ میں بات کرنا ان کا خاصا ہے۔ وہ الجھی ہوئی صورتحال کو سوچنے اور سلجھانے کے عمل سے فکری بنا پر اس طرح قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ استفہام گاہے گاہے خود جواب

آپ بن جاتا ہے گویا وہ ان کہی بات سے ہی جواب اخذ کرتے ہیں۔''

۴۳

شعری وسائل کے استعمال میں بھی منظور نے کمال دکھایا ہے۔ جہاں انہوں نے تشبیہات، تضاد اور دیگر شعری صنعتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے وہیں صنعت تلمیع کو انہوں نے بہت ہی معنی خیز انداز میں برتا ہے۔ جس سے ان کی علمی بصیرت اور تاریخی آگہی کا پتہ چلتا ہے۔ موصوف، شاعری کے علاوہ دیگر علوم کی کتب کا مطالعہ بھی گہرائی اور گیرائی سے کرتے رہے ہیں۔ خصوصاً اسلامی تاریخ کی کتابیں ان کی دلچسپی کا خاص مرکز رہی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں صنعت تلمیع کا استعمال متعدد اشعار میں ہوا ہے۔

اب کے میرا کعبہ دل دشمنوں کی زد میں ہے
پھر مدد کرنا ابا بیلوں کے لشکر بھیجنا

بس ایک فرق کر بے ہاتھ کم ہنر سارے
بزعم خود تو میرے دور میں بھی آذر ہیں

کہانیاں جن کی خون میں ہوں وہ بچے کیا میری سمجھیں
میں اس پری کو کہاں سے لاؤں کہ جو ابھی کوہ قاف میں ہے

آب حیات خود ہی جو پی کر امر ہوا
اس خضر سے کہیں تو ملاقات چاہیئے

آنگن آنگن قاف کی پریاں کیوں اُتریں گی
آپ بجا ہیں لیکن میں نے دعا مانگی تھی

فرات نام بدلتا ہے کربلا ہے وہی
وہی ہے پیاسوں کا سانحا ہے وہی

منظور نے اپنی شاعری میں ردیف اور قوافی کے انتخاب میں بھی جدت طرازی سے کام لیا ہے ان کی بیشتر غزلوں میں نئی نامانوس ردیفیں اور قوافی ملتی ہیں۔ جو انہوں نے خود وضع کیں ہیں جس سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور ذہنی اپچ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تاثیر برف، تقدیر برف، شفیق سا، عمیق سا، سرمائی تمام، شرمائی تمام، آئینے کہو، چہرے کہو، دفتر دیدنی تھا، منظر دیدنی تھا، خواہشوں سے، نوازشوں سے، آنکھوں کی دھوپ، سایوں کی دھوپ، پھولوں کا شہزادہ، خوشبوؤں کا شہزادہ، ساعتوں کا، رفاقتوں کا، دعا برف کی، صدا برف کی، ردا برف کی، نیا دستخط، ہوا دستخط، اعتکاف میں ہے، انکشاف میں ہے وغیرہ

ان کی غزلوں کے چند قافیے اور ردائف ہیں۔

وزن اور بحور کے انتخاب میں بھی منظور نے روش عام سے ہٹ کر اپنی شرطوں پر چلنے کو ہی ترجیح دی ہے۔ چھوٹی بحروں پر کامل دسترس رکھتے ہیں، لمبی اور طویل بحروں کو برتنے میں بھی اچھی گرفت رکھتے ہیں۔ لیکن اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کیلئے موصوف نے بعض ایسی بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں جن کا استعمال بہت کم شعراء نے کیا ہے۔ منظور نے ان انوکھی اور سنگ لاخ زمینوں میں بھی مترنم غزلیں کہی ہیں۔ جن سے صنف غزل پر ان کی غیر معمولی دسترس اور والہانہ شغف کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

وہ جو اس کے صحرا کا باغ ہے وہ کبھی پھلے گا نہ بے لہو
اسی ایک وجہ سے چاہیے اسے سر مگر کسی اور کا

میری گل پوجا میں شبنم جل کی ساری خوشبوئیں تھیں
خندہ زن پاگل ہوا کتنی تھی اس شائستگی پر دیدنی تھا

ایک تمنا بادل کی ہو مجھ پر مروت تھوڑی سی
ایک دعا ! ان دریاوں پر گزر نہ جائے میری سی

حکیم منظور غزل میں لفظ و معنی کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر کو پیش کرنے کا ایک شائستہ تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔ کلام میں لفظ و معنی کی اہمیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بعض ناقدین الفاظ کو زیادہ اہم قرار دیتے ہیں اور بعض معنی و مطالب کو ترجیح دیتے ہیں۔ حکیم منظور الفاظ کی دلکش ادائیگی کے ساتھ ساتھ معنوی تہہ داری کے بھی قائل ہیں۔ اگر چہ وہ نئے الفاظ اور تراکیب وضع کرنے کا شوق بھی رکھتے ہیں لیکن شعر میں معنی کی اہمیت پر آنچ نہیں آنے دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ کو بروئے کار لانا چاہیے جن سے معنی و مطالب کے دریا بہہ جائیں۔ منظور کے نقد شعر اور لفظ و معنی کی اہمیت وافادیت کو سمجھنے کے لئے ان کی غزلوں کے چند اشعار دیکھئے۔

شکستہ لفظوں کو منظور دوں نئے معنی
میرے قلم کے شریعت میں اجتہاد تمام

میرے شعروں کو سن کر اے منظور
لوگ کرتے ہیں اپنے آپ سے بات

تہہ در تہہ معنی کا دفتر میری غزل
ہر منظر کی آنکھ کا منظر میری غزل

پیش اس کے تھا تنفس الفاظ دیدنی

اظہار ایک پیرہن بے طریق سا
وہ حروف یعنی میں جسے لکھتا ہوں رات دن
معنی سے ہوسکا ہے نہ آسودہ حال کیوں

بہرکیف حکیم منظور کی غزل کشمیر میں اردو غزل کی توانا آواز ہے۔انہوں نے نہ صرف ریاست بلکہ ملک کے طول وعرض میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کو ان کی غزل میں اظہار کی توانائی اور جذبے کی حلاوت نظر آتی ہے۔تو مشفق خواجہ انہیں روش عام سے ہٹ کر چلنے، اپنے ماحول کی خوبصورت عکاسی کرنے اور خود وضع کردہ لفظوں کو نئے معنی عطا کرنے والے شاعر مانتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالمغنی ان کو فکر، تجربے اور احساس کے منفرد شاعر تسلیم کرتے ہیں۔مظہر امام کا ماننا ہے کہ منظور کی غزل جدید فکر اور طرز احساس سے آمیز ہو کر دو آتشہ ہوگئی ہے۔شمیم حنفی کو ان کی غزل میں نئے اور پرانے رنگوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔اسی طرح محمود ہاشمی کو حکیم منظور کی غزلوں میں ذات، کائنات اور شخصیت کے درمیان منقسم خلاؤں کو یاد کرنے اور ایک تلمیلی شخصیت کی تلاش کا منظر نامہ پیش کرنے کی خوبی نظر آتی ہے۔

آج حکیم منظور ہمارے بیچ موجود نہیں ہیں۔ان کا انتقال ۲۱ دسمبر ۲۰۰۶ء میں ہوا ہے لیکن جو ادبی سرمایہ انہوں نے ہمارے لیے یادگار چھوڑا ہے۔اس کی بدولت وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ اور تابندہ رہیں گے۔ان کی غزل گوئی نے ریاست جموں وکشمیر میں اظہار وپیش کش کے نئے در وا کیے ہیں۔ریاست کے نوجوان شعراء کی کثیر تعداد نے ان کی حیات کے دوران اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے کلام سے بڑا فیض حاصل کیا ہے۔ریاست کو ایسے خوش فکر غزل گو شاعر پر ہمیشہ ناز رہے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہمدم کاشمیری

اُردو دنیا میں ہمدم کاشمیری کے نام سے پہچانے جانے والے شاعر کا اصلی نام عبدالقیوم خان ہے۔جو ۶ نومبر ۱۹۳۷ء کو سرینگر کے محلّہ شہید گنج میں ایک متوسطہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔والد محترم کا نام نور محمد تھا۔جو تجارت کا کام کرتے تھے۔سرینگر کے مقامی گورنمنٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد سرکاری محکمہ آرٹس ایمپوریم میں ملازم ہوگئے۔تعلیم کا سفر ظاہری طور پر یہی سے منقطع ہوگیا لیکن ذاتی طور پر کتب بینی کا سلسلہ جاری رکھا۔کم عمری سے ہی شعر وشاعری کی طرف راغب ہوگئے اور بہت جلد شعر موزوں کرنے لگے۔کلاسیکی شاعری کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔مطالعے کا شوق آج بھی برابر برقرار ہے۔اُردو شعر وادب کی وادی میں ۱۹۶۰ء کے آس پاس وارد ہوئے۔یہ دور چونکہ جدیدیت کا ابتدائی دور تھا لہٰذا انہوں نے بھی اس نئے رنگ سے ہی اپنا تخلیقی سفر شروع کیا ہے۔ریاست سے شائع ہونے والے

معتبر رسائل ''شیرازہ'' اور ''تعمیر'' میں ان کا کلام شائع ہونے کے علاوہ ملک کے نامور رسائل جیسے ''پکڈنڈی'' امرتسر ''صبا'' حیدرآباد ''نگارش'' امرتسر ''شاعر'' ممبئ ''شب خون'' الہ آباد وغیرہ میں بھی تواتر کے ساتھ چھپنے لگے۔ یوں ان کی شہرت ملک کے طول وعرض میں پھیلنے لگی اور بحیثیت ایک جدید غزل گو شاعر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ گذشتہ ۵۰۔۶۰ برسوں سے اُردو شاعری کی خدمت انجام دیتے آرہے ہیں۔ لیکن اپنے کلام کی اشاعت میں تساہل سے کام لیا ہے۔ کیونکہ ان کا پہلا مجموعہ ۲۰۰۳ء میں ''دھوپ لہو کی'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور دوسرا مجموعہ ''ورق سادہ'' ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ موصوف نام ونمود سے بڑی حد تک اجتناب کرتے ہیں اور اپنی تشہیر کرنا بھی انہیں پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام متوقع وقت کے بعد شائع ہوا۔ اس حوالے سے عرفان صدیقی لکھتے ہیں:

''دھوپ لہو کی'' ہمدم کاشمیری کے کم وبیش چالیس برس پر محیط شعری سفر کا ماحصل ہے۔ کسی ایسے شاعر کے لئے جس کی تخلیقات ۱۹۵۸ء سے ملک کے وقیع ادبی جریدوں میں شائع ہوتی رہی ہوں اور اچھی اور سچی شاعری کے قدر شناسوں کی توجہ اور تحسین حاصل کرتی رہی ہوں، پہلے مجموعے کی اشاعت میں تقریباً چار دہائیوں کا وقفہ باعث تعجب ہوسکتا ہے لیکن جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس تاخیر یا تکلف میں ان کے مزاج کی درویشانہ اُفتاد اور تشہیر سے گریز کا بھی دخل ہے اور ان کے اس تخلیقی رویے کا بھی کہ وہ تجربے اور وارِدات کو اپنے اندرون میں پوری طرح جذب کئے بغیر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ ان تمام برسوں میں اپنے کلام اور اب اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت میں ان کا یہی روّیہ کارفرما رہا ہے''۔ ۳۴

ہمدم کاشمیری نے اپنی اس سُبک افتادی کے باوجود اپنی شناخت اُردو غزل کی دنیا میں مستحکم کی ہے۔ وہ اپنے نئے لہجے اور سادہ انداز کی بدولت ادبی حلقوں میں اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جس کے لئے انہوں نے کوئی غیر ادبی طریقہ اختیار نہیں کیا۔ جس کا رواج ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں اکثر پایا جاتا ہے۔ ہمدم اپنے فن کی بناء پر اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ اس امر کی طرف شمس الرحمٰن فاروقی ایک جگہ یوں اشارہ کرتے ہیں:۔

''ہمدم کاشمیری نے خاموشی سے اپنی جگہ بنالی ہے۔ جوڑتوڑ اور دوستوں سے فائدہ اُٹھانے بلکہ انہیں استعمال کرنے کا جو کلچر آج اُردو تہذیب پر کم وبیش چھایا ہوا ہے، ہمدم کاشمیری اسے بالکل الگ ہیں۔ مجھے ان کی یہ بات اس

لئے بھی اچھی لگتی ہے کہ اس طرح ان کی غزل کا توانا اور غیر منفعل بالکل سچا اور داخلی شخصیت کا اظہار معلوم ہوتا ہے''۔ ۳۵

ہمدم کاشمیری خالص غزل کے شاعر ہیں۔انھیں اپنے تجربات اور محسوسات کو دیگر اصناف سخن کے بہ نسبت غزل کے سانچے میں ڈالنا ہی زیادہ راس آتا ہے۔ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔ جدید غزل کے نمائندہ شعراء میں ہمدم بھی ایک اہم نام ہے۔انہوں نے جدید غزل کے بنیاد گزاروں ناصر کاظمی، مجید امجد، عزیز حامد مدنی، منیر نیازی، شکیب جلالی، بانی، ظفر اقبال وغیرہ کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان شعراء کے کلام کی روشنی کی بدولت ہمدم کے فن میں نکھار پیدا ہو گیا۔اس کے علاوہ ہمدم کاشمیری کلاسیکی شاعری پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔موصوف عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے جذبات کو برتنے میں فنکارانہ مہارت رکھتے ہیں۔اس کے لئے وہ پرانے الفاظ کا سہارا بھی بعض مقامات پر نئے مفہوم کے ساتھ لیتے ہیں۔ ہمدم کے کلام کے مطالعے سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ وہ اپنی بات کے لئے پیچیدہ پیرائے کے بجائے سادہ لہجے اور انداز بیان کو پسند کرتے ہیں۔ان کے اسلوب میں کشمیر کے پانیوں کی ٹھنڈک اور شفافیت پائی جاتی ہے۔اس سادگی کی بدولت ان کی غزلوں میں تازگی اور شدت تاثر پیدا ہوئی ہے۔جدید غزل کے متنوع موضوعات کو ہمدم کاشمیری اپنے محسوسات اور تجربات کے مطابق نرماہٹ اور شگفتگی کے ساتھ کچھ اس طرح شعری لباس پہناتے ہیں:

آج بھی مشکل میری آسان ہوگی دیکھنا
در نکل آئے گا کوئی پھر کسی دیوار سے

زیر لب بھی نہ کچھ کہا جائے
بے زبان کیوں ہوں ہم زبانوں میں

میرے اندر رہے اک خلا موجود
اور خلا میں ہے بس ہوا موجود

وہ گھر میں ہے مگر پوچھو تو گھر میں بھی نہیں ہے
مکاں میں بھی کسی کی لامکانی دیکھتا ہوں

مجھے یقین ہے کہ میں بے گناہ ہوں لیکن
سنائی دیتی ہے زنجیر کی صدا سائیں

کون زندہ ہے مر گیا ہے کون
اب یہاں کوئی پوچھتا ہے کہاں

روح کو لے کے کہیں دور نکل جاؤں گا
جسم ہوگا نہ میرے پاس لبادہ ہوگا

اکیلے پن کی سزائیں بھگت رہا ہوں بہت
مجھے ڈراتے ہیں میرے مکان کے سائے

ہمدم کاشمیری کے کلام سے لئے گئے ان اشعار سے ان کے موضوعات اور اسلوب بیان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، موصوف کی غزلوں میں ایسے اشعار کی کثرت موجود ہے۔ جو ان کے منفرد لہجے اور انداز بیان میں جدت اور ندرت کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں، ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ زندگی کے مختلف اور متنوع تجربات اور واردات کو بڑی آسانی کے ساتھ اپنی مخصوص اور خوبصورت لفظیات کی بدولت شعری پیکر عطا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ہمدم صنف غزل کی فنی باریکوں اور دیگر لوازمات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ کسی بھی موضوع کو فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ شعری سانچے میں منتقل کرنے میں ہمدم کامل دسترس رکھتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو اپنے لہجے اور منفرد طرز بیان میں پیش کر کے ایک سحر انگیز فضا قائم کرتے ہیں۔ عرفان صدیقی ہمدم کی غزل گوئی کی اسی انفرادی شان کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جدید غزل کے عنوان سے پہچانی جانے والی غزل کا سلسلہ عموماً چھٹی دہائی کے آغاز سے قائم کیا جاتا ہے اور ہمدم نے اسی دور کے ابتدائی حصّے سے اپنی غزل کا ایک نیا اور تازہ لہجہ اختیار کیا۔ ہمدم کاشمیری کی شاعری کے مطالعے سے طرز فکر اور پیرائے اظہار دونوں سطحوں پر اُن کے انفرادی عناصر نمایاں ہوئے ہیں۔ اسلوب میں ان کی تازہ کاری الفاظ کی قوت مناسب اور معنویت سے اُن کی گہری آشنائی، غیر پیچیدہ اور شفاف بیان اور خوبصورت تہہ دار ترکیبوں کو برتنے کے سلیقے سے عبارت ہے تو فکر و احساس کے زاویئے سے یہ شاعری اپنے تخلیقی ردّ عمل کی ندرت اپنی انسانی دردمندی اپنے گداز اور صداقت سے متاثر کرتی ہے۔ ان کا مخصوص انداز ہم عصر غزل کی نمایاں لفظیات کے اشتراک کے باوجود دوسروں سے جدا پہچانا جا سکتا ہے اور یہ انداز و ترکیب کی بلند آہنگی سے زیادہ محسوسات کی شدت پر قائم ہے"۔ ۳۶

ہمدم کاشمیری کی غزل کے اہم موضوعات دیگر ہمعصروں کی طرح تنہائی، لایقینیت، بے چینی،

بے چارگی، اجنبیت، محرومی وغیرہ ہیں، لیکن ان کے یہاں ایسے موضوعات کو برتنے کا الگ اور منفرد انداز ہے۔ وہ بیش تر جدید غزل گو شعراء کے برعکس ابہام اور لفظی بازی گری سے اجتناب کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں عصری حسیت کو سادگی اور سلاست کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں نہایت سلجھے ہوئے الفاظ میں بڑے سے بڑا تجربہ بھی خوبصورت اور انوکھے انداز میں جلوہ افروز ہوتا ہے، جس سے ان کی غزل میں تازگی اور توانائی پیدا ہوگئی ہے۔ ہمدم کی غزلوں میں سادہ بیانی سے معنی آفرینی میں اضافہ ہوا ہے۔ سہل اور عام فہم الفاظ کی درو بست کے سہارے ہمدم کاشمیری عصری موضوعات کو اپنی غزلوں میں کچھ اس طرح سموتے ہیں۔

تمہاری یاد میں آباد جسم و جاں میرے
تمہارے ذکر سے ہے میری داستان آباد
میری ہی داستان لکھی تھی ورق ورق
میرا ہی کوئی ذکر کسی بات میں نہ تھا
پھڑ پھڑ انے کی آرہی ہے صدا
کون بے چین ہے بدن میں بہت
بکھرا بکھر سا ہے وجود اپنا
صرف تنکے ہیں آشیاں ہیں کہاں
مجھے تلاش کرو مجھ سے گفتگو کر لو
میں اپنے حرف میں اپنے بیاں میں رہتا ہوں
میرے اطراف میں مصروف ہیں سب
کہوں کیا میں بھی کیا کیا سوچتا ہوں

ہمدم کاشمیری فکر کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر کی گہرائی اور گیرائی کے بے شمار پہلو موجود ہیں۔ وہ زندگی اور متعلقات زندگی کے بارے میں مسلسل غور وفکر میں محو رہتے ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسکی عکاسی اپنی غزل میں بڑی بے ساختگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور استعمال میں بھی ہمدم کاشمیری کو کمال حاصل ہیں۔ اُن کی زبان جدید غزل کو برتنے میں ایک نمایاں آلہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ الفاظ اور تراکیب کو پورے غور وفکر اور موقع ومحل کی مناسبت سے استعمال میں لاتے ہیں جس سے اُن کی غزلوں میں فکری تہہ داری، معنی آفرینی اور بلند خیالی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے خیالات میں وسعت اور احساسات میں شدت کو ان کی غزلوں میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ زمانے کے نشیب

وفراز کو مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمدم کاشمیری کی شاعری قاری کو سوچنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اب یہاں کس سے کرے کوئی شکایت ہمدمؔ
شہر اپنا ہے ،جنون اپنا ہے ،پتھر اپنے
ہر اک سمت یہاں صرف پیاس بہتی ہے
کبھی جو غور سے آبِ رواں کو دیکھتا ہوں
حقیقتوں کا کبھی سامنا ہوا ہی نہیں
کہیں پہ خواب کہیں پر سراب دیکھے ہیں
میں سوچتا ہوں کبھی کانپ اُٹھتا ہوں
وہ اعتراف جو پایانِ کار کرتا ہے
یہ کیسی شام ہے جلتے ہیں منظر
نگاہوں کا ٹھکانا سوچتا ہوں
کوئی سجدہ ادا ہوا نہ کبھی
بس جبیں پر یشان لکھا ہے
رنگ سارے ہیں تیری باتوں میں
صرف اک رنگِ معانی کم ہے

ہمدم کی غزلوں کا موضوع خاص کشمیر رہا ہے۔ وہ اپنے وطن اور اہل وطن کے حالات وواقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ ہمدم کا وطن گذشتہ پچیس تیس برسوں سے جس صورت حال سے نبرد آزما ہے اس سے ہر کس وناکس متاثر ہوا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ احساس فن کار کو ہوتا ہے۔ گذشتہ کچھ عرصے سے عرض جنت میں انسانی حقوق کی پامالی کی جو انتہا روا رکھی گئی ہے اس کی شاید ہی دنیا میں کوئی نظیر ملے۔ اہل کشمیر خوف ودہشت ،عدم تحفظ ،لایقینیت ،محرومی وناکامی ،مایوسی وناامیدی کی زندگی گزارنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت حال سے گزرنے والے شاعر ہمدم کاشمیری اپنے جذبات کا پر درد اظہار کبھی علامتی اور استعاراتی تو کبھی بیانیہ انداز میں کچھ اسطرح کرتے ہیں۔

طلوع ہو نہ سکی روشنی نگاہوں میں
یہ کس نے وادیٔ جاں کو دھواں بنایا ہے
ہر سمت ہے سکوت کا سایہ بجھا ہوا

غارت ہوئی ہے رونق بازار شہر میں
دھویا نہیں گیا جو کسی بر شگال میں
میری زمین پر وہ لہو کا نشان تھا
کوئی شعلہ چنار سے نہ اُٹھا
زرد اشجار ہوگئے کیسے
میرا بدن تمام زخم ہے مگر یہ سوچیے
مرا لہو رواں ہو ا ہے کس گلاب کے لئے
چار سو کچھ دھواں سا پھیلا تھا
جب بھی نکلا میں اپنے کمرے سے
ہر طرف آس کے شعلے ہیں رواں
کیا کہوں کون سا گھر مرا ہے

مذکورہ اشعار سے روشنی کا طلوع نہ ہونا' وادی جاں کو دھواں بنانا، سکوت کا سایہ بجھا ہونا، رونق بازار کا غارت ہونا، لہو کا نشان برشگال سے نہ دُھلنا، اشجار کا زرد ہونا، بدن کا زخمی ہونا، گلاب کے لئے لہو کا رواں ہونا، چار سو دھواں پھیلنا وغیرہ ایسے الفاظ و علائم ہیں جو کشمیر کی وادی کے پر آشوب حالات کا روح فرساں منظر نامہ پیش کرنے میں ہمدم کا بھر پور ساتھ دیتے ہیں۔ ہمدم کاشمیری انسانیت کا خون ہوتا ہوا اور معصوم اور بے گناہوں کا قتل ہوتا ہوا خود دیکھتے ہیں۔آئے دن کشمیر میں قتل و غارت گری، خون ریزی، افراتفری کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔جس سے عام انسان کی زندگی بہت ہی دشوار گزار ہوتی ہے۔ ایسے ماحول اوران حالات میں سانس لینے والے شاعر ہمدم کاشمیری کا دل تلملا اُٹھتا ہے اور وہ اپنے مجروح جذبات کو اپنے نوک قلم سے لہو کی سیاہی میں ڈبو کر کچھ یوں شعری پیکروں میں ڈالتے ہیں۔

کہاں کہاں نہ ہوئیں خوں سے تربتر آنکھیں
جہاں بھی عرصۂ ناسازگار تھا ، میں تھا
دیواروں سے سر ٹکرا کر
اپنا سوگ منایا ہم نے
بستی میں کوئی قتل ہوا جب
گھر میں شور مچایا ہم نے
کوئی کاغذقلم دوات نہ تھی

آنسوؤں سے بیان لکھا ہے
اس روشنی کے شہر میں ظلمت کرگی راج
مجھکو یقین تھا نہ تجھے ہی گمان تھا
آئے تھے کس طرف سے کدھر کو نکل گئے
بازار سے جو رونق بازار لے گئے
خون ٹپکتا ہے یہاں ہر آنکھ سے
کر بلا ہے کربلا چاروں طرف
موت کے سائے نظر آتے ہیں ایک اک موڑ پر
زندہ رہنے کے میسر ہیں یہاں اسباب کم

کشمیر کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات پر بھی ہمدم کاشمیری گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے وطن عزیز کے اُن نام نہاد رہبروں اور رہنماؤں کو موجودہ کربناک اور دل دوز صورت حال کے ذمہ دار گردانتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ دنیا کے بے غیرت رہبروں کی طرح ہمارے وطن کے رہنماؤں نے بھی دولت اور شہرت کی خاطر اپنے وطن اور اہل وطن کو غلامی کے دلدل میں ڈال دیا ہے۔ جس کی سزا آج تک ہماری کئی نسلیں بھکتی آرہی ہیں۔ اس اہم معاملے کو ہمدم اپنی شاعری میں علامتی پیرائے میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں کہ پرکھوں نے
بنائے آب پر شاید مکاں بنایا ہے
ہمارے شہر میں یہ بات ہوگئی ثابت
کسی بھی جرم کی ہوتی نہیں سزا سائیں
خزاں کے بعد یہاں موسم بہار نہ تھا
ہماری برف میں شاید کوئی شرار نہ تھا
کر رہا ہے نئی تعمیر کی باتیں کیسے
جا بہ جا شہر کے آثار مٹانے والا
کھیل کھیلا ہے آج یہ کیسا
قتل کردار ہوگئے کیسے
میری سرداری میرا ایوان الگ

میرے درباری میرے فرمان الگ
کہیں سے آتی ہے کیوں آج اجنبی خوشبو
پھر ایک بار صفِ دُشمناں کو دیکھتا ہوں
پیچ کر کھائیں گے اسے اک روز
یہ حویلی کے کچھ مکیں باقی
گئے وہ لوٹ کے سب کچھ ہماری بستی سے
کسی بھی کام نہ آئے ہیں دست و پاسائیں

ہمدم کاشمیری کی غزلوں کے محوالہ بالا اشعار سے انسانی درد و کرب اور بے یقینی و محرومی کی جو تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے، وہ انسانی روح کو متزلزل کرتی ہے۔ ان کی غزل میں جو دُکھ درد سمایا ہوا ہے وہ صرف کشمیر ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں عالم انسانیت تڑپتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گویا انہوں نے مقامی دُکھ درد کو آفاقی اور عالمی دُکھ درد کی صورت عطا کی ہے۔ عرفان صدیقی ہمدم کی غزلوں میں کشمیر اور کشمیری عوام کی کربناک اور روح فرساں صورت حال کی عکاسی کو پوری دنیا کی محروم و مجبور عوام کی عکاسی سمجھتے ہیں ۔چنانچہ لکھتے ہیں:

''ہمدم کاشمیری کی غزل کے کینواس کو دیکھتے ہوئے انہیں محض کشمیر کے علاقائی پس منظر سے متعلق کر کے دیکھنا اور وہاں کے ہمعصر اُردو شعراء سے ان کے موازنے تک محدود رہنا مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ شاعری جدید غزل کے وسیع تر منظر نامے کا قابل قدر حصّہ ہے اور اسی حوالے سے یہ اپنے مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔ کشمیر میں انسانی زندگی کے دُکھ درد، مایوسیاں اور امیدیں یقیناً ہمدم کی غزل میں بڑی دردمندی اور صداقت کے ساتھ نمایاں ہوتی ہیں ۔مگر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دنیا کے کسی خاص علاقے میں انسانوں پر جو کچھ گزرتی ہے اُسے پوری دنیا کی انسانی واردات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ انسانی دُکھ درد کا یہی عالمی تناظر ہمدم کی غزل کے آفاق کی توسیع کرتا ہے۔''۳۷

ہمدم کاشمیری کی غزل کی ایک اہم خوبی فنی چابکدستی ہے۔ ہمدم کی غزلوں میں استعارات اور تراکیب کا ایک مخصوص نظام کارفرما رہتا ہے۔ وہ اپنے جذبات اور تخیلات کو موثر بنانے کے لئے علامتوں ،ترکیبوں اور استعاروں کا بھی بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ کلام ہمدم میں زیادہ نظر آنے والی اہم علامتوں

اوراستعاروں میں، دھواں، آسماں، زمین، شہر، سفر، دھوپ، لہو، مکان، گھر، پتھر، جنگل، شام، سمندر، برف، دیوار وغیرہ اسی طرح تراکیب میں زرد اشعار، شعلہ چنار، شہر گماں، لہو رواں، دورِ نقل مکانی، بنائے آب، شہر خامشی، صاحب اذان، سایہ چنار، گرد ملال، بے سایۂ آنگن، بحر بے پایاں، بتانِ وہم وگماں، رنگ حنا ،وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، دھواں اور آسماں ہمدم کی غزلوں کے کلیدی استعارے ہیں ۔جن کا استعمال موصوف نے متعدد جگہ کیا ہے۔ دونوں لفظوں کو ہمدم نے نئے اور مختلف معنوں میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہاں صحرا وہاں دریا دھواں ہے
ادھر ٹھہرا اُدھر بہتا دھواں ہے

آگ کا کوئی نشاں بھی تو نہ تھا
کیوں دھواں اُٹھتا رہا چاروں طرف

آگ کس دیس میں لگی ہے ابکے
پھر دھواں اپنے نگر میں دیکھا

چھایا ہے آسماں پہ سیہ ابر کا دھواں
پھیلی ہوئی ہے برف کی چادر زمین پر

ہمارے نام وہ منسوب ہوگیا کیوں کر
زمیں پہ ٹوٹ پڑا تھا جو آسماں سا کچھ

استعارات، تراکیب اور علامتوں کے علاوہ ہمدم کی غزلوں میں صنعت تضاد کا برجستہ اور بے ساختہ استعمال ہوا ہے۔ ان کے دونوں شعری مجموں میں بے شمار ایسے اشعار نظر نواز ہوتے ہیں جن میں متضاد الفاظ کا خوبصورت التزام ملتا ہے۔ آسمان، زمیں، کفر ایماں، اتار چڑاو، ادھر اُدھر، سفید سیاہ، تنگ کشادہ، صبح شام، تیرا میرا، دشمنی دوستی، آسان دشوار، دھوپ سایہ، جلا بجھا، آنا جانا، روشنی اندھیرا، زندگی موت، وغیرہ ایسے متضاد الفاظ ہیں جن کا دلکش استعمال ہمدم کاشمیری نے اپنی متعدد غزلوں میں کیا ہے۔ جن کی بدولت ان کی غزلوں میں معنوی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی ہے۔اس حوالے سے چند شعر دیکھئے۔

نہ صبح کوئی یہاں اور نہ شام ہے اپنی
کسی سے کیسے کہوں گا کہاں میں رہتا ہوں

ہر طرف سے جڑی ہوئی ہے مگر
آسماں سے زمیں جدا ہے کہاں

کتنی محفوظ زندگی تھی کبھی
دشمنی تھی نہ دوستی تھی کبھی
کون زندہ ہے مر گیا ہے کون
اب یہاں کوئی پوچھتا ہے کہاں
تھی سفید وسیاہ سے واقف
میری آنکھوں میں روشنی تھی کبھی

کام آسان ہے مگر دیکھئے دشوار بھی ہے
آگے دروازے کے رکھی ہوئی دیوار بھی ہے

کہیں ایمان میں الحاد ملا ہے شامل
نظر آیا ہے کہیں کفر میں ایمان آباد

ہم اپنے آپ کو پھر آزما کے دیکھیں گے
جلا کے دیکھ لیا اب بجھا کے دیکھیں گے

ہمدم کی غزلوں میں استعاراتی نظام اور دیگر فنی محاسن کی بدولت ایک نیا اور نرالا رنگ پیدا ہوا ہے۔ ہمدم جذبے کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک نئی لے اور نئی آواز سنائی دیتی ہے ۔وہ اپنے مخصوص ڈکشن اور صنائع بدائع کے برمحل اور بے ساختہ استعمال کے سہارے سے ایک خوبصورت شعری کائنات تخلیق کرتے ہیں۔ جس میں ان کی انفرادیت مضمر ہے۔انہی اوصاف کی بدولت ہمدم جدید غزل گو شعراء کی صف میں اپنی جگہ مستحکم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر شفق سوپوری ہمدم کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمدم کاشمیری خالصتاً غزل کے شاعر ہیں۔ان کی غزل جدید لسانی جمالیات کو مہذب اور پُر وقار بنانے کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ میں ایک جملے میں ان کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی شخصیت کی طرح بہت اچھے اور منفرد شاعر ہیں۔غزل سے ان کی طبعی مناسبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تجربہ تخلیقی نوعیت کا ہوتا ہے جو لفظ استعارہ کی زرخیز مٹی میں اس طرح کھلتا ہے کہ آس پاس کی فضا مشکبار ہو جاتی ہے۔'' ؁۳۸

ہمدم کی غزل میں خود کلامی کے عناصر بھی موجود ہیں۔ وہ حیات و کائنات کے اسرار و رموز کا اپنی ذات کے حوالے سے اظہار کرتے ہیں۔ان کی غزلوں میں ''ہم'' اور ''میں'' کے الفاظ کثرت سے استعمال

ہوئے ہیں۔ ہمدم ماحول و معاشرے کے متعلق اپنے مشاہدات اور تجربات کا اظہار اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی پیرائے میں کرتے ہیں۔ خود کلامی کی صفت ان کی غزل میں ایک عجیب وارفتگی کا احساس دلاتی ہے۔ ان کی غزلوں سے ایک عجب سا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ انسان خود سے سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع کرتا ہے۔ جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

مجھے نہ دیکھ یمین ویسار میں ہمدم
مجھے خدا نے میرے درمیان بنایا ہے

خود کو پہچان لیا ہے میں نے
آپ سے ملنے کی فرصت کم ہے

ہم نے اک عمر بسر کی ہے یہاں بھی لیکن
کچھ اضافہ نہ ہوا دشت کی ویرانی میں

میں جل رہا ہوں کب سے ہوا کی فصیل پر
وہ ڈھونڈتے ہیں مجھ کو میرے خاک وآب میں

ہم نے بھی دشت کو مہکایا ہے
ہم نے بھی خاک اُڑائی تھی کبھی

ہمدم عالمی درد و کرب کو اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بھٹی میں تپا کر اس طرح اُبھار کر شعری لباس پہناتے ہیں کہ جیسے سارے جہاں کا درد ان کے دل میں ہے۔ بقول ڈاکٹر شفق سوپوری:

''ہمدم کی شاعری میں ایک انوکھا طرز احساس پایا جاتا ہے۔ اس میں تجربے کی نوعیت خالصتاً انفرادی اور ذاتی ہے۔ انہوں نے تبدیلشدہ اجتماعی اور تہذیبی پس منظر کی طرف اشارہ کرنے کے بجائے انسانی ذاتی کی تقسیم کا کرب بیان کیا ہے''۔ ۳۹

ہمدم کی غزل میں ان کے ذاتی درد کو آفاقی درد کی صورت میں پیش کرنے کی خوبی کے بارے میں عرفان صدیقی ''دھوپ لہو کی'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اپنی ذات کے کرب کا رشتہ دوسرے انسانوں کے دُکھ درد سے استوار رکھنا اور اپنی واردات کو نوعِ انسانی کی واردات کا حصّہ بنا کر دیکھنا بڑا ہنر ہے اور یہ ہنر جب اثر انگیز پیرایۂ اظہار میں ڈھلتا ہے تو ''دھوپ لہو کی'' جیسی شاعری سامنے آتی ہے''۔ ۴۰

آج کے دور میں صارفی نظام کا روز افزوں بڑھتا ہوا رجحان، سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہوش رُبا ایجادات اور بھاگ دوڑ والی مسابقتی دنیا میں انسان کی زندگی میں آئے روز نئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ آج کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے اندر سے محبت وروا داری، اخوت و ہمدردی، وفا و ایمانداری کے اہم اور بنیادی انسانی اخلاق کا فقدان ہے۔ رشتوں کی اہمیت اور وقعت دن بہ دن ختم ہوتی جارہی ہے ۔ہم بظاہر ترقی کی طرف گامزن ہورہے ہیں لیکن باطنی سطح سے ہم بہت ہی پستی اور تنزل کا شکار ہورہے ہیں۔ ہمدم کاشمیری کی غزلوں میں متعدد اشعار ملتے ہیں جن میں وہ انسانی رشتوں اور تہذیبی قدروں کی شکست وریخت کا نوحہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مروت، بھائی چارگی، انسان دوستی، دیانت داری، خوش خلقی وغیرہ جیسے اوصاف حمیدہ ہمدم کے مطابق اب صرف کتابی باتیں ہیں۔ حرس و ہوس، خود غرضی ،لالچ اور بے جا مادی ضرریات نے انسان کے دلوں میں رشتوں کے لئے محبت نام کی چیز کا جنازہ نکال دیا ہے۔ پرانی قدروں کی پامالی اور رشتوں کے درمیان پیدا شدہ خلیج کو دیکھ کر ہمدم کاشمیری رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں، جس کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

جب سے ہیں اپنے پرائے بیزار
رسم دنیا کی اُٹھائی تھی کبھی

اپنا پتا کوئی پوچھے تو کیا کہوں ہمدم
میں اپنے گھر میں بھی رہتا ہوں دوسرں کی طرح

یہاں کوئی بھی کسی بات پر نہیں قائم
بدل نہ جائے کہیں تو بھی موسموں کی طرح

جو بھی صورت ہو، بجا ہے لین دین
اب نہیں ہو تا ہے شرمندہ کوئی

ساتھ دیتا ہوں جھوٹ کا ہمدم
شہر میں باوقار میں بھی ہوں

کوئی پیام نہ کوئی اتا پتا ان کا
کوئی بتائے کہاں پر ہیں رفتگان آباد

کون زندہ ہے مر گیا ہے کون
اب یہاں کوئی پوچھتا ہے کہاں

مذکورہ اشعار سے اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمدم اپنے فن کو اپنی ذات

تک ہی محدود نہیں رکھتے ہیں بلکہ پوری انسانیت اور تہذیب واقدار کے نشیب وفراز کو بھی اس میں سمیٹتے ہیں۔ ہمدم انسانی قدروں کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ رشتوں اور قدروں کی گراوٹ دیکھ کر متفکر ہوتے ہیں۔ یہ احساس ان کو بے چین کر دیتا ہے۔ جاوید انور ہمدم کاشمیری کو انسانی قدروں کا پاسدار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمدم کاشمیری ہمارے عہد کے ایک ایسے شاعر ہیں، جن کے یہاں انسانیت کے درد کے درماں کے طور پر ایک شعری عقیدہ ایک سمت اور میلان کا سراغ لگایا یا جا سکتا ہے۔ ہمدم کاشمیری نے اپنے اشعار کے ذریعے انسانی قدروں کی پامالی پر جس طرح روشنی ڈالی ہے اور انہیں جس طرح جاگزیں کیا ہے وہ زمانوں کے مصنوعی احساسات جو فیشن اور فارمولا زدہ زندگی کے زیر اثر پیدا ہوئے ہیں اور ان کے سارے امکانات پورے اخلاقی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی منظر اور ان کے پورے وجود کے متعلق غلط فہمی پیدا کرتے ہیں، وہ اپنے شعری اسلوب میں شدت سے مذمت کرتے ہیں۔ ان کی شاعری جدید دور کی مختلف حقیقتوں کی آئینہ دار ہے اور انسانی قدروں کی پاسدار بھی''۔

۱۴

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمدم کاشمیری اُردو غزل کے جدید شعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ جن کے لہجے کی نرمی، احساس کی شدت، فکر کی تازگی، خیال کی وسعت وندرت، اظہار کی صلابت و حلاوت، موضوعات میں تنوعیت ایسی خوبیاں ہیں جن کو وہ بیک وقت بروئے کار لا کر اپنے تجربات کو غزل کی لبادہ پہناتے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا ہے اس کو خوبصورت پیرائے میں اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ان کی غزل جدید اُردو غزل کے سرمائے میں ایک نادر اضافہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

فاروق نازکی

وادیٔ کشمیر میں غزل کی آبیاری کرنے والے افراد کی خاصی تعداد آباد ہیں۔ یہاں ہر دور میں اُردو شاعری کے حوالے سے بالعموم اور اُردو غزل کے لحاظ سے بالخصوص بعض اہم شعراء نے اپنی فکری بیداری اور فنی خصوصیات کی بنا پر اپنا نام نہ صرف ریاست بلکہ پورے اُردو ادب کی دنیا میں روشن کیا ہے۔ ایسے معروف شعراء میں ایک اہم نام فاروق نازکی کا ہیں۔

فاروق نازکی وادیٔ کشمیر کے سرحدی ضلع بانڈی پورہ کے دور افتادہ گاؤں مانڈر میں ۱۹۴۰ء کو پیدا

ہوئے۔آپ ایک علم دوست اور پڑھے لکھے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔فاروق کے والد میر غلام رسول ناز کی ریاست جموں و کشمیر کے قد آور اُردو اور کشمیری شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ریاست میں اُردو شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے شعراء میں میر غلام رسول ناز کی ایک تناور درخت کی حیثیت رکھتے ہیں۔آپ نے وادی کے کئی نومشق شعراء کی شاعری کی اصلاح کر کے ان کے مذاق کو سنوارا ہے۔

فاروق نازکی کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی عائشہ بیگم تھا۔موصوفہ نہایت ہی مخلص ،ملنسار، ہمدرد اور جہاں دیدہ خاتون تھیں۔فاروق نازکی نے اپنی زندگی کے ابتدائی ماہ و سال ایشاء کی سب سے بڑی جھیل ''ولر'' کے کنارے قدرت کی حسین اور خوبصورت آغوش میں اپنے گاؤں مانڈر کی کھلی فضا میں گزارے ہیں۔اسی گاؤں کی مشک بار فضا میں فاروق نے ابتدائی تعلیم کی شروعات اپنے والدین کی نگرانی میں کی۔فاروق کی عمر دس سال کی تھی جب وہ اپنے والدین کے ہمراہ بانڈی پورہ سے ہجرت کر کے سرینگر کے ریناواری علاقے میں رہنے کے لئے مستقل طور پر آگئے۔موصوف نے باقاعدہ تعلیم کا آغاز سرینگر میں ہی کیا۔ایس۔پی کالج سے بی۔اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ایم۔اے اُردو کشمیر یونیورسٹی سے کیا۔اس کے علاوہ فاروق نے یونیورسٹی آف برلن سے ''ڈپلوما اِن جرنلزم'' (Diploma in Journalism) بھی کیا ہے۔ایم۔اے کے فوراً بعد فاروق نازکی ریڈیو کشمیر میں پہلے عارضی اور بعدازاں مستقل طور پر ملازم ہو گئے۔ریڈیو کشمیر میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے اسی دوران کشمیر میں دوردرشن کی سنگ بنیاد ڈالی گئی،اور فاروق نازکی ریڈیو سے دوردرشن منتقل ہو گئے۔دوردرشن سرینگر میں نازکی نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے اس شعبے کو ترقی دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔فاروق دوردرشن کیندر سرینگر میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فرائض انجام دینے کے بعد آخر میں ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے ہیں۔

فاروق نازکی کو شاعری وراثت میں ملی ہے۔جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ان کے والد ریاست کے برگزیدہ شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔فاروق نے شاعری کا ابتدائی درس اپنے والد محترم سے لیا ہے۔آپ بچپن سے ہی شعر گوئی کی جانب متوجہ ہوئے ہیں جس کی خاص وجہ گھر کا شاعرانہ ماحول ہے۔ان کے گھر میں علماء ادباء اور شعراء کا معمول سے آنا جانا تھا۔آئے دن ان کے یہاں مشاعرے اور علمی و ادبی گفتگو ہوا کرتی تھی۔اس کا براہ راست اثر فاروق نازکی پر بھی پڑا اور وہ بھی رفتہ رفتہ شاعری کی نوک پلک سنوارنے لگے۔موصوف نے مشق سخن جاری رکھا اور بہت ہی قلیل مدت کے اندر وہ ریاست کے اہم شعراء میں شمار ہونے لگے۔فاروق نازکی اُردو زبان و ادب سے والہانہ شغف رکھتے ہیں۔انہوں نے اُردو کے کلاسیکی ادب کا بغور مطالعہ کرنے کے علاوہ اپنے عہد کے نامور اور معروف شعراء کے کلام کو بھی پڑھا ہے۔فاروق نازکی اُردو ادب کی جملہ اصناف سخن کو برتنے میں کامل دسترس رکھتے ہیں۔البتہ ان کے بے پناہ تخلیقی

جوہر صحیح معنوں میں غزل اور نظم میں ہی کھلتے ہیں۔ ناز کی نے شاعری کے ساتھ ساتھ ڈرامے، ترجمے اور سیریل بھی لکھے ہیں۔

فاروق نازکی کا ابتدائی کلام وادی کے نامور رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتا رہا ہے جن میں، شیرازہ، تعمیر، پرتاب، الصفا، سرینگر ٹائمز کے علاوہ ملک کے معروف جرائد جیسے شاعر، شب خون، انتساب، آجکل، سب رس، سرسبز وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موصوف نے اُردو دنیا کو اپنا پہلا شعری گلدستہ ۱۹۸۹ء میں ''آخری خواب سے پہلے'' کی شکل میں دے دیا۔ یہ شعری مجموعہ فاروق کے فکروفن اور انداز بیان کا بہترین آئینہ دار ثابت ہوا۔ اس مجموعہ میں شامل غزلوں اور منظومات کو قارئین کے ایک وسیع حلقے نے پسند کیا اور خوب داد دی۔ ''آخری خواب سے پہلے'' کے بعد فاروق نازکی کا دوسرا مجموعہ ''لفظ لفظ نوحہ'' ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں حمد و نعت کے بعد غزلیات اور منظومات شامل ہیں۔ اس مجموعے کے مشمولات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاروق نازکی فن شاعری کو برتنے میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع یا مضمون کو شعری سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ شعروادب کی بے لوث خدمات کے عوض فاروق کو بعض اہم اعزازات سے نوازا جاچکا ہے جن میں ساہتہ اکاڈمی ایوارڈ اور کلچرل اکاڈمی ایوارڈ خاص طور پر شامل ہیں۔

جہاں تک فاروق نازکی کی غزل گوئی کا تعلق ہے۔ اس میں وہ تمام تر خوبیاں موجود ہیں جو ایک صاحب اسلوب اور صاحب طرز غزل گو شاعر میں ہوتی ہیں۔ فاروق کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے وہ کسی مخصوص موضوع میں خود کو مقید نہیں کرتے ہیں۔ ذات اور کائنات کے جتنے بھی عناصر ہیں، وہ تمام فاروق کی نظر میں رہتے ہیں۔ ان ہی سے وہ اپنی غزل کے لئے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ فاروق کی غزلوں میں حسن و عشق کے رنگارنگ موضوعات ان کے ابتدائی دور کے کلام میں زیادہ نظر آتے ہیں، جس کی خاص وجہ ان کا عالم شباب ہوسکتا ہے۔ وہ رومان اور حسن پرور شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق کی متنوع کیفیات کا بے ساختہ اور خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ عشق اور معاملات عشق کے اتار چڑاؤ کی باریکیوں کا مظاہرہ فاروق نازکی جس انداز سے کرتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی عشق کی گلیوں کے راہی رہے ہیں۔ فاروق نازکی کے دل میں جب عشق کے جذبات موجزن ہوتے ہیں تو وہ ان کو شعری سانچوں میں کچھ اس طرح ڈھالتے ہیں۔

بوئے گل بن کے جب تو آجائے
دشت میں بھی بہار اُترے گی

سر بہ سر عشق ہوں عنوانِ وفا دے

لوگ کہتے رہیں صدیوں وہ کہانی دے مجھکو
مجھ کو مجھ سے دور کیا
نامِ نہ لو ہر جائی کا
پردہ ذہن پہ اُبھرے ہیں ہزاروں سورج
رات دیکھا تھا کسی پردہ نشیں کا چہرہ
جانب شہر غزالاں پھر چلی شام فراق
دشت کی بے خوبیوں کا راز داں آئے گا کیا
ملن کی رُت ہے ہتھیلی پہ چاند ٹھہرا ہے
گڈ ریئے شام سے پہلے ہی گاؤں آ پہنچے
آیا میرے قریب گل سیم تن کی طرح
سارا سکون صورت سیماب لے گیا
نہ پوچھ کیا تھا منظر تیری جدائی کا
فرشتہ ہوتا تو وہ بھی دہل گیا ہوتا
بھُلا دی آپ نے بھی وہ کہانی
محبت جس کے دم سے جاوداں ہے

اسی طرح محبوب کی جدائی اور ایک ساتھ گزارے حسین لمحوں کی یاد کس طرح فاروق نازکی کو ستاتی ہے اس کا اظہار بھی اپنے دلکش انداز میں یوں کرتے ہیں۔

میں سرِ دار بھی کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا
تو نہیں آیا تو میں جاں سے گزر جاؤں گا
اب تو بس ایک ہی اُلجھن میں گرفتار ہوں میں
جو تیرے شہر سے نکلوں تو کدھر جاؤں میں
میں جس کے واسطے دنیا سے لاتعلق ہوں
وہ میری یاد میں خود بھی سُلگ رہا ہو گا
میں اُس کو بھول جاؤں
نہیں میرے بس کی بات

مذکورہ اشعار فاروق نازکی کے جمالیاتی حس کا احاطہ کرتے ہیں۔ عشق، معشوق اور حسن کے

حسین وجمیل پہلوؤں کو موصوف نے بڑی سادگی اور سلاست سے بیان کیا ہے۔ جن کی بدولت ان کی غزل میں نئی تازگی اور بالیدگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

فاروق ناز کی پیدائشی شاعر ہیں۔ وہ شاعری کو اپنے جذبات کا بہترین مظہر سمجھتے ہیں۔ روایتی اور مروجہ عشقیہ موضوعات کو اپنے مخصوص رنگ اور لفظیات میں برتنے کے علاوہ جدید عصری حسیت اور سماجی و تہذیبی زندگی کو بھی اپنی شاعری میں متشکل کرتے ہیں۔ فاروق ناز کی جدید غزل کے منفرد شعراء میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ نہایت ہی حساس اور کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ گردو نواح میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اگر چہ وہ خود کو کسی ازم یا تحریک کے ساتھ منسلک نہیں رکھتے ہیں تاہم فاروق کی شاعری ان کے جدید ذہن کی آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو عصری تقاضوں کے مطابق شعری لباس پہنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ فاروق ناز کی اپنے محسوسات اور واردات کو جدید غزل کے فنی لوازمات اور مخصوص لفظیات کے ساتھ کچھ اس انداز سے ترجمانی کرتے ہیں۔

میں ہوں مضطر بدن کی نگری میں
میرے حصّے میں لا مکاں لکھنا

روشنی آئے بھی کیسے مرے ماتم خانے میں
جن کے بوسیدہ دریچوں میں لگا ہے درنیا

دھوپ حالات کی سینک لی تو ہوا
میری آنکھوں سے خوابوں کا منظر الگ

چمن افسردہ گل مرجھا گئے ہیں
خزاں کی زد پہ سارا گلستان ہے

اسی بستی میں اندھے بس گئے ہیں
اسی بستی میں وافر آئینے ہیں

کانچ کے الفاظ کاغذ پر نہ رکھ
سنگ معنی کے ٹکراؤں گا میں

میں اپنی نیند کسی گھر میں کیسے بھول آتا
وہ میرے خواب کے سانچے میں ڈھل گیا ہوتا

میری بستی میں آکر

پاگل   دریا   ٹھہرا   ہے

مذکورہ اشعار فاروق نازکی کی نئی تخلیقی اور ذہنی بالیدگی کا بہترین مظاہرہ کرتے ہیں۔ انہیں ہر طرح کا موضوع غزل کی صورت میں پیش کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ جاوید انور فاروق نازکی کی غزل گوئی کے بارے میں اپنے تاثرات کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''فاروق نازکی کے غزلیہ اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نہ تو کسی طے شدہ راستے پر سفر کرتی ہے اور نہ ہی کوئی شعری عقیدہ یا نظریہ ہے، جس کی فہرست کو سامنے رکھ کر شعر کہنے کے عادی ہیں۔ ہاں ان کی کچھ اپنی مخصوص لفظیات ہیں جو اُردو ادب میں ان کی شناخت کی مستحکم پہچان بھی ہے۔ حالانکہ مجموعی طور پر انہوں نے اپنی شاعری کا نصب العین بھی کہیں واضح اور کہیں اشارتی طور پر بیان کر دیا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت محض شاعرانہ ہے۔ نہ کہ رجحاناتی یا تجارتی انہوں نے اپنی شاعری کے منظر نامے میں متضاد عقائد اور افکار کو اپنے ذہن اور جذباتی رویوں کے ساتھ یکساں گنجائش کے ساتھ برتا ہے۔ فنی سطحوں پر نئی شعری جمالیات کے آئینے میں بھی دیکھا جائے تو ان کا اظہار بیان مختلف النوع سمتوں کا حامل ہے''۔ ۴۲

جاوید انور کی بات سے میں پوری طرح اتفاق رکھتا ہوں کہ فاروق نازکی کے کلام کے مطالعے سے جو شعری رویہ اُبھرتا ہے۔ وہ کسی رجحان یا تحریک کا ترجمان نہیں بلکہ خالص شاعرانہ اظہار ہے۔ موصوف نے اپنے ذہنی رویوں اور بلند افکار سے ایک مخصوص اور منفرد شعری کائنات تخلیق کی ہے۔ ان کے انداز بیان میں تازگی اور برجستگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ فاروق احساس کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں احساسات کا ایک لامنتہا سلسلہ دامن دل کو کھینچ لیتا ہے۔ موصوف اپنے احساسات کو شعری قالب میں سمونے کے لئے کبھی کبھی موضوع اور ہئیت کے لوازمات کی پرواہ بھی نہیں کرتے ہیں۔ بقول علیم اللہ حالی:

''فاروق نازکی کی شاعری وسیع تر انسانی نفسیات کی ترجمان ہے۔ ان کے کلام میں یہ ترجمانی ایک لطیف مابعد الطبعیاتی تصور اور احساس کے وسیلے سے ہوتی ہے۔ داخلی محسوسات بسا اوقات موضوعاتی اور ہیئتی حدود اور قیود سے آزاد ہونے لگتے ہیں۔ پتھروں کے دل چیر کر احساسات کا ابلتا ہوا ایک چشمہ فاروق نازکی کے یہاں خاص طور پر دیکھا جا سکتا ہے''۔ ۴۳

فاروق نازکی کی غزل کا لہجہ نیا اور تازہ ہے۔ نازکی روایتی غزل اور کلاسیکی شاعری کا گہرا

ادراک رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید شعراء کے کلام سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنے خیالات کی ترسیل اور ترجمانی کے لئے نئے انداز کو اختیار کرتے ہیں۔ فاروق نازکی نے صنف غزل کے ہر شعر کو نیا اور انوکھا رنگ بخشا ہے۔ معنی و مفاہیم کے لحاظ سے بھی موصوف کی غزل اُردو شاعری میں اپنی انفرادیت رکھتی ہے۔ فاروق نازکی نے اپنے مخصوص انداز بیان اور طرز ادا سے اردو غزل کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔ وہ سہل اور سادہ اسلوب میں بڑی اور پیچیدہ بات کہنے پر قادر ہیں۔ سادگی سلاست اور روانی فاروق نازکی کی غزل کی منفرد خصوصیت ہیں۔ چند اشعار دیکھئے ؎

موسم گل سے برف زاروں تک
سینکڑوں رنگ میں بدلتا ہوں

طوفانوں کی آمد ہے
پنچھی لوٹ رہے ہیں گھر

اک اپنی ذات تھی جو فراموش ہو گئی
باقی جو زندگی نے دیا سب یاد رہا

قسمیں ، رسمیں ، پاس لحاظ
ان حربوں سے کام نہ لے

زمیں تنگ ہوئی ہے جنوں کے ماروں پر
میں جانتا ہوں نوازش ہے نازنینوں کی

چاندنی آسماں سے اُترے گی
میرے آنگن سے ہو کے گزرے گی

فاروق نازکی کی غزل میں نیا لہجہ اور تازہ اسلوب ایسی خوبیاں ہیں جو انہیں اپنے معاصرین میں ممتاز مقام عطا کرنے میں معاون ہیں۔ فاروق کی غزل پر تجزیہ کرتے ہوئے محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

”فاروق نازکی کی غزل میں بے شمار اشعار ایسے ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد پہلا احساس تو یہ ہوتا ہے کہ نازکی نے جدید غزل کو اس منزل سے اپنا ہمنوا بنایا ہے جہاں ناصر کاظمی نے اسے چھوڑا تھا۔ دوسری بات جو نازکی کی غزل میں نمایاں ہے وہ ہے ہیئت کی نئی ساخت۔ دو متضاد اور ناگفتہ مناظر، عوامل اور مفاہیم کے درمیان ایک نئے معنوی رشتے کی تشکیل، اس مقصد کے لئے فاروق نے کلاسیکی غزل یا جدید غزل کی رسمیات کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ ہر شعر

کومختلف رنگوں کی تیزی سے رقص کرتی ہوئی مشعل بنایا ہے۔جس میں ابتدائی سطح پر رنگ الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ہر ایک لفظ اپنے منفرد رنگ کے ساتھ نمایاں ہے۔تب اس چکرویو سے مفاہیم کا سرچشمہ طلوع ہوتا ہے اور فاروق ناز کی انتہائی انوکھے،منفرد اور ہمہ جہت شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ''۔ ۴۴

فاروق ناز کی ایک حساس اور صاحب بصیرت شاعر ہیں۔وہ اپنے تجربات اور محسوسات کو عام فہم زبان میں پیش کرنے کے روادار ہیں۔البتہ بعض اوقات علامتی پیرائے سے بھی اپنی غزل کی تجسیم کاری کرتے ہیں۔ان کے کلام میں متعدد الفاظ علامتوں کی صورت میں بھی استعمال ہوتے ہیں شہر،دھوپ، آسماں، گھر، برف، سمندر، شجر وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کو علامت کے طور پر استعمال کر کے فاروق نازکی نے معنی ومفاہیم کے بے شمار دفتر کھولے ہیں۔لفظ ''گھر'' فاروق کی غزلوں میں ایک کلیدی استعارے کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کا استعمال انہوں نے اپنی متعدد غزلوں میں مختلف جگہوں پر الگ الگ معنوں میں کیا ہے۔جس سے اس لفظ کی معنوی تہہ داری کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔جو فاروق نازکی کی فکر و احساس کے لامحدود کینوس کو آئینہ کرتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو نہی بام و در جاگے
بستیوں میں گھر جاگے

دیکھتے ہی دیکھتے بستی میں لگ جاتی ہے آگ
روز لٹ جاتا ہے کوئی مسکراتا گھر یہاں

ساری بستی جلا کے رکھ دوں گا
اپنے گھر کو تو میں جلا ڈالوں

راستے کے واسطے اک جام دو
نیم شب ہے اب تو گھر جاؤں گا میں

کئی دنوں سے بات نہیں کی اپنوں سے
آج ضروری خط اپنے گھر لکھنا ہے

آپ کی تصویر تھی اخبار میں
کیا سبب ہے آپ گھر جاتے نہیں

فاروق نازکی کی مختلف غزلوں سے لئے گئے مذکورہ بالا اشعار اس امر کی طرف ہماری توجہ مرکوز

کراتے ہیں، کہ فاروق نازکی کے یہاں بھی ایک عام انسان کی طرح گھر کا ایک زمینی تصور ہے جو نہ صرف سکون اور تحفظ کی علامت ہے بلکہ اس کی نیند' اس کے خواب' اس کی یادیں' اس کی تنہائی کے لطیف ترین اور کرب انگیز لمحوں کا گواہ بھی ہے۔ ان کے کلام میں گھر ایک زندہ علامت ہے۔ وہ مختلف منظروں اور بدلتے کرداروں کے ساتھ جہاں ایک طرف گھر کی محبت میں بستی جلانے سے مانع رہتے ہیں، وہیں دوسری جانب گھر کے لٹنے کا گواہ بھی بن جاتے ہیں اور پھر سکون کی علامت نہیں رہ پایا۔ خوف اور عدم تحفظ کا ایک کربناک احساس پھیلتا ہے۔ وہ بھاگتا ہے لیکن چھوڑے ہوئے گھر کا خیال اسے دورانِ سفر بار بار آتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ خط بھی لکھنا چاہتا ہے اور اپنے اقربا سے بات بھی کرنا چاہتا ہے۔ نیم شبی اسے گھر کی طرف لے جاتی ہے لیکن گھر اور راستے کے درمیان کا منظر متقاضی ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ بھول جائے اور مدہوش رہے۔ گھر لوٹنے کی تڑپ اخبار میں تصویر کا چھپنا اور اس پر استفسار ''کیا سبب ہے آپ گھر جاتے نہیں'' سے مختلف النوع سوالات وخدشات سر ابھارنے لگتے ہیں۔

فاروق نازکی زبان اور انداز بیان پر غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ وہ شیریں وسبک الفاظ کے استعمال سے ایک سحر خیز شعری کائنات وجود میں لاتے ہیں۔ اپنے مخصوص موضوعات کو برتنے کے لئے نازکی الفاظ کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ فاروق کی غزلوں کی اہم اور منفرد خصوصیت ان کی دلکش ترکیب سازی ہے۔ ان کے کلام میں متعدد تراکیب ایسی ہیں جو ان کی تخلیق کردہ ہیں اور جو اُردو غزل میں ایک خوبصورت اضافہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔ فاروق کی غزلوں میں ذو حرفی تراکیب کے علاوہ سہ حرفی ترکیبوں کا بھی بھرپور استعمال ملتا ہے۔ جو ان کے ماہر زبان ہونے پر دال ہیں۔ کلام فاروق کی چند اہم تراکیب میں غیبت یاراں' شرط سفر' اذان تکلم' خون سمندر' پاگل دریا' جنوں آثار' بدن نگری' کاسۂ چشم' دریائے خون' رخ جمیل' گرد ملال' جانبِ شہر غزالاں' شام فراق' بے صد ساز' بوئے گل بدن' شیریں مقال' شہر نامراد' پردۂ ذہن' برگ چنار' دریائے خون خلق' سمن پاشیاں' پس دیوار شب' سینۂ برگ گل تر' گرد بیداری شب' برف زاروں' دیوارِ بدن' گہنگار وفا' احمریں ہونٹ' جبین سادہ' زلف پرشکن' پیکر وقت' منت سنگِ ملامت' سرِ دار' آبگینۂ دل' وادی گل وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ نازکی اپنے تجربات اور محسوسات کو انہی تراکیب سے مزیّن کرتے ہیں۔ جن کی بدولت ان کی غزلوں میں معنوی تہہ داری اور غنایت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ مذکورہ تراکیب کو فاروق کچھ اس طرح اپنے شعری تجربات میں اہم آلہ کار کے بطور استعمال میں لاتے ہیں۔

منت سِنگ ملامت نہ اُٹھاؤں گا کبھی
کسی دیوار سے سر پھوڑ کے مر جاؤں گا

دامنِ شب پہ لرزتے ہوئے جگنوں کی طرح
احمریں ہونٹ پہ ٹھہرا ہوا شعلہ رکھ
سینۂ برگ گُل تر پہ نظر تھی اپنی
زندگی آگ کے سانچے میں ڈھلی کیا نہ ہوا
برگ چنار اب کے حِنا سے تہی رہے
رنگ خزاں بھی اب کے برس کچھ عجب رہا
اسی نے سب کے رگ و پے میں زہر گھول دیا
وہ ایک شخص جو شیریں مقال ٹھہرا ہے
رات لمبی ہے چلو غیبت یاراں کرلیں
شب کسی طور تو ہو جائے بسر اپنا کیا
رُخ جمیل پہ گرد ملال رہنے دو !
کسے پڑی ہے خوشا مد کرے حسینوں کی

فاروق نازکی کی غزلوں کی زبان اور انتخاب الفاظ کی رنگارنگی کے حوالے سے جاوید انور لکھتے ہیں:

''ان کے برتے گئے مضامین میں شعر کی زبان، لفظوں کی ترتیب، تراکیب کا چناؤ اور ان کی اہمیت اور ان تمام کو یک جا کرنے کے بعد جو شعری سانچہ مرتب ہوتا ہے، وہ شعری سطح پر آہنگ کے اعتبار سے داخلی اور خارجی دونوں امکانات اپنے اندر سموئے رکھتا ہے۔ ان کے اشعار میں معنی کی عدم تفہیم یا پھر جذوی تفہیم کا سلسلہ ان معنوں میں موجود رہتا ہے کہ کسی ایک تشریح پر پہنچ کر معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ لفظوں کا آہنگ ترنم اور ابہام کے ساتھ بصارت اور سماعت کے لئے ایک ایسی فضا قائم کرتا ہے کہ شعری تفہیم سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہوتے ہوئے بھی نیم دھندلکوں میں ایک کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔''[۴۵]

فاروق نازکی کی غزلوں میں وادئ کشمیر اور اہل وادی کی مجروح اور تڑپتی ہوئی رُوح محسوس ہوتی ہے۔ موصوف وادی میں گذشتہ تیس برس سے ہو رہے انسانیت سوز واقعات کے عین شاہد ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں عصری کربناکی اور لاچاری کو ایک اہم موضوع کی صورت میں پیش کیا

ہے۔ چناچہ کہتے ہیں ۔

شہر سارا ہی کربلا ساتھا
جو بھی تھا خون ہی کا پیا سا تھا
پھر تلاطم خیز ہے دریائے خون
ہم تیری تقدیر بن کر آئیں گے
اپنی غزلوں کو خون کا سیلاب لے گیا
آنکھیں رہیں کھلی کی کھلی خواب لے گیا
دریائے خونِ خلق میں تیرے گا آدمی
اس کا خیال اس کا گماں کس کو کب رہا

کشمیر اور اہل کشمیر کے خونین اور دلدوز واقعات کو شعری سانچوں میں ڈھال کر فاروق نے انسان دوستی اور ہمدردی کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ پورے شہر کا کربلا بنا، لوگوں کا آپس میں ایک دوسرے کے خون کا پیا سا بننا، لوگوں کی تقدیر میں مسلسل دریائے خون کا بہنا، حسین اور دلکش خوابوں کا سیلاب خون میں ڈھوب جانا، خون کے دریا میں لوگوں کا تیرنا وغیرہ ایسے ہولناک اور دل دہلانے والے مناظر ہیں جو عام آدمی کی روح کو متزلزل کر دیتے ہیں۔ فاروق نازکی کے وطن میں ایسے واقعات روز افزوں رونما ہوتے ہیں، اور اس پیمانے پر ہو رہے ہیں جس کا گماں بھی ممکن نہیں۔

فاروق نازکی میڈیا سے طویل عرصے تک وابستہ رہے ہیں۔ جس کی بدولت وہ کشمیر کے سیاسی، سماجی معاشرتی اور معاشی صورت حال سے پورے طور پر باخبر رہے ہیں۔ یہاں کے عوام پر ہو رہے مظالم، ان کی لاچاری، مفلسی، بے بسی، عدم تحفظ، لایقینیت، قتل وغارت، اقدار کے پامالی، محرومی و ناانصافی وغیرہ نے فاروق نازکی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ اپنے وطن کی اس زبوحالی کو دیکھ کر بہت افسردہ ہوتے ہیں ۔اپنی افسردگی کا اظہار وہ اپنی غزل میں کچھ اس طرح کرتے ہیں۔ ۔

یونہی کر لیتے ہیں اوقات بسر اپنا کیا
اپنے ہی شہر میں ہیں شہر بدر اپنا کیا
ہماری عادت سی بن گئی ہے
کسی سبب سے اُداس رہنا
باہر سے جو بھی آیا پریشان کر گیا
ہم کو ہمارے گھر میں ہراسان کر گیا

اے شہر نامراد ترے بانکپن کی خیر
ہم پر تیری بہار کا سایہ ہی کب رہا
برگ چنار اب کے حنا سے تہی رہے
رنگ خزاں بھی اب کے برس کچھ عجب رہا
یہ شہر بھی کیا خوب ہے اس شہر میں کوئی
سچ بول کے جی لے تو خطاوار بہت ہے
اے شہر بے چراغ تیری ظلمتوں کی خیر
ہم بھی تیرے ساتھ یونہی تا سحر چلے
تر دد،خوف، بے زاری، تلون
یہی لے دے کے اپنے مشغلے ہیں

شہر‘شہر نامراد‘شہر بے چراغ‘شہر بدر‘وغیرہ جیسے تراکیب سے فاروق نے کشمیر کے حالات کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ ان کے جذبات کی سچی اور تلخ عکاسی ہے۔اُداسی کا عادی بننا‘ اپنے شہر میں شہر بدر ہو کر رہنا‘ اپنے گھر میں ہراساں رہنا، چنار کے پتوں کا بے رنگ ہونا، سچ بولنے پر خطاوار ہونا، شہر کا بے چراغ ہونا‘ ظلمتوں پر خیر منانا‘ تردد‘خوف بے زاری اور تلون کو مشغلہ بنانا‘ فاروق نازکی کی غزلوں میں کشمیر کی کربناک صورت حال کو عیاں کر دیتے ہیں۔ جہاں انسان اور انسانیت کی آزادی کا سر عام خون ہوتا ہو اور جہاں انسانی حقوق کی پامالی معمول بن گیا ہو۔تو وہاں کے باغیرت لوگ اپنے حق طلبی کی خاطر سنگ باری بھی کرتے ہیں۔

سنگ باری کے لئے موسم نہیں مخصوص
سنگ باری ڈھونڈ تی رہتی ہے ہمیشہ سر نیا

اور اس تصادم وتشدد میں جب کسی نوجوان کا خون بہتا ہے تو شاعر اس پر کف افسوس ملتا ہوا کہتا ہے ۔

جب کوئی نوجوان مرتا ہے
آرزو کا جہاں مرتا ہے

فاروق نازکی کی غزل روایت کی امانت دار اور جدید فکر کی پاسدار ہے۔ان کے یہاں قدیم و جدید رنگ سے متشکل خوبصورت شاعری ہمارا من موہ لیتی ہے۔انہوں نے اُردو کے کلاسیکی شعراء میر ‘غالب‘ داغ کے کلام کے مطالعے کے ساتھ ساتھ فیض‘ میراں جی‘اختر الایمان‘ ناصر کاظمی‘اختر شیرانی کی شاعری سے بھی اثرات قبول کئے ہیں۔اسی جدّت اور ندرت نے فاروق نازکی کی غزل کو ایک نئے موڑ پر

لا کھڑا کیا ہے جو اُن کو اردو غزل میں ایک نام و مقام سے سرفراز کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

تری مرضی نہ دے ثبات مجھے
بے یقینی سے دے نجات مجھے

عقیدت کی دیوار کچی نہیں
یہ وہ ریت ہے جو بکھرتی نہیں

پھر پہاڑوں سے اتر کر آئیں گے
راہ بھٹکے نوجوان گھر آئیں گے

دیارِ خواب و چشم دل فگا راں
جزیرہ نیند کا کیوں درمیاں ہے

جب تلک دم میں دم تھا میرے ساتھ تھے
اب میرے دوست رہتے ہیں اکثر الگ

فاروق کی غزلوں میں روایت اور جدت کے امتزاج سے پیدا شدہ نئے شعری منظر نامے کے بارے میں جاوید انور اپنے تاثرات کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''فاروق نازکی کے اشعار میں جو کشمکش اور آویزش نظر آتی ہے۔ اس کے پشت روایت کی ایک طویل تاریخ موجود ہے۔ ان کا کشمیری ذہن مجموعی طور پر جدید ہونے کے باوجود روایت کا خاصہ اثر رکھتا ہے۔ اس میں ان کے قوی مزاج کا بڑا دخل ہے کہ صدیوں کے اثرات کے نتائج اتنی جلدی زائل نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کا یہ رویہ آزادیٔ خیال کے تعلق سے جدید نسل اور قدیم نسل میں واقع خلیج سے فائدہ اُٹھانا اپنے تخلیقی وجود کی اہمیت کو منوانا ہے۔ انہوں نے دونوں کے اشتراک سے نئی اور خود ساختہ روایت قائم کی ہے۔ جس میں ان کے سماجی، اخلاقی اور تہذیبی افکار کو بھی دیکھا جا سکتا ہے''۔ ۴۶

فاروق نے صنف غزل میں اپنے تخیلات کو متصور کرنے کے لئے عموماً چھوٹی بحروں کو استعمال میں لایا ہے۔ انہیں چھوٹی بحروں کو برتنے میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ مختصر اور معنی خیز الفاظ اور بحور کے علاوہ نئی زمینوں میں غزل کہنا فاروق کا خاص مشغلہ رہا ہے۔ تخلص کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر شاعری وسائل کا استعمال بھی موقع و محل کی مناسبت سے بخوبی کرتے ہیں۔ نئے موضوعات کی دلکش ادائیگی، نئے الفاظ اور تراکیب کی حسین تجسیم کاری، لہجے اور اسلوب کی تازہ کاری، زبان و بیان کی

شیرینی اور روانی فاروق کی غزلوں کے امتیازات ہیں۔ فاروق کی غزل گوئی پر مظفر حنفی کے تاثرات پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

''وادی کشمیر سے پہنچنے والی ایک دل دوز آواز نے مجھے نہ صرف چونکا دیا بلکہ گھنٹوں اپنی گرفت میں رکھا، یہ آواز فاروق نازکی کے مجموعۂ غزلیات نے مجھ تک پہنچائی تھی۔ تلخ ترش، شیریں، لگا جیسے کوئی سوختہ گرد و پیش کے درمیاں نوحہ کناں ہو۔ محسوس ہوا جیسے کوئی اپنی فردوس گمشدہ کی تلاش میں ہر آنے جانے والے سے استفسار کرتا ہو۔ عام طور پر چھوٹی چھوٹی بحروں لیکن نئی نئی زمینوں میں کہی گئی مختصران غزلوں میں، میں نے ایک ایسے جہان معنی کی سیر کی جس پر کسی دوسرے غزل گو کے قدم نہیں پڑے۔ ان کے شعروں کے مطالعے سے تخلیق کار کے روحانی کرب، نفسیاتی پیچ و تاب، ملوے فکر، ترچھی اُڑان اور شورش قلب کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اپنے اندر کے طوفان کو جس سہار اور سبھاؤ، جس ندرت اور جدت، جس مٹھاس اور رچاؤ کے ساتھ نازکی نے غزل کے پیرائے میں ڈالا ہے اس کے نتیجے میں انتشار و شور یدگی کے پہلو ان کے کلام میں غنایت اور تغزل بھی کم نہیں، اور یہی ان کے انفرادیت ہے'' ۴۷

☆☆☆☆☆☆☆☆

مظفر ایرج

محمد مظفر نقشبندی المتخلص بہ مظفر ایرج یکم اگست ۱۹۴۴ء کو سرینگر کے محلّہ صفا کدل میں پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ دریائے جہلم کے کنارے پر آباد ہے۔ آپ کے والد کا نام محمد شریف نقشبندی تھا۔ جو اپنے نام کی مناسبت سے نہایت ہی شریف اور منکسر لمزاج واقع ہوئے تھے۔ مظفر کی تعلیم و تربیت کا آغاز روایت کے مطابق قرآن شریف اور گلستان و بوستان سے ہوا۔ اس کے بعد باقاعدہ تعلیم کے لئے اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایف ایس سی کا امتحان سرینگر کے ایس پی کالج سے پاس کیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۴ء میں بنارس سے ہینڈلوم ٹیکنالوجی میں بی۔ ٹیک (B.Tec) کی ڈگری حاصل کی۔ بنارس سے واپس آنے کے فوراً بعد جموں و کشمیر ہینڈلوم ڈیولپمنٹ کارپوریشن میں ملازم ہوگئے۔ اس محکمے میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ اور آج کل سبکدوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

مظفر ایرج پہلے ایرج کاشمیری کے نام سے ادبی دنیا میں ۱۹۷۰ء کے آس پاس بحیثیت افسانہ نگار وارد ہوئے۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے اس دور کے اہم رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت بہت جلد اس سے اُکتا گئی اور وہ افسانہ کے بجائے اپنے جذبات کا اظہار شاعری میں کرنے لگے۔ شاعری کی مختلف اصناف کو برتنے میں مظفر ایرج یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل رہی ہے۔ اردو زبان کو برتنے اور اس میں شعر کہنے کی وجہ قرآن شریف کے اردو ترجمہ اور بنارس کے ادبی ماحول کو قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ بشیر احمد کے پوچھے گئے ایک سوال کا جواب ایرج یوں دیتے ہیں۔

> ''اردو نہ میری مادری زبان تھی نہ ہی اکتسابی زبان، یہ برکت قرآن کریم کی تھی کہ معمولی اردو سمجھتا تھا، پڑھتا بھی تھا، اور آہستہ روی سے لکھتا بھی تھا۔ بنارس پہنچ کر دن رات اسی زبان سے پالا پڑا اور اس زبان کو study کرنے کا اتفاق ہوا۔ ابتدا ہی میں مجھے ابن صفی کو پڑھنے کا موقعہ ملا اور ان کی تحریروں کے سحر میں اس طرح قید ہوا کہ نکلنا مشکل ہو گیا اور اس بہانے دوسرے ادباء و شعراء کا مطالعہ بھی ہوتا رہا۔ بنارس میں اُن دنوں طرحی مشاعروں کا رواج تھا اور ہر ہفتے کہیں نہ کہیں مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا اور سننے کے بعد مجھے بھی عادت پڑ گئی اور اس طرح ادبی سفر میں آگے بڑھتا رہا۔'' ۴۸

بنارس کی ادبی محفلوں، ابن صفی، میرؔ غالب اور دیگر اہم فن کاروں کے کلام کے مطالعے سے تحریک پا کر مظفر ایرج بھی شعر و شاعری کی طرف راغب ہوئے اور ان کے اندر چھپے شاعر نے غزل، نظم، نعت، حمد وغیرہ اصناف میں اپنی جولانیاں دکھانی شروع کیں۔ مظفر ایرج نے جذبات کی عکاسی کے لئے صنف غزل کو سب سے زیادہ موثر پایا۔ ستّر کے عشرے سے مسلسل ریاست اور ملک کے نامور اور موقر ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات میں موصوف کی غزلیں اور نظمیں زینت بنتی رہیں۔ جن میں شاعر، آجکل، انتساب، قرطاس، شیرازہ، شب خون، کتاب نما، سر سبز، بیسویں صدی وغیرہ خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔

مظفر ایرج کشمیر کے ان اہم غزل گو شعراء میں سے ہیں جنھیں اپنی فنی صلاحیتوں کی بنا پر ریاست کے ساتھ ساتھ ملکی سطح پر خوب سراہا گیا ہے۔ وہ اردو شاعری خاص طور سے اردو غزل سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کی دنیا میں ان کی پہلی باقاعدہ دستک ''ابجد'' ۱۹۸۳ء نام کے شعری

مجموعے سے سنی گئی۔ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس کو ادبی حلقوں میں خوب پزیرائی ملی۔اس کے بعد ''انکسار'' ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آیا۔اس کو بھی قارئین نے پسند کیا۔اس بیچ موصوف کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اور وہ لکھنے پڑھنے سے کچھ عرصے کے لئے دور ہوگئے تھے۔لیکن صحت یاب ہونے کے بعد وہ اپنے شعری سفر پر پھر سے گامزن ہوئے اور ۲۰۰۷ء میں خوبصورت شعری مجموعہ ''ثبات'' لے کر آئے۔اس کا انتساب مظفر ایرج نے اس وقت کے نام کیا ہے جس دوران وہ ادب سے ناچاہتے ہوئے بھی دور رہے۔لکھتے ہیں:

''اُن سات برسوں کے نام جن کے دوران میں سنجیدہ ادب پڑھنے لکھنے سے معذور رہا۔'' ۴۹

ثبات کے بعد ۲۰۰۹ء میں ''دل کتاب''، ۲۰۱۰ء میں ''ہودشت دیار'' اور ۲۰۱۲ء میں ''سخن آئینہ'' جیسے شعری مجموعہ وقفے وقفے کے بعد منصہ شہود پر آتے گئے۔جو ایرج کے ادبی تشخص کو مستحکم کرنے اور اردو شاعری میں ان کو انفرادیت عطا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔مذکورہ شعری مجموعوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مظفر ایرج کے اندر ایک بیکراں سمندر مسلسل موجزن رہتا ہے۔ان کے پاس خیالات و تجربات کا ایک وسیع کارواں ہے جو ان کو قلم اُٹھانے پر اُکساتا رہتا ہے۔جسکی بدولت وہ اردو شاعری کو اپنے مخصوص انداز میں اپنے تجربات اور محسوسات سے نئے نئے مضامین وموضوعات پر مشتمل اشعار و افکار سے مالامال کرتے رہتے ہیں۔

مظفر ایرج کا کلام روایتی فکر کے ساتھ ساتھ جدید حسیت اور عصری آگہی کی نمائندگی کا بہترین عکاس ہے۔انہوں نے روایات کی احسن پاس داری بھی کی ہے اور جدیدیت کی نمائندگی بھی۔ بلکہ انہوں نے قدیم اور جدید شعری تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا ہے اور دونوں کے امتزاج سے ایک نیا اور دلکش اندازِ بیان ایجاد کیا ہے۔جو ان کا اپنا ہے۔جس میں روایتی محبوب کے ناز ونخرے بھی نظر آتے ہیں اور دورِ جدید کے انسان کی محرومی، بے بسی اور لاچاری بھی دکھائی دیتی ہے۔مظفر ایرج کی غزلوں میں جدت وندرت اور قدیم وجدید شعری تفکرات کے دلکش امتزاج سے جو شعری منظر نامہ وجود میں آتا ہے اس میں ایک طرح کا نیاپن، تازگی اور اعتدال نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں محمد فرحت حسین خوشدل لکھتے ہیں:

''مظفر ایرج کی شاعری اعتدال پسند ہے۔اس لحاظ سے وہ غزل کے ایسے شاعر ہیں جن کی غزلوں میں ندرت اور جدت کے ساتھ ساتھ روایت پسندی کے عناصر بھی زندہ ہیں۔دوسرے لفظوں میں یہ بات بڑے اعتماد سے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ نہ روایت شکنی کو پسند کرتے ہیں اور نہ روایت پسندی

کو۔اس لئے ان کی شاعری اوران کے فکری رویہ کو میں اعتدال پسند پر محمول کرتا ہوں۔ان کی غزل میں جدید لب ولہجہ کا بانکپن بھی ہے اور منفرد جمالیاتی ذوق کی فراوانی بھی۔'' ۵۰

مظفر ایرج کی غزل میں انسانی زندگی کے گونا گوں مسائل حیات و کائنات کے بے شمار راز، سماج ومعاشرت کے اتار چڑاو وغیرہ موضوع کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ایرج فکر کے شاعر ہیں۔وہ اپنی ذات کے حوالے سے مختلف ومتنوع تجربات کوشعری پیکر عطا کرتے ہیں۔خودشناسی ایرج کی غزلوں کا ایک اہم موضوع ہے۔وہ اپنی شناخت اور ذات کے انکشاف کی تلاش وجستجو میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔اپنے من میں ڈھوب کر سراغ پانے کے سلسلے میں وہ جن مراحل سے گزرتے ہیں۔ان کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

میں اپنی ذات کے امکان میں ہوں
شنیدہ ناشنیدہ لامکاں تک
میرا وجود سراسر ہے جزولاینفک
ہے مجھ کو ذات کے اندر ہی ڈھونڈنا ممکن
یہ ٹوٹ پھوٹ مری ہوئی کہوں کیسے
نہیں مرا بھی ابھی مجھ سے رابطہ کوئی
اب ہوتی نہیں ہم سے کناروں کی تمنا
گرداب کی صورت سفرِ ذات میں گم ہیں
اک شعلہ فشاں دردِ پریشان کی طرح چپ
رہتا ہوں کسی بولتے انسان کی طرح چپ
ہیں چاندنی میں اسے ڈھونڈتا رہا ایرج
میں خود تو تھا مرا سایہ نہیں تھا رستے میں

مظفر ایرج کے کلام میں خودشناسی کا پہلو ایک اہم وصف ہے جو ان کی شعری شناخت اور انفرد میں معاون ومددگار ثابت ہوتا ہے۔اس ضمن میں بشرنواز لکھتے ہیں:

''کسی نئے شاعر کے ہاں جب کوئی مخصوص شعری رویہ راہ پا جاتا ہے تو اس کی اگلی منزلیں آسان ہوجاتی ہیں۔البتہ اس رویے تک پہنچنے میں اسے اپنی شخصیت کی شناخت بھی کرنی پڑتی ہے اور تکمیل بھی۔یہ کہنا مشکل ہے کہ ایرج

اپنی شخصیت کی تکمیل کر چکے ہیں۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ شخصیت کی شناخت کے عمل سے کامیابی کے ساتھ گزر چکے ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ان کے لہجے اور مخصوص اسلوب کی بنیادی وجہ بھی میرے نزدیک یہی خودشناسی ہے۔" ۵۱

مظفر ایرج نے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ زندگی کے متنوع رنگوں سے صنف غزل کو رنگین بنایا ہے۔وہ جن حالات، تجربات اور مشاہدات سے دوچار ہوتے اور جو کچھ محسوس واخذ کرتے اس کی عکاسی برملا اپنی غزلوں میں بڑی بے ساختگی کے ساتھ کرتے ہیں۔جس سے ان کی ذہنی آسودگی اور فکری بلندی کا پتہ چلتا ہے۔ان کے ذرخیز ذہن میں بے شمار موضوعات موجود ہیں۔جن میں حسن وعشق اور اس کے متنوع پہلو ایک اہم موضوع ہے۔ایرج نے اپنی غزل میں عشق ومحبت کی لطیف کیفیات کو نرم ونازک الفاظ کے استعمال سے بڑی خوبصورتی سے باندھا ہے۔محبوب کی یاد، ہجر کی سختیاں، وصل کی لذتیں وغیرہ غرض مظفر ایرج نے محبت اور حسن وعاشقی کے معاملات کو اپنے تجربات اور محسوسات کے مطابق بیان کیے ہیں۔چند اشعار دیکھئے ۔

کچھ تم بھی قریب آؤ کچھ ہم بھی قریب آئیں
دونوں کا ملن شاید بن جائے گا فسانہ

برسوں پرانی خوشبو مہکی
شاید تم نے یاد کیا ہے

کس کو دکھاؤں کیسے چھپاؤں
اُس نے پہلا خط بھیجا ہے

وصل کی خواہش قطرہ قطرہ
عشق سمندر دل دریا ہے

مظفر ایرج منفرد لب ولہجہ کے شاعر ہیں۔انہوں نے اپنے خیالات کو جدید حسی فکر کے تحت غزل کی صورت میں اُجاگر کیا ہے۔ان کی غزل معنوی تہہ داری سے بہرہ ور ہے۔جدیدیت کے اہم موضوعات کو ایرج نے اپنے تجربات ومشاہدات اور فکری میلانات کے مطابق غزل کا لبادہ پہنایا ہے۔جس میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔انہوں نے جدیدیت کے رجحان سے صرف انہی باتوں پر اکتفا کیا ہے جو ان کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہیں۔منفی اور لایعنی باتوں سے وہ اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔لفظوں کی بے جا جکڑ بندیوں اور ابہام گوئی کی بھول بھلیوں سے بھی دور رہتے ہیں۔وہ اپنے عہد کے

حالات وواقعات کا نظارہ کھلی آنکھ سے کرتے ہیں اور پھر ان کو اپنے مخصوص الفاظ کے سہارے سے شعری جامہ پہناتے ہیں۔ ایرج کے کلام میں سلاست روانی اور غیر مبہم اظہارِ بیان ملتا ہے۔ جوان کی غزلوں کو نیا اور منفرد آہنگ عطا کرتا ہے۔ اظہار کی بے ساختگی سے موصوف کی غزل میں ایک عجیب سی وارفتگی پیدا ہوتی ہے۔ مظفر ایرج اپنے دل کے جذبات کی لہروں کو بے ساختہ انداز میں شعر کے قالب میں ڈالتے ہیں جو قاری کے ذہن میں اتر کر بہت دیر تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

چراغ کوئی جلایا نہیں تھا رستے میں
یہ جال ہم نے بچھایا نہیں تھا رستے میں

اہل خرد کی چال میں مجھ سا دیوانہ آگیا
شام کو صبح لکھ گیا صبح کو شام کردیا

ہم بھی دے پاتے اگر سورج کا ساتھ
ہم بھی دن ڈھلنے کا منظر دیکھتے

وہ رستے اپناتا ہوں جن رستوں پر
دھوپ تمازت ہجر اداسی بچھتی ہے

بدن اسرار خواہش لمس خوشبو
عجیب دھند لاہٹیں میرے لئے ہیں

دل انسانی جسم کا لازمی جزو ہے۔ اس کے تصور کے بغیر انسان کا وجود ناممکن ہے۔ یہی دل ہمارے شعراء کے یہاں بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دل کے بارے میں ہر شاعر نے اپنے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مظفر ایرج نے بھی دل کے حوالے سے متعدد اشعار قلمبند کیے ہیں۔ یہاں تک کہ دل کی وادی کی روداد لکھنے کے لئے انہوں نے ''دل کتاب'' لکھ ڈالی ہے، جو دل اور اس سے متعلق ان کے جذبات اور خیالات پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔ مظفر ایرج نے اپنی مخصوص قلبی کیفیات کو برتنے کے لئے لفظ ''دل'' سے متعدد خوبصورت اور جاذب نظر تراکیب تراشیں ہیں۔ جیسے دل بستی، دل نگر، دل کتاب، دل درپن، دل بسمل، دل دامن، خون دل، کتاب دل، دل دنیا وغیرہ۔ ان تراکیب سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مظفر ایرج لفظ ''دل'' کو کتنے وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے اس لفظ کو اپنے وجود تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ تمام کائنات کو اس میں سمیٹا ہے۔ جس سے ان کی فنی بصیرت اور معنی کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ دل اور متعلقات دل پر مشتمل ذیل میں ایرج کے چند اشعار میرے اس دعوے کی تصدیق کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں ۔

دور خلاء سے ان کی تسلی کی خاطر
دل دنیا کا حال سنانا پڑتا ہے
دل بستی نہ دھواں نہ الاؤ
ہوگئے کیسے بسر اوقات
ایرج نے مارا شب خون
دل بستی پہ لگا کے گھات
چاند نگر میں ڈھونڈا آنگن میں دیکھا
ان کو پایا جب دل درپن میں دیکھا
کتاب دل کے پنے ان میں رکھ سکوں ایرج
میں اپنے بچوں کے بستے تلاش کرتا ہوں
وہ زلزلہ! کہ ہلیں دل نگر کی بنیادیں
وہ حوصلہ! کہ بسانا ہوا اسے ممکن

دل کی دنیا بہت ہی حسین اور خوبصورت ہوتی ہے جو اس کو پسند آتا ہے اس کو اپنے دامن میں بسانا چاہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے شعراء نے دل میں بس جانا، دل میں گھر کر جانا، دل میں سما جانا، دل میں اتر جانا، وغیرہ جیسی خوبصورت اور مسرت بخش تراکیب اور مرکبات کا بھرپور استعمال ہر دور میں کیا ہے۔مظفر ایرج کے یہاں بھی اس نوع کے متعدد شعر ملتے ہیں ۔

یہ ضد ہمیشہ رہا اب کے دل میں اتروں گا
کبھی تو ایسا ہو دل میں اتر کے ضد کرے
تمہارے شہر میں جانے کہاں سے اترا تھا
کہ ان دنوں کبھی کوئی اس کے دل میں بستا تھا
اس افرا تفری میں مجھ کو یاد رہی یہ بات
وہ دل میں اترے گا میں نے کب یہ سوچا تھا

دل اور دل کی دنیا کے اظہار کے لئے انہوں نے متعدد اشعار کہے ہیں۔اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ڈاکٹر اشرف آثاری ایرج کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مظفر ایرج کے ہاں دل انسان کی چھاتی میں دھڑکتا ہوا ایک عضو ہی نہیں ہے، جو انسانی جسم کی مشینری میں صرف خون صاف کرنے کا ایک پرزہ، ایک

آلہ یا ایک پمپ ہی ہے بلکہ مظفر کے ہاں لفظ دل بہت وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے۔انہوں نے اس لفظ دل کو اتنی وسعت، گہرائی وگیرائی دی ہے کہ اسے ایک کائنات بنا دیا ہے۔دل نگر، دل دنیا، دل بستی لکھ کر دل کے ساتھ ایک پوری کائنات کو جوڑ دیا ہے۔دل کے متعلق اس طرح کے علامتی اظہار اور تراکیب کا استعمال جدید اردو شعراء کے کلام میں ملتا ہے لیکن ہر شاعر کا اپنا اپنا منفرد اور الگ انداز اور اسٹائل ہوتا ہے۔'' ۵۲؎

مظفر ایرج زبان کو برتنے میں کامل دسترس رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے خیالات کی متاثر کن ترسیل کے لئے نئے نئے الفاظ اور تراکیب بھی وضع کیں ہیں۔ترکیب سازی اور استعارہ نگاری بھی ان کی غزل کی ایک نمایاں خوبی ہے۔مظفر ایرج کی غزلوں میں مستعمل تراکیب واستعارات جدید رنگ سے مملو ہیں۔شاعر کے فکروفن کو سمجھنے کے لئے اس کی زبان سب سے زیادہ معاونت کرتی ہے۔ایرج کی زبان سادگی اور شگفتگی سے متصف ہے۔انہوں نے اپنے تجربات اور تصورات کو آسان اور خود ساختہ لفظیات میں بیان کیا ہے۔مظفر ایرج نے بعض ایسے پیکر اور تراکیب تراشیں ہیں جو اردو غزل میں بالکل نئی اور انوکھی ہیں۔اس حوالے سے ایرج کی چند تراکیبیں یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔زعفران مٹی، جوگن روپ، نگاہ معتبر، لہو سمندر، بیکراں کہر، خواہش زیست، سلگتی دھوپ، چاند شراب، قلم کشید، برہانہ رات، گلنار شفق، لہو صورت، عشق جلیبی، ہانپتا وقت، گھر مندر، دل حویلی، دل کھیتی، دل آتش فشاں، خون شفق، دھوپ سمندر، ادھوری آنکھ وغیرہ ایسی تراکیب ہیں جو مظفر ایرج کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہی تراکیب اور الفاظ جب ان کے خیالات کا لباس پہنتے ہیں تو ایسے اشعار وجود میں آتے ہیں ؎

قلم کشید نظر بھر علامتیں جاناں
تمہارے نام مری سب عبارتیں جاناں

ہر طرف جاگی زعفران مٹی
جب بھی مہکا تمہارا جوگن روپ

برفاب آنکھ،خون شفق،شام سائبان
منہ حادثوں کا اور مجھے دیکھنا نہیں

یخ زدہ بیکراں کہر آلودہ
کون چٹان سے پھسلنے پائے

لہو صورت رگ وپے میں شامل

وہی جس شخص کو دیکھا نہیں ہے
میں پتھر کی سلوب میں جی رہا ہوں
کھنڈر جو ڈھو رہے ہو دل نگر ہے

مظفرایرج کی غزلوں کی زبان میں ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی زبان کے الفاظ کا برملا اور بے ساختہ استعمال کیا ہے۔ جس سے ان کی غزل میں ایک انوکھی فضا قائم ہوتی ہے۔ وہ ہندو دیو مالائی عناصر سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔ ہندی اور انگریزی زبان کے الفاظ کے استعمال سے ان کی غزلوں میں معنی ومفاہیم میں اضافہ ہوا ہے۔ مظفرایرج موجودہ دور میں زبانوں کے امتزاج سے پیدا شدہ صورت حال سے واقف ہیں اور اسی امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ موقع محل کی مناسبت سے اپنی شاعری میں اردو کے علاوہ ہندی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ اور تراکیب جابجا استعمال کرتے ہیں۔ جس سے ان کی غزل میں حسن اور دلکشی پیدا ہوئی ہے۔ مظفرایرج کی غزلوں میں استعمال شدہ ہندی الفاظ میں وردان، نروان، پوجا، پکشی، پریم، یگ، شنکر، راھا، کشن، جوگن، جیون، درپن، آکاش، دشا، روپ، نگر، ساجن، دیپ، ساون، بھوت، بھوکمپ، لکشمن وغیرہ۔ اسی طرح انگریزی لفظوں میں اسکیم، بم، ٹیکنالوجی، فٹ پاتھ، گلیشر، ڈرون، کمیشن، شوکیس وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار کلامِ ایرج سے نقل کرتا ہوں۔ ہندی الفاظ۔

جہاں چودہ برس تک رام جی کی لکشمن جی کی پرکھا تھی
اسی بن میں بھٹکتے پھرئے میری عمر گذری ہے
وہ جس کو جوگتے جیون بتایا
اسی جوگن کا غم ہے اور میں ہوں
پریشان ایک مدت سے ہوں گوکل کی منڈھیروں پر
نہ رادھا ناچتی ہے اب نہ کانا کی نفیری ہے
یہ کوئی لکشمن ریکھا نہیں ہے
مری دہلیز جب تک پار کرنا

انگریزی الفاظ۔

فٹ پاتھوں کی دھول سے نکلیں جب ایرج
شوکیسوں کی مانگ میں عالم رکھے گا
کیا عجب ٹیکنالوجی کی اس نئی تہذیب میں

مرد آہن پوش کوئی کانچ کی گڑیا لگے
یہ اتفاق ہے یا کوئی سوچی سمجھی سکیم
نہ ہنسنے دیتا ہے مجھ کو نہ آپ روئے ہے
ڈرون حملوں میں تو معصوموں کو مرواتا ہے
تجھ کو کیا دس فیصدی کمیشن میں تو ڈالر سمیٹ

مظفر ایرج کی غزلوں میں اردو کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں خاص طور پر ہندی کے الفاظ کے استعمال سے تاثیر و معنی آفرینی میں اضافہ ہوا ہے۔اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے افتخار اجمل شاہین لکھتے ہیں:

''ایرج کی زبان بڑی پیاری ہے۔کئی زبانیں جانتے ہیں شاید اسی لئے اپنے اشعار میں ہندی الفاظ کا بھی مہارت سے استعمال کرتے ہیں،اور یہ الفاظ اجنبی نہیں لگتے ہیں۔وہ ہندو دیو مالا اور ہندو مذہب سے بھی کما حقہ واقف لگتے ہیں،اور جہاں تک ضرورت ہوتی ہے،ان کا استعمال نہایت خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ایرج لفظوں کے تکرار سے شعری حُسن اور اثر پیدا کرتے ہیں۔وہ ہندی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی اور انگریزی الفاظ کا استعمال اتنی مہارت سے کرتے ہیں کہ زبان میں غرابت اور ثقالت ذرا بھی پیدا نہیں ہوتی بلکہ شعر کے ظاہر اور معنوی حُسن میں اور اضافہ کرتا ہے۔'' ۵۳

مظفر ایرج کی غزلوں میں کشمیر کے پُر آشوب حالات کی بھرپور عکاسی بھی ملتی ہے۔وہ اپنے وطن میں رونما ہونے والے حالات سے باخبر ہیں۔دیگر ہمعصر شعراء کی طرح مظفر ایرج بھی ان پُر درد حالات اور انسانیت سوز واقعات کی پیش کش اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔موصوف اپنے ہم وطنوں کی لاچاری،عدم تحفظ،خوف و دہشت،ظلم و زیادتی،انتشار،انسانی حقوق کی پامالی کو دیکھ کر جھنجھوڑ جاتے ہیں۔انہوں نے وہ دور بھی دیکھا تھا جب ہر طرف خوشی اور شادمانی تھی لیکن وقت نے ایک دم رُخ بدلا اور افراتفری،گولی،بارود،قتل و غارت گری اور نفسانفسی کا عالم ہر طرف پیدا ہو گیا۔اس صورت حال میں مظفر ایرج اپنے مجروح جذبات کی عکاسی علامتی پیرائے میں کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

میری بستی میں بھی آکر دیکھئے
حشر سے پہلے ہی محشر دیکھئے
سب کے ہاتھوں میں کھلونے موت کے

سب کی آنکھوں میں یہی ڈر دیکھئے
ایرج صاحب سانج سہے بارود پہ آکے بیٹھے ہیں
آگے کھائی پیچھے دشمن گھات لگا کے بیٹھے ہیں
زخموں سے تار تار پڑے ہیں ہزاروں جسم
عفریت اب کے بیٹھ گئے پہرہ ڈال کر
جسموں میں تپش ہے نہ ہی سانسوں میں حرارت
اس شہر میں اک شخص بھی زندہ نہیں لگتا
جانے یہ آگ کس نے لگائی میرے گھر میں
کھڑکی نہ ہی دیوار نہ ہی در ہے سلامت
بس ہاتھ آیا دھواں راکھ ادھ جلی لاشیں
بھلا زمانے میں کی خون کی بوائی کیوں
میں اپنے جسم پر بارود باندھے
تمہاری راہ میں کب سے کھڑا ہوں

مذکورہ اشعار کی قرأت سے کشمیر میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی روح فرسا تصویر نظرنواز ہوتی ہے، جہاں حشر سے پہلے ہی محشر کا سماں قائم کیا گیا ہے۔ جہاں کھیل کود اور سیر تماشے ہونے چاہیے وہاں بم اور بارود کی گرن گرج سنائی دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں بے گناہوں اور معصوموں کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے اور ہر سو لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی ہیں۔ آئے روز ایسے واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں کہ گھروں کے گھر چشم زدن میں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کو زندہ جلایا جاتا ہے۔ ہر طرف دھواں اور ادھ جلی لاشیں اور خون ہی خون کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس ماحول میں رہنے والا ہر شخص عدم تحفظ کا شکار ہے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا انسانیت سوز نظارہ دیکھتے وقت مظفر ایرج کا دل کس طرح تڑپتا ہے۔ اس کا اظہار وہ یوں اپنے اشعار میں کرتے ہیں ۔

ہر سو آگ، دھواں، لاشیں، بارود کی بو
دل روداد سخنور کوئی کیوں کر لکھے
اس کو کاٹا، اس کو مارا، اپنا بھی گھر لوٹ لیا
ہم ہی درندوں نے بچوں کے منہ کا فیڈر لوٹ لیا
کیسی بستی ہے یہ کس طرح کے باسی ہیں یہاں

جو ملا اس کے دل وجاں میں ڈر دیکھا ہے
کس کس نے دفنائے پھولوں جیسے لوگ
کس کس نے بارود کو پوجا دھرتی پر
دورِ فرعونی ہے، ہیں بچوں کی جانیں داو پر
ماں بہا دینا ابھی جہلم کے دھارے پر مجھے

ایرج کی غزلوں میں وادی کی کربناک صورت حال کی پیش کش کے ضمن میں دیپک بدکی لکھتے ہیں:

''مظفر ایرج جس یگ میں جی رہے ہیں اس میں بارود کی بو ہے، دھواں ہے، یورش عفریت ہے اور ہر سو ویرانی ہی ویرانی ہے۔ اس کے شہر میں عدم تحفظ کے باعث ہر شخص ڈرا سہما رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر کے موجودہ حالات نے شاعر کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے اور یہی درد وکرب ان کی شاعری میں بار بار اُبھر آتا ہے۔'' ۵۴

مظفر ایرج کی غزل مختلف اور متنوع پہلوؤں سے متصف ہے۔ ان کے کلام کی انفرادیت کا راز حیات وکائنات کے عمیق مطالعہ اور مشاہدے کی پیش کش میں مضمر ہے۔ وہ غزل کی باریکیوں سے اچھی طرح شناسائی رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایتی ردیف وقافیے بھی ملتے ہیں۔ البتہ زیادہ تر غزلوں میں جدید اور نئے ردیف اور قوافی کو ہی فنی چابکدستی سے برتا ہے۔ بحور کے انتخاب میں بڑی فن کاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چھوٹی بحروں کے ساتھ ساتھ بڑی بحروں میں بھی اچھی خاصی غزلیں کہیں ہیں۔

یوں نہ برفیلی ہوائیں جسم میں بے کار چن
اپنے میرے بیچ کوئی ریشمی دیوار چن

میرا ذوق تجسس باریابی ہے
میرا رنگ نظر آوارگی ہے

لہو سے دیپ جلا کر اندھیری راتوں میں
وہ میرا نام ہواؤں کے رُخ پر لکھتا ہے

دھوپ سے روشنی چرا لیتے
کاش یہ پل یہی ٹھہر جاتا

مظفر ایرج کے کلام میں رنگوں کا حسین امتزاج بھی ملتا ہے۔ وہ مختلف رنگوں کے ذریعے بھی

اپنے جذبات کی ترسیل کرتے ہیں۔ان کی غزلوں میں سرخ، سیاہ، سبز، زرد، نیلا وغیرہ مختلف رنگوں کا جا بجا استعمال ہوا ہے۔وہ ان رنگوں کو علامتوں کے طور پر بروئے کار لاتے ہیں، اور اپنی فکری صلاحیتوں کو زیب قرطاس کرتے ہیں۔مظفر ایرج کی شاعری میں یہ مختلف رنگ طرح طرح کی علامتوں کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں، اور ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں۔موصوف زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے مختلف رنگوں کا استعمال کرتے ہیں۔مظفر ایرج اپنے جذبات کو ان رنگوں کے ذریعے کچھ اس طرح متشکل کرتے ہیں۔

سات رنگوں کی بشارت دے نہ پایا تھا ابھی
روشنی کے شہر میں ایرج کو لٹکایا گیا
بے صدا آہٹوں کا سرخ گلاب
زرد لمحات میں نہ مُرجھاتا
اداسیوں سے بھی دھوپ گزری تھی حادثوں کی
دھواں دھواں ہے ہرا سمندر یہ حادثہ تھا
نیلا پیلا غبار تنہا پیڑ
میرے آنگن میں چاند بھی گھبرائے

مظفر ایرج کی غزلوں میں زبان و بیان، عصری آگہی اور فنی بصیرت و بصارت کو اہمیت دیتے ہوئے پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''مظفر ایرج کے یہاں زبان اور استدلال کا جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔وہ ان کے فکری سرمائے میں نئی حسیت سے وابستہ شاعری کے اپنی عناصر کو جگہ دیتا ہے۔جنہیں اہم اور معتبر شعراء کے حلقوں میں اعتبار حاصل ہے۔ان کے افکار مختلف تخلیقی اور فکری فضا کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔انہوں نے افکار و اظہار کے مختلف زاویوں کو اپنا کر معاصر عہد کی تخلیقی فکر کے مستحکم میدان میں جذباتی نفسیاتی اور فکری منظرنامے کے مابین رابطے کی جو مسلسل کوشش کی ہے۔ان میں شعری مواد کی بہت اہمیت ہے۔انہوں نے ہر ممکنہ کوشش کی ہے کہ سماجی مسائل کے متعلق مشاہدہ براہ راست ہو۔''[۵۵]

مظفر ایرج کے کلام کے مطالعے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ ان کی شاعری میں وہ سب کچھ ہے جو آج کے اس عہد کی بھرپور عکاسی اور ترجمانی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور محاوروں کے

برجستہ استعمال سے جگمگا رہی ہے۔ دوستی، دشمنی، دل شکنی، مصلحت پسندی، جھگڑے فساد، پیار و محبت، رشتے ناطے، وفا خلوص جیسے نازک موضوعات کو بھی انہوں نے شعری پیکر میں ڈھالا ہے، وہ بھی غزل کی پوری روایت کو برقرار رکھتے ہوئے۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ کہیں بھی غزل کے حسن کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

میرے حریف ہیں اک دوسرے سے صف آرا
کسی کو زخم لگا میری آنکھ بھر آئی

ہو دشمنی کی کوئی بات یا محبت کی
مہکتی یونہی رہے احترام کی خوشبو

دشمنی کی اس کشاکشی کا سیہ دفتر سمیٹ
دوست ہے تو میرے حصّے کے بھی پتھر سمیٹ

ابھی تو بوئی دلوں میں ہے فصل نفرت کی
زمیں سینچ ابھی سے ثمر کی بات نہ کر

وہ پس پردہ مرے قتل کے در پے ہے ابھی
اور کھلے عام مرے حق میں سفارش کتنی

ایرجؔ کی غزلوں کے اس نئے انداز اور پیش کش کے متعلق ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی رقمطراز ہیں:

"مظفر ایرج کی غزلوں کی معطر فضا میں فن کے ساتھ فکر و فلسفہ زندگی کے بہت سارے راز پوشیدہ بطون میں نظر آتے ہیں۔ جن میں زبان و بیان کی رنگینیاں ہیں تو دوسری طرف مشاہدے کی آفرینناں بھی انسانی فطرت، امنگ اور کیفیات کی حاصل ہے۔ جو رزم بزم خلوت و جلوت، ناز و نیاز، ہجر و وصال غرض ہر میدان اور ہر مقام علیحدہ عمل کی عکاس ہے۔ مظفر ایرج کا وصف یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اور ہر عمل کو ایک نئے پہلو سے دیکھتے ہیں۔ انوکھے زاوئے سے پرکھتے ہیں اور دلفریب انداز میں بیان کرتے ہیں۔" ۵۶

مظفر ایرج کے کلام کو برصغیر کے معتبر ناقدین اور دانشوروں نے خوب سراہا ہے۔ اس حوالے سے چند مشاہیر کی آراء کا نچوڑ پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ایرج کی شاعری پُراثر، تازگی، متنوع اور ندرت بیان سے پُر ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کو موصوف کی غزل کے لہجے میں طمانیت نظر آتی ہے۔ بشیر نواز کو مظفر ایرج کی غزلوں میں زندگی کی کشمکش کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ سید شباب

کے نزدیک مظفر ایرج کی غزل کا اہم وصف ان کے اسلوب کی تازگی اور لہجے کی ہمواری میں مضمر ہے۔رئیس الدین رئیس ان کی غزل کو معاشرتی حالات ور جحانات کی عکاس ٹھہراتے ہیں۔سلمیٰ حجاب کا ماننا ہے کہ مظفر ایرج کی غزل جدید کاری کی زندہ مثال ہے۔حکیم منظور کے نزدیک ایرج کے کلام کی اساس ان کی مخصوص فکر پر ہے۔اسی طرح ساحل احمد کا کہنا ہے کہ مظفر ایرج کی غزلوں کی سب سے اہم خوبی تہہ داری اور دل پزیری ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مظفر ایرج اردو غزل کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں لہجے کی متانت اور طمانیت بھی ہے اور فکر وفن کی تازگی بھی۔زبان وبیان میں ندرت اور تازہ کاری بھی ہے اور اظہار خیال کی سادگی بھی۔موضوع ومضامین میں تنویعت بھی ہے اور الفاظ وتراکیب کی فراوانی بھی۔موصوف اپنی انہی خوبیوں کی بدولت ریاست جموں وکشمیر کے شعری افق پر ایک روشن ستارے کے مانند درخشاندہ رہیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رفیق رازؔ

غزل کے تاریخی سفر میں ایک دور ۱۹۶۰ء کے آس پاس شروع ہوا جس کو جدیدیت کے دور کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ریاست جموں وکشمیر میں بھی کئی شعراء نے جدیدیت کے رجحان سے اپنی ہم آہنگی کا اظہار کیا ہے۔اس حوالے سے جن شعراء نے یہاں شروعات کی ہے ان میں حکیم منظور، حامدی کاشمیری، یٰسین بیگ، فاروق نازکی، ہمدم کاشمیری کے بعد ایاز رسول نازکی، فاروق مضطر، احمد شناس، پرتپال سنگھ بیتاب اور رفیق راز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

رفیق احمد المعرف رفیق راز ۱۹۵۰ء میں سرینگر کے علاقہ براری پورہ میں ایک صاحب ثروت اور معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد محترم خواجہ علی محمد شمیر اک سرینگر کے صاحب توقیر اور معززین میں شمار کئے جاتے تھے۔رفیق راز اپنے والدین کے لاڈلے تھے۔ان کی ہر جائز وناجائز خواہش آن کی آن میں پوری کی جاتی تھی۔ان کی تعلیم وتربیت پر بھی خاص توجہ دی گئی۔تعلیم کا باقاعدہ آغاز سرینگر کے شہر آفاق مشنری اسکول ٹینڈل بسکو میموریل میں کیا۔یہاں سے رفیق راز نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔میٹرک مشن ہائی اسکول فتح کدل سے ۱۹۶۶ء میں پاس کیا۔بی اے، ایس پی کالج سے ۱۹۷۳ء میں پاس کیا۔بعدازاں کشمیر یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کا آغاز شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرار سے کیا۔یہاں پر ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۲ء تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔اسی دوران ریڈیو کشمیر سرینگر

میں پروگرام ایگزیکیٹو کی اسامی پر آپ کا تقرر ہوا۔ ریڈیو میں ہی ملازمت کے دوران ترقی کے مختلف منازل طے کرتے کرتے ڈائریکٹر کے اعلیٰ عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

رفیق راز نے اپنے شعری سفر کا آغاز ۱۹۷۰ء کے آس پاس ایس پی کالج کے زمانہ طالب علمی کے دوران کیا۔ کالج میں منعقد کی جانے والی ادبی نشستوں کی بدولت ان کا شعری ذوق پروان چڑھا اور جستہ جستہ انہوں نے بھی اپنی تخلیقات کو کالج کی محفلوں میں پیش کرنا شروع کیا۔ اپنے اساتذہ پروفیسر محی الدین حاجنی اور پروفیسر غلام نبی فراق سے خوب داد و تحسین حاصل کرتے رہے۔ اپنے شعری ذوق کو برقرار رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی نگارشات کو ملک کے مختلف رسائل و جرائد کو بہ غرض اشاعت بھیجنا شروع کیں جو تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ ہندوستان کے جن موقر جرائد میں آپ کا کلام کثرت سے شائع ہوا ہے ان میں ''شب خون، مباحثہ، تحریک ادب، آجکل، شیرازہ، اثبات، نئی کتاب، انتساب عالمی، سرسبز وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ریاستی اور ملکی سطح پر منعقد ہونے والے کل ہند مشاعروں، سمیناروں اور ادبی کانفرنسوں میں بھی آپ شریک ہوتے رہتے ہیں۔

رفیق راز اپنے جذبات اور محسوسات کا اظہار اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں کرتے ہیں اور دونوں زبانوں کو برتنے میں کامل دسترس رکھتے ہیں۔ کشمیری زبان سے قطع نظر اردو میں ان کے اب تک تین شعری مجموعے منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ رفیق راز کا پہلا شعری مجموعہ ''انہار'' کافی تاخیر کے بعد ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا ہے۔ جس میں ان کا تقریباً ۳۰ برس کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ اس مجموعے میں شامل بیش تر کلام ریاستی اور ملکی جرائد میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کو ملک بھر کے قارئین سے کافی پزیرائی ملی ہے۔ البتہ مجموعہ منظر عام پر آنے سے رفیق راز کے قدر دانوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ ''مشراق'' ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اور تیسرا مجموعہ ''نخل آب'' ۲۰۱۵ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ راز کے یہ تین شعری مجموعے اردو شاعری خاص طور پر جدید اردو غزل میں ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رفیق راز اپنے پہلے مجموعہ کی اشاعت میں تاخیر کشمیر کے حالات اور اپنی مصروفیات کو ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''میرا پہلا مجموعہ ''انہار'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ میری شاعری کا آغاز یوں تو ۷۵-۱۹۷۴ء کے آس پاس ہوا تھا اس لحاظ سے میرا پہلا شعری مجموعہ کافی پہلے شائع ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا کچھ تو کشمیر کے نامساعد حالات اور کچھ میری تساہل پسندی کی وجہ سے نہ ہو سکا۔'' ۵۷

احمد فیضان رفیق راز کی شناخت اور پہچان میں ان کے شعری مجموعہ ''انہار'' کی اہمیت پر تبصرہ

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رفیق راز اس مجموعہ کلام ''انہار'' کی اشاعت کے قبل ہی اردو شعر وادب کی دنیا میں پہچانے جانے لگے تھے اور ''شب خون'' میں کثرت سے شائع ہونے کے سبب لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں بھی کامیاب رہے تھے۔اس مجموعہ کلام کی اشاعت نے ان کی شناخت اور پہچان کو مزید استحکام بخشا جس کے ذریعے ناقدین اور قارئین کو ان کی انفرادیت اور اہمیت کا احساس ہوا۔'' ۵۸

رفیق راز نے اردو شاعری کا سفر جدیدیت کے دور عروج میں شروع کیا۔انہوں نے اپنے جذبات صنف غزل کے ذریعے جدیدیت کے تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھ کر پیش کیے ہیں۔رفیق راز بھی اپنے معاصرین کی طرح غزل کے لئے عہد جدید کے ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو مختلف لفظیات، ہئیت اور آہنگ کے اعتبار سے کچھ نیا اور انوکھا کرنے کی قوت اپنی لسانی تشکیل میں رکھتے ہیں۔رفیق راز نے مغربی اور دیگر مشرقی زبانوں کے ادب کے براہ راست مطالعے اور تراجم کے سرمائے کے مطالعے سے بھی نئے امکانات اپنی شاعری میں پیدا کیے ہیں۔رفیق راز نے عربی، فارسی اور اردو کی روایتی شاعری بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بہت گہرا اثر لیا ہے۔لیکن مشاہدے اور ادب میں لسانی اور تخلیقی سطح پر ہورہی تبدیلیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس جرأت مندی سے انہوں نے شاعری کی مروجہ پیکروں میں تبدیلی لانے کی سعی کی ہے اس سے آنے والی نسلیں بھی فیضیاب ہونگی۔اس سے ان کی شاعری میں جدت اور ندرت کا سراغ ملتا ہے۔چنانچہ کہتے ہیں ؎

نخل ہوس کے سائے میں چلنے سے پیشتر
باغ بدن پہ چھائی کیسی بہار دیکھو
آنکھوں کے آسماں پر اک مہر سا ہے تاباں
اک خواب سا ہے روشن تاریک شامِ ہجراں
گیا ہوا وہ ہجوم نالہ کشاں
شہر کیوں آج بے صدا ہے بہت
ایک نئے انصاف کا منظر ابھرے گا
ڈوبنے والوں میں ہوگا تنکا تقسیم
مکان تو ہوچکا ہے راکھ جل کر

چھڑی ہے جنگ کس پر وارثوں میں

رفیق رازؔ کی غزلوں کا نمایاں وصف حسی تجربوں کا حیرت انگیز انعکاس ہے۔ان کی شاعری میں متعدد اشعار ایسے ملتے ہیں جو انسان کے حواس خمسہ میں سے کسی نہ کسی حس کو اور بعض اوقات کئی حسوں کو متحرک کرتے ہیں۔رفیق راز نے نادر و نایاب تراکیب کا استعمال کر کے حسی تجربات کی ایک انوکھی دنیا خلق کی ہے۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

آوارہ سیہ دشت میں تصویرِ صدا ہے
سوکھے ہوئے خوابوں کا شجر نغمہ سرا ہے

اک خموشی کہ مہکتی ہے مرے کمرے میں
ایک آواز کہ ہے نقوش یہ دیوار سیہ

کرۂ شب کے طلسمات کے جنگل میں پڑا
شعلہ لمس کی خوشبو میں نہائے جانا

خزاں رسیدہ ہر ایک صفحۂ قرار پہ اک دن
سنہری یاد کے جھرنکوں نے سبز خواب لکھا

تو نہیں تیرا تصور ٹمٹما تا ہے ابھی تک
ریگ زار شب میں جیسے بوند کوئی روشنی

بوسۂ برق، لمس دودِفنا
صبح تک کیا سے کیا ہوا شعلہ

مرقومہ بالا اشعار پر غور کریں تو ہر ایک شعر میں کوئی نہ کوئی حسی پیکر تراشا گیا ہے۔جیسے پہلے شعر میں تصویر سے بصری حس اور صدا اور نغمہ سے سمعی حس متحرک ہوتی ہیں۔دوسرے شعر میں مہکی سے شامی حس اور نقش بہ دیوار سے بصری حس۔تیسرے شعر میں شعلہ لمس سے لامسی حس خوشبو سے شامی حس اور نہائے جانا حرکی حس، چوتھے شعر میں سبز خواب سے بصری حس جھونکوں سے حرکی حس اور ٹمٹما تا سے بصری حس اور آخری شعر میں بوسۂ برق سے بیک وقت بصری، لامسی اور حرکی حس اور دودِفنا سے شامی اور بصری حس برانگیختہ ہوتے ہیں۔رفیق راز کے کلام کے مطالعے سے یہ اور اس طرح کے بہت سارے اشعار ملتے ہیں جن میں راز نے حسی پیکروں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ تراشا ہے۔

رفیق راز کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بھی کم نہیں ہیں جو متصوفانہ فکر سے لبریز ہیں۔چونکہ رفیق راز کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں اور کشمیر صوفیوں، ریشیوں، ولیوں اور قلندروں کا مسکن رہا

ہے۔ یہاں کے طول وعرض میں ان خدادوست بزرگوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ چھوٹے گاوں سے لیکر قصبوں اور شہروں میں ان بزرگوں کی رہائش رہی ہے جہاں پر یہ علم ومعرفت کے جام لوگوں کو پلاتے رہے ہیں۔ کشمیر کی ان برگذیدہ ہستیوں میں بعض حضرات نے کلام موزوں میں اپنے ادراک وعرفان کو اجاگر کر کے اپنے عقیدت مندوں کے لئے گنج ہائے گرانمایہ مہیا کیا ہے۔ ایسی شخصیات میں شیخ العالمؒ، صمد میر، احد زرگر، لل عارفہ، شمس فقیر، عبدالوہاب خار، سوچھ کرال، رحیم صاحب سوپوری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء کے کلام میں تصوف کے متنوع پہلو پوری وضاحت کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ ان صوفی شعراء کے ریاست میں بے شمار شیدائی ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے کلام سے مستفیض ہوتے ہیں۔ ان شیدائیوں اور عقیدت مندوں میں رفیق راز بھی شامل ہیں۔ رفیق راز نے ان صوفیوں سے متاثر ہوکر علم وآگہی کی منازل مسخر کر کے اپنے متصوفانہ فکروں کو شعری لباس پہنانا شروع کیا۔ اس طرح ان کی غزلوں میں تصوف اور اس کے اسرار ورموز کے بیسوں مضامین در آئے ہیں۔ جو ان کی انفرادیت پر دال ہیں۔ چند اشعار دیکھئے ؎

پیاس میری بھی بجھاتے ہیں پہاڑی جھرنے
ورنہ مامور ہیں یہ تیری ثناء خوانی پر
روح کی خاموشیوں کو جانے کیا سوجھی کہ بس
رات کے پچھلے پہر سر پر اُٹھایا آسماں
اے خدا تو ہے محیط وسعت لا انتہا
اور سب ان وسعتوں کا ایک سایہ آسماں
مکاں بھی راکھ میں تبدیل ہورہے تھے اور
ہوا بھی ناچ رہی تھی تیرے اشاروں پر
فقر کی دولت سے مالا مال ہیں اللہ ہو
ہم نظر رکھتے نہیں دنیا درم ودینار پر

ایک جگہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ صوفیوں کی صحبت کا رنگ ان کی شاعری میں جھلک رہا ہے۔

رازؔ کرتا ہے زبان خامشی سے تو عیاں
صوفیوں کا رنگ چھایا ہے ترے اظہار پر

رازؔ کی شاعری میں تصوف کے متنوع پہلو جابجا نظر آتے ہیں۔ کہیں پر ان کو ندی ثناء خوانی

کرتی نظر آتی ہے تو کہیں پر تیز آندھی میں جلتا ہوا دیا دیکھ رہے ہیں۔ کہیں ابلتے چشموں میں خدا کی خدائی دیکھتے ہیں اور دنیا کے رنگوں اور نظاروں میں خدا کے جلوے محسوس کر رہے ہیں۔ ؎

تمہیں نہ ہوتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہو
تمہیں سے ہوتی ہے نشو ونمائے دیدہ ودل
وہ ندی محو ثناء خوانی خالق بھی تھی
کھیت کی پیاس بجھانے پر ہی مامور نہ تھی
تجھ سے ہی روح کی شمع روشن رہی تیز آندھی میں بھی
تجھ سے ہی مثلِ فانوس یہ جسم کا خاکداں دشت میں
دل میں ہے نقش، لب پہ جاری ہے
اسم تیرا کہ اسم اعظم ہے
تو نے ہی منظروں کو بخشی ہے تابنا کی
تو نے ہی دھند کے یہ پردے بھی تو بنائے
کس نے دیا یہ حکم کہ چشمے اُبل پڑے
توڑا یہ کس نے کوہ پُر اسرار کا غرور
اب بھی وابستہ ہیں اُمیدیں تمہیں سے ہم کو
اب بھی ہوتی ہے تیری حمد و ثناء دھرتی پر

ایک جگہ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے تیری تعریف وثناء دو زبانوں یعنی کشمیری اور اُردو میں کی ہے، لہٰذا مجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرما کر مجھے بھی سر بلندی اور سرخروئی سے نواز دے۔

مجھے بھی دو جہانوں میں سرخ رو کردے
کہ میں نے تیری ثناء کی ہے دونوں زبانوں میں

ڈاکٹر شفق سوپوری کے نزدیک رفیق راز صوفی نہیں ہیں لیکن ان کے کلام میں متصوفانہ اشعار کی تعداد کثرت سے موجود ہیں۔ جو ان کے گہرے تفکر کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''رفیق راز صوفی نہیں ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی متصوفانہ فکر ان کے اشعار کی جان ہیں اور یہ اشعار شعریت سے معمور بھی ہیں اور معاصر فکر کے ترجمان بھی رفیق راز کی شاعری کے فنی اور فکری پہلو جس قدر گہرے ہیں اتنے ہی متنوع بھی ہیں۔ ان کی فکر کے وقار نے ان کی شاعری کو ایک انوکھا

آہنگ عطا کیا ہے جس میں متصوفانہ لے کی حرکت اور حرکت سے پیدا ہونے والی حرارت جوہر کی طرح موجود ہے۔لہٰذا ان کی شاعری ایک ایسے منور نقطے کا درجہ رکھتی ہے جیسے ان کی شاعرانہ شخصیت اور روحانی فکر کا سنگم کہا جا سکتا ہے۔رفیق راز کا ہر مشاہدہ اور تجربہ کسی نہ کسی طرح ایک پروقار لے کے ساتھ متصوفانہ مرکز پر منتج ہوتا ہے۔لہٰذا ان کی شاعری کا ایک امتیازی پہلو یہی رجحان ٹھہرتا ہے۔'' ۵۹

اسی طرح میکش امروہی رفیق راز کی غزلوں کے صوفیانہ عناصر کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رفیق راز ہمارے عہد کے ان شاعروں میں ہیں جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے تخلیقی عمل میں کسی خاص تحریک یا رجحانی عناصر کو اہمیت نہیں دی ہے۔یہ ضرور ہے کہ ان کا بیشتر کلام ''شب خون'' میں شائع ہوا ہے۔اس لئے ان کو نظریاتی جوش کے زیر اثر خالص جدیدیہ یا شب خونی طرز عمل کا شاعر بھی کہا جا سکتا ہے لیکن پھر ان صوفیانہ موضوعات کا کیا کہیے گا جو ریاست جموں وکشمیر کے سب سے متنوع اور کبھی نہ ختم ہونے والے موضوعات ہیں اور جن کا ذکر رفیق راز کی غزلوں میں بکھرا پڑا ہے۔یہ اور اس قسم کی متعدد دلائل رفیق راز کے پہلے مجموعہ کلام ''انہار'' میں بھی موجود تھے اور ''مشراق'' میں انہوں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا ہے۔''مشراق'' میں شامل غزلوں کی جو سب سے اہم خصوصیت مجھے نظر آئی وہ یہ کہ ان کے بعض اشعار جو تصوف بالخصوص وادی کشمیر کی مستحکم روایت کو ایک طرح سے زندہ کر دیتے ہیں اگر کوئی روایت پرست محض ان اشعار کے آئینے میں رفیق راز کی شعری قدر کا تعین کرے گا تو اولاً صوفی شاعر قرار دے گا۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ رفیق راز کی تقریباً ہر غزل میں کوئی نہ کوئی حمد یا نعت کا شعر ضرور ہوتا ہے۔'' ٦٠

رفیق راز کی شاعری کا ایک اور نمایاں پہلو فکر کی گہرائی ہے۔وہ بنیادی طور پر فعال اور متحرک فکر کے شاعر ہیں۔ان کی فکر کا میدان محدود نہیں لامحدود ہے۔موصوف کو کسی مخصوص تحریک، رجحان اور مقصد سے منسلک نہیں رکھ سکتے ہیں۔ان کا انداز بیان اور لہجہ بھی ان کا اپنا ہے۔جس میں وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے ہیں۔رفیق راز کائنات کے اسرار و رموز کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی غور و فکر ان

چیزوں پر مرکوز کرنے کے بعد اپنے منفرد انداز اور اسلوب کے ذریعے اپنے قارئین پر بھی ان اسرار ورموز کا انکشاف کرتے ہیں۔ جو اس کے تجربات کا حاصل ہوتے ہیں۔ رفیق راز کا کلام فکر اور اسلوب کی خوبصورت ہم آہنگی سے متصف ہے۔ راز کی شاعری میں بلندی فکر کا اندازہ ان کے درجہ ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

برگ آوارہ ید بیضا مجھے لگنے لگا
قہر ساماں موسموں کی ابتدا ہونے کو ہے

پتھر سے پھوٹتا ہے کہیں چشمہ شعاع
یہ کس فضول شوق میں ہم مبتلا ہوئے

رکتا ہوں ہر اک موڑ پر آنکھوں میں لئے دھوپ
ڈرتا ہوں وہی نقش نمودار نہ ہوجائے

موج بے قابو کو تیروں کی حفاظت مل گئی
پھول جیسے لب کے حق میں تشنگی لکھی گئی

شرار برق فنا تو مرے لئے تھا خبر ہے
مگر وہ شعلہ لب رنگ کن لبوں کے لئے تھا

رفیق راز کی فکر کے متنوع پہلو ہیں۔ جو ان کے گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے کا مثبت نتیجہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی رفیق راز کے کلام میں فکری آہنگ کو قابل ستائش قرار دیا ہے۔ وہ رفیق راز کو اپنے عہد کے اہم اور منفرد شعراء میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رفیق راز کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں پہلو اس کا فکری آہنگ ہے۔ غزل کے بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں رہی کہ اسے سادہ اور میٹھا اسلوب ہی درکار ہے۔ بعض لوگوں نے غزل میں استعارے کو بھی ناپسند کیا ہے۔ بعض لوگوں نے غزل سے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی و داخلی وارداتوں پر مبنی مضامین ہوں۔ رفیق راز اُن شعراء میں نمایاں ہیں جنھوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ رفیق راز کی عمر بھی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے لہجے اور افکار دونوں میں تمکین اور پختگی کے آثار نمایاں ہیں۔ گردو پیش کی زندگی اور شاعر کے احساس اور ذات کا اس سے محاربہ

رفیق راز کی غزل کا خاص موضوع ہے۔انہیں اپنے محسوسات اور مشاہدات کو
شعر کے قالب میں ڈھالنے میں کوئی مشکل اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ شعر کے
تقاضوں کو باقی تمام چیزوں پر مقدم جانتے ہیں۔'' ۶۱

وادی کشمیر گذشتہ تین چار دہائیوں سے جن پرفتن حالات سے گزر رہی ہے اس کا براہ راست اثر یہاں کی معاشی، معاشرتی، مذہبی، تمدنی، تہذیبی اور سیاسی زندگی پر پڑ رہا ہے۔شاعر اپنے معاشرے کا ایک ذی حس فرد ہوتا ہے۔وہ چاہ کر بھی اپنے گردونوح میں رونما ہونے والے حالات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا ہے۔کیونکہ اس کی شاعری کی خمیر اپنے سماجی وثقافتی حالات وواقعات سے ہی تیار ہوتی ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شاعر یا فنکار کی شعوری یا لاشعوری سرگرمیوں کی جڑیں معاشرے میں پیوست ہوتی ہیں۔انہوں نے ان حالات اور حادثات کو خود بھی جھیلا ہے اور ان کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے۔پھر اپنے محسوسات کو شعری لباس پہنا کر ان کو یوں بیان کرتے ہیں۔ ؎

کھلتی ہے آنکھ جلتے مکانوں کے درمیاں
لگتی ہے آنکھ پڑھ کے فسانے ثمود کے

کچھ بھی نہیں ہے اب یہاں ناممکنات میں
اس شہر نامراد میں ایسا ہوا بھی ہے

لرزتی شاخ ہوا پتیاں دو چار
کچھ ایسے قہر سے ہی ہم بھی ہیں میاں دو چار

جامدوساکت ہر اک منظر ہراساں موت کے ڈر سے
شہر میں رقصاں فقط لٹکی ہوئی تلوار کا سایہ

سپرد خاک ہوئے آج بھی کئی معصوم
سپردنار ہوئیں کل بھی بستیاں دوچار

کشمیر میں روزافزوں حالات نامساعد رہتے ہیں۔ایسے عالم میں عوام وخواص کی زندگی ہر سطح پر متاثر رہتی ہے۔ہر پل حالات بدلتے رہتے ہیں۔ہڑتالیں' کرفیو' نظر بندی وغیرہ باشندہ گان کشمیر کی زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔خوف ودہشت' افسردگی' مایوسی' تنہائی' عدم تحفظ نے کشمیری عوام کی زندگیوں کو اذیت ناک بنا دیا ہے۔ایسے حالات میں رفیق راز جیسے حساس شاعر سوچ وفکر میں ڈھوب کر اپنے قلم کو جنبش دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

چاروں اور کے منظر شعلہ شعلہ ہیں

بیچ میں گم صم دھواں ہے میری سوچ
یہاں بنی ہے اب اک یادگار قاتل کی
یہیں پر اس نے ہمارا لہو بہایا تھا
کرفیو لگا اور گھر میں پاؤں جو رکھا
سامنے تنہائیوں کی فوج کھڑی ہے
ہر طرف اس شہر میں اک سنگ باری ہو رہی ہے
میں کہ ہوں زد میں بھی اور محفوظ بھی اک آئینے میں
پتے لرز رہے تھے خطرہ تھا آندھیوں کا
گھر ہو رہے تھے خالی موسم تھا ہجرتوں کا
تجھ پہ کس کا پہرہ تھا اے آبشار اہربل
خون سے جس دن کہانی پیاس کی لکھی گئی
ہڑتال ہے' فساد ہے' کرفیو ہے'بندھ ہے
کیا کیا ہیں میرے ہجر کے اسباب شہر میں

قتل وغارت گری' افراتفری' ظلم وزیادتی اور ہو کے عالم میں ہر شخص ہراساں نظر آتا ہے۔ کشمیر کے طول وعرض میں جنازہ گاہ اور قبرستان آباد ہو رہے ہیں۔ اس واقعے اور اس طرح کے دوسرے حالات کو رفیق رازیوں شعری لباس پہناتے ہیں ۔

مُنہ کھولے ہیں شہر کے مقابر بھی
ڈھاتے ہیں غضب شہر کے تاجر بھی
چمک رہا ہے شب و روز بام ودر پہ ہمارے
وہ اک سکوت جو ویران مقبروں کے لئے تھا
وہ زعفران'وہ چشمے' و گلزار کیا ہوئے
اُگ آئے ہیں ہزاروں مقابر زمیں پر
فصیل شہر کے اندر ہے پیاس کا دریا
فصیل شہر کے باہر سراب رکھا ہے
سبزہ خوشبوؤں میں اک سیلاب خوں پوشیدہ ہے
شہر کی دہلیز پہ قہر سیہ خوابیدہ ہے

لت پت ہے خاک وخون میں اشجار یا اخی
بے سائیگی کا ہے گرم بازار یا اخی
آج پھر کھیلی گئی ہے خون کی ہولی کہیں
ہو گیا ہے آج پھر اخبار کا کالم سیاہ

مذکورہ اشعار میں مقابر کا مُنہ کھولنا' تاجرانِ شہر کا غضب ڈھانا' مقبروں کے بام ودر روشن ہونا' پھولوں اور چشموں کی جگہ قبروں کا اُگنا' سبزہ خوشبو میں خون کا سیلاب پوشیدہ ہونا' اشجار کا خون میں لت پت ہونا' خون کی ہولی کھیلنا وغیرہ ایسے دل دہلانے والے مناظر پیش کرتے ہیں جس سے کشمیر کی عوام جوجتی ہے۔ رفیق راز نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بڑی بے باکی اور بے ساختگی کے ساتھ ان حالات کو قلمبند کیا ہے۔

رفیق راز اپنے کلام میں مخصوص لفظیات کو برئے کار لاتے ہیں۔ جو زیادہ تر علامتی اور استعاراتی الفاظ پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے اپنے جذبات اور محسوسات کے اظہار کے لئے الفاظ وتراکیب کا ایک نیا اور منفرد شیرازہ تخلیق کیا ہے۔ جوان کے گہرے مشاہدے اور عمیق مطالعے کا نتیجہ ہے۔ کلام رفیق راز میں مستعمل محاوروں، استعاروں' علامتوں، ترکیبوں اور الفاظوں میں معنی ومفاہیم کی تہہ داری بہ درجہ اتم موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں زیادہ تر استعمال ہونے والے الفاظ وتراکیب اور علامتوں میں' سیہ ،سکوت' خموشی' جنگل سُرخ' فصیل' محشرستان' لمس' وحشت، بیکراں سمندر، شور پنہاں' خون آلود' بوسۂ برق تخیل حیراں' خاک تمنائے دید' دشت خواب' بارش حسرت' برفیلے جزیرے' خزاں رسیدہ' زرد پتے' چشم شرر' شہر بے روح' مظہر امکان' شہر نامراد' شاخ لرزیدہ' شعلہ لمس' سرسبز صدا' قافلۂ خواب' تابش افکار' قبائے ابر' تیرگی یاس' ردائے آب' بحر قبا' پیکر شعاع' خوشبوئے خموشی' فصیل شہر' برگ آوارہ' موج بے قابو' نغمۂ نور' دودِ خموشی، تاجر لہو' موسم امکان' زبانِ تجلی' سرحد حشر' دعائے صبح' قلزم بیکراں' برفیلی گھپا' صحرا ستان' حرف جنوں' سیل شرار' جوئے گماں' خاک کف پائے نگاراں' دیوارِ شب وغیرہ کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہی علامتوں 'استعاروں اور لفظوں کے ذریعے سے رفیق راز اپنے دل کے راز صفحۂ قرطاس پر لاتے ہیں۔

رفیق راز اُردو زبان کو برتنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے پاس الفاظ اور تراکیب کے وافر ذخائر موجود ہیں جو ان کو شعری اظہار کرنے میں بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ رفیق راز کی شاعری میں الفاظ کے استعمال اور ادیگی کے بارے میں معروف شاعر اور نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

> "ان کی غزلوں میں الفاظ کی کار آگہی اور کارفرمائی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔
> ان کے الفاظ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی

ہے کہ وہ ادا کیت سے اُردو کی لسانی روایت سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ اور اس سے اخذ و استفادہ کرتے ہیں۔ بعض مقامات حد درجہ روایتی الفاظ و تراکیب بھی در آتے ہیں جو شعری عمل کی بالیدگی میں مانع نظر آتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر یہ روایت کے سرچشموں سے فیض یاب ہونے کا فطری عمل ہے۔ جو چیز انہیں روایت کی تحکیم قبولنے سے روکتی ہے وہ ان کی ذہنی اپج ہے۔ جو لفظ کاری کا موجب بنتی ہے اور روایت اور جدت گلے ملتی نظر آتی ہے''۔ ۶۲

اسی حوالے سے حامدی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''رفیق راز لفظ کے اداشناس ہیں وہ لفظوں کے تخلیقی برتاؤ کو بروئے کار لانے کے لئے اپنی فہم و ذکاوت' مشاطگی اور ریاضت سے کام لیتے ہیں اور ان (لفظوں) کے انسلاکات اور ممکنات کو راہ دیتے ہیں۔ اس طرح سے وہ تجربے کے متنوع مظاہر کی جلوہ گری کا سامان کرتے ہیں۔ اور قاری کو خوشگوار حیرت سے دوچار کرتے ہیں۔''۶۳

رفیق راز کی غزلیہ شاعری میں رنگوں کا خوب علامتی اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے جذبات کو متنوع رنگوں کے ذریعے منعکس کیا ہے۔ سیہ' سفید' سُرخ' زرد' سنہری' سبز' دور سبز سرمئی' نیلا وغیرہ غرض راز نے ان رنگوں کو علامتوں کے طور پر استعمال کر کے افہام و تفہیم کے بے شمار در وا کئے ہیں۔ جہاں ان کی غزلوں میں ''سیہ'' رنگ کثرت سے استعمال ہوا ہے وہی دوسرے رنگوں کو بھی موقع محل کی مناسبت سے بروئے کار لایا ہے۔ اس اعتبار سے راز کو اگر رنگوں کا شاعر بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ رنگوں سے متعلق رفیق راز کے چند اشعار دیکھئے۔

خزاں رسیدہ ہر اک صفحۂ قرار پہ اک دن
سنہری یاد کے جھونکوں نے سبز خواب لکھا تھا

چشمۂ دودِ سبز میں کل شب
دیر تک ناچتا رہا شعلہ

دشت گمانِ زرد پہ کس نے لکھ دیا
دریائے ریگ سبز کہ بہتا ہوا بھی ہے

سُرخ سنگین ساعتوں میں اتر

سرد صحرائے نیلگنوں میں اتر
پیلے حرفوں کی نیلی چاپ لئے
بے صدا سرمئی فسوں میں اُتر
رخسا روزلف ولب پہ لکھی جائے اک کتاب
اس کے ہوں تین باب سفیدو سیاہ و سرخ
سبزوخوشبو میں اک سیلاب خون پوشیدہ ہے
شہر کی دہلیز پر قہر سیہ خوابیدہ ہے

رنگوں کے علامتی اظہار کی بدولت رفیق راز کی غزلوں میں جدت اور ندرت پیدا ہوگئی ہے ۔مختلف رنگوں کو اشعار میں علامت کے بطور استعمال کرنا اور ہر بار نئے نئے معنی اور مفاہیم کا لباس عطا کرنا رفیق راز کی ذہنی اور فکری اپچ پر دلالت کرتے ہیں۔ انہوں نے ان مختلف رنگوں کی صورت میں معنی ومطالب کی ایک کائنات خلق کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نذیر آزاد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''راز نے اپنے طلسم خانوں کی تعمیر میں رنگوں کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔ مرحوم حکیم منظور کے اس تجزیہ کہ ''رفیق راز' سیاہ رنگ کی کلید سے ذات کے طلسم خانے کھول رہے ہیں'' سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ بیشک راز نے سیاہ، سیہ کو تکرار کے ساتھ استعمال کیا ہے اور ''سیہ'' غزلوں کا ایک سلسلہ ان کے کلام میں موجود ہے لیکن یہ رنگ اس علامتی نظام کی کلید نہیں بلکہ جزو ہے جس کے ذریعے اُن کا کلام عبارت ہے۔ رفیق راز نے اپنے سینیر ہمعصر شعراء مثلاً زیب غوری اور ظفر اقبال کی طرح رنگوں کے استعمال سے متنوع مفاہیم پیدا کیے ہیں اور اپنے کلام کے علامتی نظام میں رنگوں کو اہم جگہ دی ہے۔'' ٦٤

علامتوں کے استعمال کے علاوہ رفیق راز نے اپنی غزلوں میں تشبیہات' استعارات' تلمیحات اور دیگر شعری محاسن سے بھی خوب کام لیا ہے۔ ان کی غزلوں میں جملہ شعری وسائل کی بدولت مضمون آفرینی اور معنی آفرینی میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام کو ایک مخصوص استعاراتی نظام سے مزیّن کیا ہے۔ جس میں ان کی انفرادیت صاف طور سے جھلک رہی ہے۔ ؎

تجھ پہ مرجانا ضروری ہوگیا تھا

پھول ہے تو موسم خلد بریں کا

وہ شب کہ لوگ سارے پتلے تھے حیرتوں کے
ہر سمت واہوئے تھے دروازے رحمتوں کے
سبزہ و خوشبو میں اک سیلاب خون پوشیدہ ہے
شہر کی دہلیز پر قہر سیہ خوابیدہ ہے
بارش انور برساتا ہے مجھ پر اور خود
لاتعلق ہر چمکتی شے سے نیلا آسماں

استعاروں کے اثر انگیز استعمال سے معنی ومفاہیم کی ایک دنیا رفیق راز نے آباد کی ہے۔اس کا اعتراف بھی ایک شعر میں یوں کرتے ہیں ؂

استعاروں میں یہ مجھ سے معجزہ سر زد ہوا
سائے کو دیوار سے میں نے گریزاں کر دیا

اس سے راز کے گہرے مطالعے اور عمیق مشاہدے کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اسی طرح تلمیحات کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے۔چند اشعار دیکھئے ؂

میرے بدن میں رواں دجلہ وفرات بھی تھے
مگر لبوں پہ میرے پیاس تھی قیامت کی
خیال مالِ غنیمت میں ہم کہ گم بھی نہ تھے
عقب سے حملہ کیا دشمنوں نے رستے میں
دل کے بازار میں ہلچل سی مچا دی اس نے
مجھ کو بھی دھوکا ہوا یوسف لا ثانی کا
وردِ زباں درودِ ابراہیم ہے تو پھر
ٹھنڈی رہے گی میرے لئے ہر زماں میں آگ

رفیق راز عروض وآہنگ پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔وہ عروض کی باریکیوں سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔جسکی مثال کشمیری زبان میں عروض پر لکھی گئی ان کی کتاب ''کاشر زبان شاعری تہ عروض'' میں ملتی ہے۔ردیف قوافی کے انتخاب میں بھی انہوں نے زبان دانی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ان کی غزلوں میں بعض مشکل قافیے اور ردیف ملتے ہیں مگر شعریت کے حُسن پر آنچ نہیں آنے دیتے ہیں۔انہوں نے بعض مشکل اور سنگ لاخ زمینوں میں بھی غزلیں کہیں ہیں اور بہت خوبصورتی سے شعری تقاضوں کو نبھایا ہے

۔ان کے مجموعہ کلام ''انہار'' میں سیہ اور سیاہ ردیف پر مشتمل ۲۳ غزلیں شامل ہیں۔جس سے ان کی زبان دانی اور ایک ہی لفظ کو مختلف اور متنوع صورتوں میں استعمال کر کے معنی اور مفاہیم کے بے شمار سوتوں کو اُجاگر کیا ہے۔بحور واوزان میں بھی رفیق راز نے اہم تجربے کئے ہیں۔ایک طرف انہوں نے مروجہ عام بحروں کو استعمال کیا ہے تو دوسری جانب مشکل بحور کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ان کے کلام میں چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی بحروں پر مشتمل غزلیں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں ،اور دونوں کو نبھانے میں رفیق راز نے فنکارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

ساکت و بے حس ہیں تیر گی کے سمندر
روح کی وادی ہے اضطراب سے روشن
خواہشوں کا فتور باقی ہے
شور سادل میں ہے بجائے سکوت
دل میں کچھ نقش روشنی کے ہیں
یہ جو کچھ داغ ہیں اسی کے ہیں
سبز ہوا تھی رُکی ہوئی
گرد وغبار ٹی ہوئی
دشت میں یاد یہ آیا کو ن
چھاوں اور بھی گھنی ہوئی

بڑی بحروں پر مشتمل اشعار دیکھئے۔

اب تو سارے رنگ ہیں پھیکے حشر کے خالی میدان میں
حشر کے بعد کے منظر میں بس رنگ سکوت نمایاں ہے
میری ہی آنکھوں سے دریا رواں ہیں چاروں طرف
مجھی سے دشت میں نمناک ہے یہ خاک سیہ
پر سکوں کب سے میرے دل کا ہے صحرائے سکوت
آکے اس میں بھی کبھی حشر اُٹھا دنیا تھا
تجھ سے ہی روح کی شمع روشن رہی تیز آندھی میں بھی
تجھ سے ہی مثلِ فانوس یہ جسم کا خاکدان دشت میں

رفیق راز کی غزلوں میں عروض و آہنگ ،،بحر و وزن اور ردیف وقوافی کے حیرت انگیز استعمال

کے بارے میں عادل بناری لکھتے ہیں:

''رفیق راز نے اپنی شاعری میں جو تجربات کیے ہیں ان میں بحور واوزان کے تجربات حیران کن حد تک اپنی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں۔ دورِ حاضر جو کہ سہل پسندی کا دور ہے اور بیشتر اہم شعراء بھی آج کل چند مخصوص بحور و اوزان سے کلام چلا رہے ہیں ایسے میں رفیق راز کا یہ عمل بہت مستحسن ہے اور مشعلِ راہ بھی۔ ان تجربات میں انہوں نے جن موضوعات کو شعری اسلوب عطا کیا ہے، ان میں بھی آورد کا دخل تقریباً نہ کے برابر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعر ڈھلی ڈھلائی صورت میں انہیں بحور واوزان میں ان کی تخلیقی حسیت پہ وارد ہوتا ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر اپنی ذاتی فطرت کو شعری فطرت میں ضم کر دے۔ یعنی اس کا تصور جب پرواز کرتا ہے تو ظاہری اور باطنی ہر طور ذاتی فطرت کا غلبہ ہو جاتا ہے اور پھر جو کچھ بھی تخلیقی عمل ہوتا ہے وہ رفیق راز کی شاعرانہ انفرادیت کا مدلل ثبوت ہوتا ہے''۔ ۶۵

رفیق راز خود اس راز سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ غزل میں ردیف قافیہ کے استعمال کی کیا اہمیت ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

کرتے ہو کیوں قوافی تبدیل راز صاحب
ڈھاتے غضب ہو ایسا کیوں میر کی زمین پر

القصہ رفیق راز اُردو غزل میں نہ صرف ریاست بلکہ برصغیر میں ایک اہم شاعر کے طور پر اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔ بات چاہئے موضوع یا مضمون کی ہو یا پھر زبان و بیان کی، ردیف قوافی کی دلکشی کی ہو یا بحور واوزان کی رفیق راز نے ہر سطح اور ہر اعتبار سے اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ریاست جموں کشمیر میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بارے میں جب بھی کوئی تاریخ رقم کی جائے گی اس میں ایک اہم اور توانا باب رفیق راز اور ان کی شاعری ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆

ایاز رسول نازکی

ایاز رسول نازکی سلسلہ نازکیہ کا تیسرا معتبر نام ہیں۔ میر غلام رسول نازکی ریاست میں اُردو شاعری کے میر کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نازکی صاحب کا دولت کدہ ریاستی اور بیرون ریاستی شعراء

اوراد باء کے لئے اہم ادبی مرکز سے کم نہ تھا۔ کیونکہ ان کے گھر میں اکثر شعراء، علماء، ادباء اور دانشوروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ آئے دن ان کے یہاں مختلف موضوعات پر شعری، علمی اور ادبی محفلوں کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ وادیٔ کشمیر کی ایک نسل کے شعری مذاق کو سنوارنے میں موصوف کا نمایاں رول رہا ہے۔ اسی ادبی ماحول میں نازکی صاحب کی اولادیں پرورش پاتی رہیں۔ جن میں فاروق نازکی جو کہ ان کے بڑے صاحبزادے ہیں نے بھی والد کی نگرانی میں شعر کہنا شروع کیے اور بہت ہی مختصر عرصے میں انہوں نے خداداد فنی صلاحیتوں سے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ فاروق نازکی کے بعد اس سلسلے کو اُن کے ایک اور صاحبزادے ایاز رسول نازکی نے آگے بڑایا ہے۔ آپ ۲۵ مئی ۱۹۵۱ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت میں ان کے والدین نے خصوصی توجہ دی ہے۔ ایاز رسول نازکی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں دینی اور دنیاوی علوم سے شروع کی۔ پڑھنے لکھنے کا ماحول ان کے گھر کا خاصہ تھا۔ ایاز رسول نازکی بڑے ذہین اور فہیم واقع ہوئے ہیں۔ آپ نے ویٹانیری سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اور مختلف اعلیٰ عہدوں پر اپنے فرائض منصبی انجام دے چکے ہیں۔

جہاں تک ایاز رسول نازکی کی شعر گوئی کا تعلق ہے۔ اس کا آغاز انہوں نے لڑکپن سے ہی کیا جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ موصوف کے گھر کا ماحول خاصہ علمی اور ادبی تھا۔ جس کا براہ راست اثر ان پر بھی پڑھا اور وہ بھی شعر موزوں کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے والد اور برادر اکبر کی سرپرستی میں فن شاعری کے اسرار و رموز سیکھے ہیں۔ ایاز رسول نازکی نے بچپن سے ہی ریاست کے ساتھ ساتھ ملک کے نامور اور قدآور شعراء جن میں جگر مرادآبادی، شکیل بدایونی، علی سردار جعفری، سہیل عظیم آبادی، وامق جونپوری، جگن ناتھ آزاد، بیکل اتساہی، شیخ غلام علی بلبل، غ۔م طاوس، نندلال کول طالب کشمیری، شوریدہ کاشمیری، شہ زور کاشمیری، حامدی کاشمیری وغیرہ کو اپنے گھر میں سجی شعری محفلوں اور تنقیدی مباحثوں میں دیکھا ہے۔ انہی محفلوں سے ایاز رسول نازکی کو تحریک ملی اور وہ بھی وادی شعر و شاعری میں وارد ہوئے۔ شروع میں محفلوں اور مشاعروں میں کلام پڑھنے اور رسائل و جرائد میں چھپوانے سے بچتے تھے لیکن والد محترم نے ہمت باندھی اور رپھر رفتہ رفتہ ان کا کلام منظر عام پر آنے لگا۔ مقامی اخبارات اور رسائل کے ساتھ ساتھ ملک کے موقر رسائل و جرائد میں بھی آپ کا کلام ایک طویل عرصے سے زینت بنتا رہا ہے۔ ''خودرو'' ایاز رسول نازکی کی پہلی شعری سوغات ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا ہے اور ادبی حلقوں میں اس کی اچھی خاصی پزیرائی ہوئی۔ ''شام سے پہلے'' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو کہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کی بدولت ایاز رسول نازکی کی شہرت ریاستی سرحدیں پھلانگ کر ملک کے اطراف و اکناف تک پھیل گئی۔ ۲۰۱۷ء میں ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''نقد ایاز'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ جو دراصل ان کا منتخب کلام

ہے جس کو ریاست کے معتبر شعراء ڈاکٹر لیاقت جعفری، ڈاکٹر محمد سلیم اور جناب عمر فرحت نے ترتیب دیا ہے ۔اس کے علاوہ ایاز رسول ناز کی تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ایاز رسول ناز کی کی شعری کائنات غزل، نظم اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔غزل ان کی محبوب صنف سخن رہی ہے۔ان کے کلام کا متعدد بہ حصہ صنف غزل کی صورت میں ہی موجود ہے۔ایاز کی شاعری کا نمایاں وصف روایت کی پاسداری اور جدیدیت کی روادی ہے۔ موصوف جہاں ایک طرف روایتی اور کلاسکی غزل کے موضوعات کو اپنے محسوسات اور تجربات کے مطابق اظہار میں لاتے ہیں تو وہی دوسری جانب جدید اور مابعد جدید غزل کے متنوع موضوعات کو پیش کرنے میں بھی نظیر نہیں رکھتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں۔

''ایاز رسول ناز کی نئی نسل کے ان گنے چنے شعراء میں شامل ہو جاتے ہیں جو
روایت اور جدیدیت کے امتزاجی عمل سے لفظوں کی آئینہ بندی کرتے ہیں
اور قاری کی حیرت کا سامان کرتے ہیں۔'' ۶۶ے

ایاز رسول ناز کی کو اگر ہم شاعر رومان کہیں تو بے جانہ ہوگا۔ان کی طبیعت حسن پسندی اور حسن پرستی کی جانب شروع سے ہی مائل رہی ہے۔ حسن و عشق کے پر کیف جذبات کو ایاز اپنی غزلوں میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ برتنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ عشق اور معاملات عشق کے مختلف کیفیات سے گزرنے کے بعد ایاز اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

عشق کا موسم ہر کوئی
حسن کا موسم ایک بہار

جس نے ہم کو عشق سکھایا جس سے سمجھے سارے گر
اس کی عمر تھی سولہ سترہ اپنی تھی اکیس برس

ایک خوشبو ہوا کے جھونکے پر
عشق دنیا میں عام کرنا تھا

عشق میں ہم نے سر نہیں دیکھا
ان پہ پھر بھی اثر نہیں دیکھا

تم سے بڑھ کر حسین چہرے تھے
ہم نے لیکن ادھر نہیں دیکھا

پھول کھلتے ہیں میرے آنگن میں

آج کوئی تو بات ہے پیارے
آج قسمیں جو تیرے پیار کی کھاتا ہے ایاز
کل فریب اس سے اگر کھاؤ، بتانا مجھ کو

حسن وعشق کی نزاکتوں اور ہجر ووصل کی لطافتوں کا بے ساختہ اظہار اور محبوب کی عشوہ گری اور ستم ظریفی کا بیان ایاز رسول ناز کی اچھوتے انداز میں کرتے ہیں ۔

ہجر تھا یا وصال کس کا تھا
خواب تھا یا خیال کس کا تھا
چارہ گر سے گلہ نہیں کرتے
عشق کے درد کی دوا کیسی
سامنے وہ ہمارے بیٹھے تھے
دل میں ان کے خیال کس کا تھا
تیرے جانے سے لوٹ آنے تک
اک زمانہ سا درمیاں گزرا
اس نے دیکھا مجھے نہیں دیکھا
چین میرا حرام کرنا تھا

ڈاکٹر پریمی رومانی ایاز کی غزلوں میں حسن وعشق کی کیفیات کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایاز کی غزلوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں حسن وعشق کی نزاکتوں کا خاص امتزاج ملتا ہے۔غم جاناں اور غم دوراں تو ان کی غزل کا ایک امتیازی موضوع ہے لیکن ان کے موضوع کو موثر الفاظ میں بیان کرنے کا منفرد انداز ایاز کے ہاں بدرجہ اتم ملتا ہے۔'' ۶۶

اسی طرح ستیہ پال آنند ایاز کی غزلوں میں موضوع عشق ومحبت کی دل فریب پیش کش کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''محبت کا موضوع تو ہر شاعر کا پسندیدہ ہے، لیکن ایاز رسول نے اس میں بھی اپنے جزرس مشاہدات ، قابل تعریف جمالیاتی عرفان' حسی تجربات' تازہ اور نو بہ نو لفظیات سے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں۔'' ۶۷

ایاز رسول نازکی کے کلام میں متصوفانہ فکر سے لبریز اشعار بھی نظر نواز ہوتے ہیں۔ جوان کی قلندرانہ طبیعت کے غماز ہیں۔ کشمیر صوفی سنتوں کی ہمیشہ سے آماجگاہ رہا ہے۔ یہاں کے طول وعرض میں بزرگان دین اور اولیاء کرام کے مزارات موجود ہیں۔ جنھوں نے اہل کشمیر کو معرفت کے جام پلائے ہیں۔ ان حضرات کی صحبت سے یہاں کے لوگ عرفان وآگہی کے اسرار ورموز سے آشکار ہوئے ہیں۔ ایاز کی طبیعت اور مزاج بھی صوفیانہ خیالات سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے ۔

کتنے بھولے تھے درویش
پیڑ لگائے سایہ دار

بھونچال آنے والا ہے درویش نے کہا!
شب سے ہوں انتظار میں ساماں سمیٹ کے

ایک درویش نے ساحل پہ یہ پوچھا مجھ سے
پی لیا رات کو میرا یہ سمندر کس سے

ایاز رسول نازکی ریاست کے جدید اور تازہ فکر شعراء میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر وفن کی تازگی اور گہرائی کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔ ایاز رسول نازکی کی غزل دور رفتہ میں لکھی جانے والی غزل سے مختلف اور کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ ان کی غزلیں اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہیں۔ وہ زندگی اور معاملاتِ زندگی کے گوناگوں مسائل کو اپنے تجربات اور مشاہدات کے مطابق جس طرح محسوس کرتے ہیں اس کا بے ساختہ اظہار اپنی غزلوں میں کرتے ہیں۔ ان کے خیالات میں نیاپن اور تجربات میں وسعت پائی جاتی ہے۔ ایاز خیالات اور تجربات کو اپنے منفرد انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کو ان میں شدّت تاثیر اور تازگی کا احساس خود بہ خود ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ۔

کب تک فریب کھاؤ میاں رات ہوگئی
اٹھ کر دیا جلاؤ میاں رات ہوگئی

ابھی ٹنگی ہے فضاؤں میں ایک پرچھائی
سنا ہے یہاں سے کبھی اک عقاب گزرا ہے

چلے گی وقت کی آندھی تو کس کو بخشے گی
نہ جانے کتنے زمانوں کو لے اڑی ہے ہوا

گھر کے آنگن میں ہرا اک پیڑ تھا

ساری دنیا میں شجر ایسا نہیں
ایک ہی گھونٹ میں سمندر پینے
صحرا ذرے میں صنم کرتے

ایاز رسول نازکی جدید لہجے کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے خیالات اور محسوسات کا مظاہرہ مخصوص لب و لہجے میں کرتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور استعمال پر ایاز خاصی توجہ دیتے ہیں۔ ان کی زبان سادگی اور سلاست کا بہترین نمونہ ہے۔ ایاز رسول نازکی بڑی سے بڑی اور سنجیدہ بات کو نہایت ہی آسان اور سلجھی ہوئی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ انہیں زبان اور اس کے برتاؤ پر کامل دسترس حاصل ہے۔ زبان کے اسی خوبصورت استعمال کی بدولت ایاز رسول نازکی کے کلام میں معنیٰ آفرینی اور اثر انگیزی پیدا ہوئی ہے۔ ایاز رنے اپنے کلام میں خیالات و جذبات کو پیش کرنے کے لئے لہجے کی تازگی اور الفاظ کی برجستگی سے فنکارانہ چابکدستی کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔

شعر تو شش جہات ہے پیارے
اس میں کل کائنات ہے پیارے
میں ظاہر کے سارے جزیرے ڈبو دوں
میں باطن کی موجوں کے اسرار مانگوں
ہر طرف جلوے بکھیرے چاندنی
ہجر کی یہ رات ہی کچھ اور ہے جی
بند کمرے کی کھڑکیاں رکھنا
پھر کتابوں میں تتلیاں رکھنا

ریاست جموں کشمیر میں ۱۹۸۰ء کے عشرے میں منظر عام پر آنے والے اہم غزل گو شعراء میں رفیق راز، فرید پربتی، فاروق مضطر، احمد شناس، پرتپال سنگھ بیتاب کے ساتھ ساتھ ایاز رسول نازکی بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان شعراء کے یہاں جدید غزل کے متنوع موضوعات ملک کے دیگر شعراء کی طرح بھر پور انداز میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایاز رسول نازکی نے اپنی مخصوص طبیعت زرخیز ذہن اور بلند تخیل کی بدولت اُردو کو نئی فکر، نئی سوچ اور نیا لہجہ عطا کیا ہے۔ ایاز عصری حسیت اور فکر جدید کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں جدید حسی تجربات کی رنگا رنگی اور موضوعات کی بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و نواح میں رونما ہونے والے حالات و حادثات کی عکاسی ذاتی تجربات اور فکری توانائی کے حوالے سے منفرد انداز میں کرتے ہیں۔

جینے مرنے کی یہ حقیقت ہے
موت بھی اک حیات ہے پیارے
پھر بھی پہنچے نہیں جزیروں تک
وہ سمندر بھی بے کراں گزرا
اگر دے سکے تو فقط ایک چھت دے
نہ دروا زہ مانگوں ، نہ دیوار مانگوں
پھر وہی اندھا سفر پھر وہی تاریک رات
پھر وہ سارے وسوسے اندیشہ ہائے حادثات
چشم بد سے بچائے گا مجھ کو
بخت میرا تیری نظر میں ہوں

کلام ایاز میں الفاظ کے استعمال، لہجے کی متانت اور تجربات کی جدت کے پیش نظر ڈاکٹر فرید پربتی لکھتے ہیں:

''وہ (ایاز) خوبصورت بندش اور الفاظ کی صحیح نشست و برخواست پر زور دینے کے باوجود نئی حسیت اور اپنے زمانے کی آسیبی قوتوں سے پورے طور سے باخبر ہیں۔ان کے یہاں موجود تخلیقی بہاؤ اور بے پناہ تازگی اپنے ساتھ دور تک بہا کر لے جاتی ہے اور مسرت سے بصیرت کا سفر طے کراتی ہے۔''
۶۸

انسانی رشتوں اور قدروں کی پاس داری ایاز رسول نازکی کی زندگی کا نصب العین رہا ہے۔وہ بڑے حساس اور دردمند دل کے مالک ہیں۔دورِ رفتہ کے انسان کی مکروفریب کاری، مکاری، خودغرضی، مادہ پرستی اور بے رہ روی نے انسانی رشتوں کی اہمیت اور قدر و منزلت کو ختم کر دیا ہے۔حرص وہوس اور مال و دولت کے لئے لوگ انسانیت کی بنیادی صفات کا جنازہ نکال رہے ہیں۔اکیسویں صدی کے اس نام نہاد ترقی یافتہ دور میں بھائی بھائی کی خبر گیری کے لئے بغیر کسی غرض و غائت کے لئے نہیں جاتا ہے۔ان سب چیزوں کا روز بہ روز ہمارے معاشرے میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔شاعر ایسے انسانیت سوز واقعات کو دیکھ کر ہواس باختہ ہو جاتا ہے۔وہ قدروں کی شکست وریخت اور انسانی رشتوں کی پامالی کو دیکھ کر مغموم ہو جاتے ہیں۔ایاز رسول نازکی کی شاعری میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو ان کی انسان دوستی اور اعلیٰ سماجی اقدار کی پاسداری پر دال ہیں۔

آخر ہوئی نیلام بزرگوں کی حویلی
عزت جو بچی اتنی کہ دستار میں پہونچے
روز گھڑتا ہے اک نئی تہذیب
روز تازہ جہاں بناتا ہے
خون کا بدلہ کیا وہ دیتے
آنکھیں اپنی ہی نم کرتے
نہ ہم دوستوں کے ستم دیکھتے ہیں
نہ اب دشمنوں کے کرم دیکھتے ہیں
پگڑی اچھلے بیچ سڑک کے یہ تو اس کا شیوہ ہے
اس سے بھڑنا چوراہے پر اپنی ہی نادانی ہے
کام آؤ نہ کسی کے تو کوئی بات نہیں
کوئی مشکل تو نہیں ہے کہ دعا نہ کر سکو
چاند سے چہرے چمکتے ہیں سروں پر لیکن
آج کے دور کے ہر شخص کا کردار سیاہ
ہیں جتنے مفلس ترے جہاں میں
جو دے سکے ان کو کام دے دے

کشمیر کی حسین اور خوب صورت وادی دنیا بھر میں اپنے قدرتی حسن و جمال اور شادابی کی بدولت مشہور ہے۔ یہاں کے پانیوں، سبزہ زاروں، برف پوش کہساروں، ندی نالوں، جھیلوں، جھرنوں ،آب شاروں، چناروں اور زعفران زاروں نے ہر خاص و عام کو متاثر کیا ہے۔ ایاز رسول نازکی اپنے وطن کے ان دلکش نظاروں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ اس ارضِ جنت نما کے ذرے ذرے سے بے پناہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ ایاز نے اپنے کلام میں وطنِ عزیز کے ان پر کیف نظاروں کی عکاسی بڑے منفرد انداز میں کی ہے۔

آج بھی ہم کو یاد آتا ہے
گھر آنگن میں ایک چراغ
ہمیں تو آپ ہی سے زندگی کشمیر ملتی ہے
وطن کے نام سے انسان کو توقیر ملتی ہے

ڈل کے پانی میں عکس کس کا ہے
آئینے پر وہ آئینہ ہو گا
برف گرنے کا ہے منظر دیکھنا
ہر طرف ہے سنگ مر مر دیکھنا
وہی چناروں کے سبز پتے
بہار آنگن میں آڑ کی تھی

کشمیر اور اہل کشمیر اپنی تہذیب، ثقافت اور کلچر کی بدولت الگ اور منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ یہاں کا رہن سہن، رسم ورواج اور دیگر معاملات ملک کے اکثر حصّوں سے مختلف ہیں۔ایاز رسول نازکی اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی اچھی تعداد میں ملتے ہیں جن میں وہ کشمیر کی ثقافت اور کلچر کی عکاسی بہت خوبصورتی سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ایاز کی غزلوں میں چنار، وازوان، پھرن، نمکین چائے، ڈل وغیرہ الفاظ کے استعمال سے کشمیر کی تہذیب اور ثقافت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

کچھ چناروں کی آگ کی باتیں
کچھ خیالوں کے دیپ جل جاتے
کشتیاں، وازوان ،موسیقی
لوگ جب چاندنی میں ڈل جاتے
سرما کی سرد تیرہ و تاریک رات خود
رہ رہ کے در پہ آکے پھرن مانگتی رہی
ڈل کے پانی میں عکس کس کا ہے
آئینے پر وہ آئینہ ہوگا

کشمیر کے سیاسی اور سماجی ومعاشرتی حالات وواقعات پر بھی ایاز رسول نازکی کی گہری نظر ہے ۔وادی کشمیر گذشتہ تین دہائیوں سے جس صورت حال سے گزر رہی ہے۔اس نے یہاں کے ہر طبقے کے افراد کو متاثر کیا ہے۔شاعر چونکہ زیادہ حساس ہوتے ہیں لہٰذا یہ زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ایاز رسول نازکی بھی اپنے ہم وطنوں کے حالات و حادثات کو دیکھ کر کراہ جاتے ہیں۔ آئے دن کے خونین واقعات ،معصوموں اور بے گناہوں کا قتل عام، افراتفری اور حوف وہراس، حرم بے گناہی جیسے حالات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ایسے حالات اور حادثات سے گزرنے والے اوران کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے والے

شاعر ایاز رسول نازکی اس درد بھری داستان کو اپنی غزلوں میں بھی نمو پزیر کرتے ہیں۔ کشمیر اور باشندگان کشمیر کی حالت زار کی روداد ایاز رسول نازکی کہیں بیانیہ انداز میں اور زیادہ تر علامتی پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ جس سے ان کی سیاسی اور سماجی بیداری کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

اندھیرای رات نوحے گا رہی ہے
خموشی شہر بھر میں چھا رہی ہے
زمین پر خون اتنا بہہ گیا ہے
ہواؤں میں بھی خوشبو آ رہی ہے
یہاں پر کوچہ و بازار ہیں نگاہوں میں
یہاں پر روزن و دیوار و در پہ پہرا ہے
ہمارے باغ کا ہر پیڑ ہے حراست میں
ہر اک پیڑ کی ہر شاخ، ثمر پہ پہرا ہے
پہلے کب امید کا گلشن تاخت ہوا تاراج ہوا
شہر تمنا تجھ پر کیسی اب کے یہ ویرانی ہے
خون بہتا نہ شاہراہوں میں
عقل ہوتی جو بادشاہوں میں
کچھ ہوا ہے کہیں پہ وادی میں
پھر ہوا بے قرار پھر تی ہے
جن کو مطلوب ہے جوان سارے
میری بستی ہے ان کے گھیرے میں

مذکورہ اشعار میں، اندھیری رات کا نوحے گانا، زمین پر خون کا بہنا، در و دیوار پر پہرا ہونا، پیڑ، شاخ اور ثمر پر پہرا ہونا، شہر تمنا کا ویران ہونا، شاہراہوں پر خون بہنا، وادی کی ہوا کا بے قرار ہونا، جوانوں کا مطلوب ہونا اور بستی کو گھیرنا، ایسے الفاظ ہیں جن سے وادی کشمیر کے کربناک حالات کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ایاز رسول نازکی نے ان حالات و واقعات کی عکس بندی غزل کی صورت میں بے باکی اور بے ساختگی کے ساتھ کی ہے، اس سلسلے میں امجد اسلام اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایاز رسول نازکی کی غزل کے چند شعر وادی کشمیر کی وہ شکل ہمارے سامنے

پیش کرتے ہیں جس کے ناظر اور صورت گر دونوں کا تعلق اس دھرتی اور اس پر رونما ہونے والے ان واقعات سے ہے جو نہ صرف کشمیریوں بل کہ پورے ضمیر آدم کے لیے اس عہد کا سب سے بڑا سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔''
٦٩

کشمیر کی اس روح فرسا صورت حال سے رنجیدہ خاطر ہو کر ایاز رسول ناز کی یہاں کے سیاست دانوں پر طنز کرتے ہیں اور ان کو غیر ذمہ دار قرار دیتے ہوئے انہیں مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں ؂

ہم پہ کشمیر چھوڑ دیتے وہ
اس کا ہم حل نکال سکتے تھے

اس سے ایاز کی دردمندی اور انسانیت کی محبت اور امن و امان کے عناصر کو سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے ایک عرصے سے اپنے وطن میں خون کی ہولی کھیلنے والے نام نہاد محافظوں کے مظالم کسی نہ کسی صورت میں خود بھی برداشت کیے ہیں اور ان کے اہل وطن بھی آئے دن ان حالات کا شکار ہوتے ہیں ۔جس کی وجہ سے وادی کے طول و عرض میں بے چینی، بے یقینی، لاچاری اور خوف و دہشت کی ہوائیں چلتی ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؂

میری ماں نے مجھ کو جنم جب دیا تھا
میں لاشوں کے انبار پر جا گرا تھا
کہ لاشوں کی فصلیں کٹ چکی ہیں
کہ دھرتی خون میں نہلا رہی ہے
گھروں میں شور بھی اب تھم گیا ہے
گلی سے فوج بھی اب جا رہی ہے
گھر سے چلتے میں نے اکثر سوچا ہے
شاید ہی میں لوٹ کے آؤں شام گئے
رات ہی رات ہے ہمارے یہاں
صبح کیسی ، یہاں صبا کیسی

ایاز رسول ناز کی دورِ رفتہ میں ریاست کے قدآور غزل گو شاعر ہیں۔ آپ کی غزلوں میں فکری آگہی، جذبات کی فراوانی اور فنی پختگی کا احساس جا بجا ہوتا ہے۔ ایاز رسول ناز کی جہاں ایک طرف کلاسیکی شعراء میر، غالب ورا قبال وغیرہ سے متاثر رہے ہیں وہیں جدید دور کے اہم شعراء میں ناصر کاظمی، فیض احمد

فیضؔ، احمد فراز اور ظفر اقبال کے کلام کا مطالعہ بھی گہرائی سے کیا ہے۔ جس کی بدولت ان کی فکروفن میں مزید وسعتیں پیدا ہوئیں۔ ظفر اقبال سے خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ ظفر اقبال جدید غزل کے نمائندہ شعراء میں ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ ایاز رسول کی غزلوں میں ظفر اقبال کی غزلوں کا رنگ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اسی رستے ظفر اقبال گیا تھا اک دن
وہ رہی اس کی کھڑاوں کہاں جاؤ گے

ایاز غزل کی فنی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں غنائیت، موسیقی اور نغمگی بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ چھوٹی بحور کو برتنے میں غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ بڑی اور طویل بحروں کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔ ایاز رسول نازکی نے غالب، میر، ظفر اقبال، ناصر کاظمی وغیرہ جیسے اساتذہ فن کی زمینوں میں بھی کامیاب غزلیں کہیں ہیں، جو ان کی فن کارانہ بصیرت وبصارت کا بڑا ثبوت ہے۔ ایاز رسول نازکی ردیف وقوافی کے انتخاب پر بھی خاصی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بعض ایسی ردیفیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جو بالکل نئی اوران دیکھی ہیں۔ سیاہ، ہوشیار، آئینہ اور بسمہ اللہ جیسے الفاظ کس طرح ایاز کی غزلوں میں ردیف کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، ملاحظہ ہوں:

روشنی تیرے قلم سے جو جھلکتی ہے ایاز
صفحۂ نور پہ چمکے ہیں یہ اشعار سیاہ

موسمِ گل خیمہ زن ہے ہوشیار
تاک میں شاخِ سمن ہے ہوشیار

رات بیٹھا تھا چاند سر ہانے
ہاتھ میں تھا گلاب آئینہ

پاؤں تیرے چلتے چلتے تھک جائیں
زور سے بستہ تھامے چلنا بسم اللہ

ایاز رسول نازکی کی غزل میں فکروفن کی بوقلمونی کے پیشِ نظر ڈاکٹر مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں:

''ان کی شاعری جہاں ایک طرف اعلیٰ فنی شعور کی حامل ہے تو دوسری طرف نئی حسیت، منفرد جمالیاتی ذوق اور عصری آگہی کی مختلف جہات بھی وضع کرتی ہے۔ الفاظ کی بندش، تجربے اور مشاہدے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں موجود تخلیقیت نئی منزلوں کا پتا دیتی ہے۔'' ۷۰

ایاز رسول نازکی فطری شاعر ہیں، جو جدید فکری تقاضوں کے تحت اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار موثر الفاظ وتراکیب میں کرتے ہیں۔ ایاز کی غزلوں میں معنی ومضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی صداقت کے بے شمار نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایاز اپنے تجربات اور وسیع مشاہدات کا بے ساختہ اظہار تخلیقی نادرہ کاری سے کرتے ہیں۔ ان کے یہاں بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ایاز غزل میں مختلف شعری محاسن کا بھی بہ خوبی استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا اندازِ بیان سادگی اور سلاست سے پر ہے۔ ان کے کلام میں موضوعات کی بوقلمونی کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان کی ندرت اور تازہ کاری قاری کو فوراً متوجہ کرتی ہے۔ ایاز رسول نازکی کے یہاں نامانوس اور مبہم الفاظ اور خیالات نہ کے برابر ہیں۔ وہ عصری میلانات ورجحانات سے جو کچھ بھی اخذ کرتے ہیں اس کا اظہار راست اور بے ساختہ انداز اور عام فہم الفاظ میں کرنے کے روادار ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

اپنی غزلوں میں نہ ابہام نہ اسرار ایاز
فلسفے والی غزل ہم سے سنائی نہ گئی

انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی شعری پیرائے میں جس انداز میں ایاز رسول نازکی نے کی ہے وہ ان کے ماہرِ فن ہونے پر دال ہیں۔ ایاز رسول نازکی کے مشاہدے کی انفرادیت جذبات نگاری کی قدرت اور انسانی نفسیات کی دلکش عکاسی نے ان کی تخلیقیت میں وہ کیفیت پیدا کی ہے جسے جدید شاعری کے ایک نئے موڈ کا پتا چلتا ہے۔ ایاز رسول نازکی کی شاعری میں جدید حسیت، عصری آگہی اور تخلیقی تازہ کاری کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے ظفر اقبال اپنے خیالات کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایاز رسول نازکی کی تخلیقی نادرہ کاری کو اپنے ذہن وشعور میں جذب کرنے کے بعد یہی احساس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا سب سے اہم تجربہ وہ اضطراب ہے جو ان کے فکر وشعور اور قلب وذہن میں ایک زریں لہر کی طرح موجود ہے۔ ایاز رسول نازکی کی شاعری کا ایک وصف اظہار کی بے ساختگی ہے۔ وہ غزل کے فن کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا ان کے کلام کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک فطری شاعر ہیں۔ ان کے ذہن کی روشنی، روح کی تازگی اور شعلۂ احساس، حرف کے پیکر میں ڈھل کر کسی شعلہ رو کی طرح نکھر گئے ہیں جو باکمال شاعر کی پہچان ہے۔''[1]

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایاز رسول نازکی ریاست جموں وکشمیر کے ایک کہنہ مشق اور

دیدہ ورغزل گوشاعر ہیں۔ان کی غزلوں میں موضوعاتی رنگارنگی، حسن پرستی،فطرت کی عکاسی، جذبات کی فراوانی، خیالات کی تازگی، انداز بیان کی نادرہ کاری اور معنی ومفہوم کے بے شمار خزانے موجود ہیں۔ایاز رسول نازکی اپنے تخلیقی سفر میں ابھی سرگرم ہیں۔اور گلستان غزل میں اپنی تازہ تخلیقات سے نئے نئے گل بوٹے کھلا رہے ہیں۔ریاست میں اردو غزل کو نئی بلندیوں اور وسعتوں سے ہم آہنگ کرانے میں ایاز رسول نازکی کا نام ناقابل فراموش ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

خالد بشیر احمد

ملک کشمیر اُردو شعر وادب کے حوالے سے دور رفتہ میں ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔کشمیر میں اُردو زبان کی ابتدا سے موجودہ دور تک بے شمار ادباء اور شعراء پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اُردو زبان کو وسیلہ اظہار بنا کر اُردو شعر وادب کی خوب خدمت کی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اس دوران مختلف ادوار میں مختلف شعراء اور ادباء نے اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔اس سلسلے میں جب ہم کشمیر میں بیسویں صدی کے ستر کے عشرے میں اُردو شاعری اور خاص طور پر اُردو غزل کی وادی میں سیر کرنے والے شعراء کو تلاش کرتے ہیں اور ہماری نظر جن نمائندہ شعراء پر ٹھہرتی ہے ان میں، رفیق راز، ایاز رسول نازکی، رخسانہ جبین، اقبال فہیم، سید رضا کے علاوہ خالد بشیر احمد کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں ۔

خالد بشیر احمد سرینگر کے علاقہ سونہ وار میں ۲۰ فروری ۱۹۵۴ء کو پیدا ہوئے۔خالد اپنے علاقے کے پڑھے لکھے صاحب عزت گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے والد جناب احسن بٹ محکمہ کسٹمز میں ملازم تھے۔آپ اپنے محلے کے ذی عزت اور صاحب توقیر اشخاص میں شمار ہوتے تھے۔ان کی ایمانداری اور دیانت داری کی بدولت محلے کا ہر چھوٹا بڑا شخص ان کی عزت اور تعظیم کرتا تھا۔خالد بشیر احمد نے اپنی تعلیم کا آغاز اپنے ہی علاقے سونہ وار سے کیا اور دسویں کا امتحان ہائی سکول بادمی باغ سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔موصوف پڑھائی لکھائی میں بہت ہی ذہین اور لائق واقع ہوئے ہیں۔جس کی وجہ سے اسکول کے اساتذہ انہیں پسند کرتے تھے۔خالد بشیر نے میٹرک تک اپنی کلاس میں پہلی پوزشن حاصل کی ہے۔بی۔اے کے لئے سرینگر کے ایس۔پی کالج میں داخلہ لیا اور یہاں بھی خالد بشیر نے اپنی ذہانت اور قابلیت کا لوہا منوایا اور بی۔اے کا امتحان بھی اچھے نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات سے ایم۔اے میں تیسری پوزشن حاصل کی۔خالد کا تعلیمی سفر پہلی جماعت سے ایم اے تک بہت ہی تابناک رہا ہے۔تعلیم سے فراغت کے بعد موصوف کشمیر کے مشہور اُردو اخبار روزنامہ ''آفتاب'' کے

ساتھ منسلک ہو گئے۔ یہ سلسلہ بہت قلیل مدّت کے بعد اس وقت منقطع ہو گیا جب خالد بشیر احمد کا تقرر حکومت جموں و کشمیر کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ میں بحیثیت انفارمیشن آفیسر کے ہوا۔ اس کے بعد مختلف دوسرے سرکاری شعبہ جات میں بھی آپ اپنی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ ان میں ڈائریکٹر لائبریریز اینڈ ریسیرچ، ڈائریکٹر آرکائیوز آرکیالوجی اینڈ میوزیمز، اسپیشل سکریٹری محکمہ ہاوسنگ اینڈ اربن دیولپمنٹ، ایڈشنل سیکٹریری آف چیف منسٹر، ڈائریکٹر اسنٹیٹوٹ آف منیجمنٹ اینڈ رورل دیولپمنٹ اور سیکریٹری جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز شامل ہیں۔ ملازمتوں کے اس طویل سلسلے سے سبکدوش ہو نے کے بعد آج کل اپنے دولت کدے واقع گلشن نگر نوگام بائی پاس سرینگر میں اپنی زندگی کے شب و روز اطمنان کے ساتھ گزار رہے ہیں۔

خالد بشیر احمد بچپن سے ہی اُردو زبان سے والہانہ شغف رکھتے ہیں۔ اسکول اور کالج میں اُردو اخبارات اور رسائل کا خوب مطالعہ کرتے تھے۔ اور نصاب میں شامل اُردو شعر و ادب کے اہم اور معتبر شعراء اور ادباء کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالد بشیر احمد بھی ادب تخلیق کرنے لگے۔ کالج کی تعلیم کے دوران خالد کالج میگزین ''پرتاب'' کے طالب علم مدیر بھی رہے ہیں۔ کالج کی تعلیم کے دور میں ہی ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز پہلے بحیثیت افسانہ نگار ہوا ہے۔ ان کی پہلی تخلیق افسانہ ''انوکھا ملن'' ہے جو روز نامہ ''آفتاب'' میں شائع ہوئی ہے۔ شروع میں افسانہ لکھنے کے بعد خالد کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مبذول ہوئی اور پھر وہ شاعری ہی میں اسیر ہو کر رہ گئے۔ اُردو زبان کے ساتھ والہانہ شغف اور ادبی زندگی کے آغاز کے بارے میں خالد بشیر احمد لکھتے ہیں:

''اُردو ادب سے بچپن سے ہی شغف رہا گو کہ ہمارے خاندان میں شعر گوئی کا شوق رکھنے والا میں پہلا اور اب تک واحد فرد ہوں۔ ادب کے تئیں میرے شوق کو سونہ وار میں ہمارے آبائی گھر کے سامنے واقع پبلک ریڈنگ روم نے خوب اُبھارا جہاں جانا میرا روز کا معمول تھا یہاں انگریزی اور اُردو اخبارات کے علاوہ کچھ ادبی رسالے بھی آتے تھے جن کے مطالعے نے مجھے لکھنے پر اُکسایا۔ ابتدائی طور پر افسانے لکھے جو مقامی اخباروں میں شائع ہوئے۔ میرا پہلا افسانہ ''انوکھا ملن'' کے عنوان سے ۱۵ جون ۱۹۷۲ء کو روز نامہ ''آفتاب'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کئی افسانے لکھے جو زیادہ تر اسی اخبار میں شائع ہوئے۔ اس دوران میری توجہ اُردو شاعری کی طرف گئی اور میری غزلیں ''آفتاب'' میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ اُردو شاعری سے

میرا میلان اس حد تک بڑھ گیا کی میں نے افسانوں سے اپنی توجہ یکسر ہٹا کر
شعر گوئی کی جانب مبذول کی۔''۲؎

اُردو کے شعری سرمایہ میں خالد بشیر احمد کے دو شعری مجموعے ''صدائے نیم شب'' اور ''خواب پارہ'' گراں قدر اضافہ ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''صدائے نیم شب'' ۱۹۸۳ء منصۂ شہود پر آیا ہے اس مجموعے میں شامل غزلوں کو خوب سراہا گیا ہے اور اس کے بارے میں ناقدین اور تبصرہ نگاروں نے بھی اچھے مضامین لکھے ہیں جس سے اس کی مقبولیت میں اور زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی نے اس کتاب کو ۱۹۸۹ء میں سال کی بہترین کتاب کے اعزاز سے شاعر موصوف کو نوازا۔ اس مجموعے کے منظر عام پر آنے کے بعد خالد بشیر احمد کی شہرت ریاستی سرحدیں پھلانگ کر ملک گیر سطح تک پھیل گئی۔ اور اس طرح وہ برصغیر کے اُردو شعراء کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس کا اعتراف خالد بشیر یوں کرتے ہیں:

''اس مجموعے (صدائے نیم شب) پر برصغیر کے ادبی جرائد میں بڑے اچھے
تبصرے آئے اور یوں میرا نام وسیع تر اُردو شعر و ادب کی دنیا میں متعارف ہوا
''۔ ۳؎

خالد بشیر احمد کا دوسرا شعری مجموعہ ''خواب پارہ'' پہلے مجموعے تقریباً تیس سال بعد ۲۰۰۸ء میں جلوہ افروز ہوا۔ اس کی وجہ خالد اپنی دفتری مصروفیات کو مانتے ہیں۔ بہر حال یہ مجموعہ بھی خالد کے قارئین اور ناقدین نے بہت پسند کیا اور اس کی بھی خوب پزیرائی ہوئی۔ خالد بشیر احمد کے دونوں شعری مجموعوں میں زیادہ تر غزلیں ہی ہیں اور اس کے علاوہ حمد، نعت اور کچھ نظمیں بھی شامل ہیں۔

خالد بشیر احمد کی تخلیقی صلاحیتیں دوسری اصناف سخن کے بہ نسبت صنف غزل میں زیادہ نکھر کر سامنے آئی ہیں۔ انہیں ابتداء سے ہی غزل سے اُنس رہا ہے اور اسی صنف کو انہوں نے بے پناہ تجروبات اور مشاہدات کے اظہار کا موثر وسیلہ پایا۔ جس میں انہیں بڑی حد تک کامیابی ملی۔ انہوں نے شاعری میں کسی کی اُستادی قبول نہیں کی ہے۔ البتہ مشق سخن جاری رکھتے گئے اور اس طرح شاعری کی باریکیوں اور اسرار و رموز تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ موصوف کم گو اور بہت ہی حساس طبیعت کے مالک ہیں نام و نمود کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ محفلوں اور مشاعروں میں جانے سے بھی کتراتے ہیں۔ تنہائی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ شاعری میں غزل سے محبت اور ادبی نشستوں سے بے رغبتی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اُردو میں اگر چہ میں نے کئی نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن اصل میں میرا میلان

غزل کی طرف ہے۔اور شاعری میں اسی صنف کو اپنا وسیلۂ اظہار بناتا ہوں۔
میں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی ہے اور نہ شاعری میں کسی کے سامنے
زانوئے تلمذ تہہ کیے۔مشاعروں میں شامل نہیں ہوتا ہوں اگرچہ ابتداء میں کئی
آل انڈیا مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔ادبی محفلوں سے کم وبیش دور رہا ہوں
۔" ۴۸؎

خالد بشیر احمد کی شعری کائنات ان کی ذات اور ان کے عہد کی آئینہ دار ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں اپنی ذات کے حوالے سے جو تجربے پیش کئے ہیں وہ قابل دید ہیں۔ہمعصر شعراء کے مقابلے میں خالد کی آواز زیادہ اثر انداز ہے۔وہ اپنے آپ کو کسی تحریک کے ساتھ منسلک نہیں ٹھراتے۔ابتداء میں ان کی شاعری میں جدیدیت اور مابعد جدید دور کے شعراء کے ایسے تجربات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔لیکن ان کے اشعار معنی ومفاہیم کی حدود سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔چنانچہ کہتے ہیں ؎

بارشوں سے وہ خوب بھیگا ہے
دھوپ میں ایک شخص بیٹھا ہے
کوئی شب بھر سرہانے جاگتا ہے
مرے اندر سمندر سو رہا ہے
لنگڑا کتا سوچ رہا ہے
سارا گاؤں کدھر گیا ہے
بند کمرے میں جھانک کر سورج
کھڑکیوں سے لپٹ ہنستا ہے

خالد کی غزلوں کا نمایاں وصف پیکر تراشی ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں عصری حسیت کی خوب عکاسی پیکروں کے ذریعے کی ہے۔ان کے کلام میں متعدد اشعار ایسے ہیں جو ہمارے حواس خمسہ کو بر انگیختہ کرتے ہیں۔اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جنگل ، بارش ، بھینی خوشبو ، گھاس ہری
ایسا منظر اور آنکھوں کی پیاس ہری
پھولوں نے بھی خوشبوئیں چھپالی ہیں پتوں میں
اب خال ہی آتی ہے پرندوں کی صدا بھی
کنارِ آب بھی ہے چاند بھی ہے دل بھی

مگر چبھتی ہے میرے یار، یعنی تیری خاموشی
خوشبوں کے زیر سایہ تتلیوں کے درمیاں
میں نے اپنے خواب پائے ہیں گلوں کے درمیاں
تجھے خبر تو ہو گئی روح کیسے کھلتی ہے
اگر تو نے بارشوں میں جنگلوں کو دیکھا ہے

خالد بشیر احمد کی غزلوں میں پیکر تراشی اور جملہ حواس کو اُکسانے کی کیفیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر شفق سوپوری لکھتے ہیں:

''خالد بشیر احمد بنیادی طور پر نازک خیالات کے شاعر ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے نازک پیکروں کی تشکیل کے ضمن میں فطرت کے گوناگوں عناصر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے پیکروں کی تشکیل میں ہوا، بارش، دھوپ، خوشبو، پھول، موسم، سمندر، چاند وغیرہ الفاظ کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ اس طرح سے خالد بشیر احمد کے پیکر مختلف حواس کو متحرک کر کے قاری کو اُسی تجربے سے گزارتے ہیں جس تجربے سے شاعر خود گزر کے آیا ہے''۔ ۵۷

حسن و عشق کو اُردو غزل میں ایک ناگزیر موضوع کی حیثیت ابتداء سے ہی رہی ہے۔ یہ ایک ایسا توانا موضوع ہے جس کے تصور کے بغیر اُردو غزل کا تصور نامکمل ہے۔ اُردو میں غزل کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جب اس صنف نے آنکھ کھولی ہے عشق اس کا اہم اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ اگرچہ مختلف ادوار میں غزل نے مختلف روپ بھی اختیار کئے لیکن عشق نے اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا بلکہ ہمیشہ عشق غزل کے ساتھ دامن گیر رہا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ عشق کا جذبہ ہر نفس واحد میں موجود رہتا ہے۔ شعراء حضرات جو کہ عام انسانوں سے زیادہ حساس اور متفکر ہوتے ہیں وہ اس جذبے سے سرشار ہوکر اس کی مختلف کیفیات کا انعکاس شعری پیرائے میں کہیں سادگی کے ساتھ تو کہیں علامتی انداز میں کرتے ہیں۔ خالد بشیر نے بھی اپنی غزلوں کو عشق کی مختلف کیفیات سے آراستہ کیا ہے۔ عشق اور متعلقات عشق اپنے مخصوص انداز اور لہجے میں کچھ اس طرح اشعار میں جلوہ افروز کرتے ہیں۔

ہو ایسا ایک بھی لمحہ کبھی خدا نہ کرے
ترا خیال رہے میری دسترس سے پرے
شعاع وصل سے اب مجھ کو کچھ تمازت دے

اُداسیوں کے نخِستاں سے ہو کے آیا ہوں
بھری جوانی اور اس پہ یہ خدوخال ایسا
کہاں سے لائی ہو یہ حسن بے مثال ایسا
یونہی کب کسی کا ہوا ہے کوئی
محبت بھی کیا آسرا ہے کوئی
یہ کسی شخص کے ہونے سے ہی سب اچھا ہے
ورنہ خوشبوئے گل و لمس ہوا بے معنی

عشق کی متنوع کیفیات میں ایک اہم کیفیت محبوب کی یاد ہے۔ عاشق اور معشوق دونوں ہجر وفراق کے دشوار کن ایام ماضی کی خوشگوار یادوں کے سہارے گزارتے ہیں۔ گویا عشق کے اس سفر میں یاد دونوں فریق کے لئے آب حیات کا کام کرتی ہے۔ خالد بشیر احمد بھی اپنے محبوب کی دوری اور جدائی میں بیتے لمحوں کی چادر تانتے ہیں۔ ماضی میں محبوب کے ساتھ گزارے ہوئے خوبصورت دن رہ رہ کر یاد کرتے ہیں۔ جب خالد کا محبوب ان سے دور ہوتا ہے تو وہ ان کو کچھ اس طرح یاد کرتے ہیں۔

منظر تمام دل کے افق پر رقم ہوا
روشن کسی یاد کا اِک آفتاب تھا
میں اس سفر میں اکیلا نہیں رہا پل بھر
تمہاری یاد کے دریا رواں ہیں میرے ساتھ
تمہاری یاد کو دل میں بٹھا کے ایسا ہے
دل جلایا اور خس کے مکاں میں رکھا ہے
یہ تیرا نام ہتھیلی پہ اُگ گیا کیسے
کہ میں نے اس کے لئے اور نام سوچا تھا
ہو ایسا ایک بھی لمحہ کبھی خدا نہ کرے
تیرا خیال رہے مری دسترس سے پرے

ہجر وفراق کے بعد چاہت وصل اور دیدار یار ہر عاشق کی تمنا عزیز ہوتی ہے۔ لیکن خالد کو وصل سے زیادہ مزہ انتظار میں ہی آتا ہے۔ چناچہ کہتے ہیں۔

شراب لب نہ مئے وصل یار پیتے ہیں
خیال سونگھتے ہیں انتظار پیتے ہیں

خالد بشیر کی غزل میں جو عاشق کا تصور اُبھرتا ہے وہ روایتی عاشق سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ عام عاشق محبوب کے ہزاروں مظالم اور زیادتیاں اور ناز برداریاں ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے لیکن خالد بشیر کی غزلوں کا عاشق خوددار اور باغیرت ہے وہ محبوب کے ظلم و ستم اور زیاتیوں کو ایک حد تک برداشت کرتا ہے ۔محبوب کے روٹھنے پر اس کو منانا بھی عشق میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خالد بشیر کی غزلوں کا عاشق بھی اگرچہ اپنے محبوب کو مناتا ہے لیکن جب اس کا روٹھا ہوا محبوب حد سے تجاوز کرتا ہے تو وہ بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ خالد بشیر کی غزل کا عاشق کس قدر، خوددار، غیرت مند اور ضدی ہے۔ اس کا اندازہ ان کے درجہ ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے ۔

وہ اپنی ہٹ پہ قائم ہے ہم اپنی ضد لئے بیٹھے
نہیں کھلتا ہے باب گفتگو اب کیا کیا جائے

اس نے آواز نہیں دی مجھ کو
اور میں بھی نہ گیا ہوں اب تک

جب وہ نہیں ملتا ہے تو ہم بھی نہیں ملتے
غیرت کا اب اپنی بھی تقاضا ہے تو یہ ہے

دل پر تیرے ہجر کا موسم بار نہیں ہوتا
برگ گل پر قطرہ ٔ شبنم بار نہیں ہوتا

عشق مجازی کے ساتھ ساتھ خالد کی غزلوں میں عشق حقیقی پر مشتمل متعدد اشعار ملتے ہیں۔ خالد بشیر اُس ذات عالی اور قادر مطلق کو ہر ذرّے اور سمندر کے ہر قطرے میں دیکھتے ہیں ۔موصوف رب العالمین کو ہر سو اور ہر طرف محسوس کرتے ہیں۔ اپنے ان محسوسات اور خیالات کو اشعار کی صورت میں اس طرح پیش کرتے ہیں ۔

یہ معجزہ تو میری چشم انتظار کا ہے
جہاں بھی دیکھوں مجھے تو ہی تو نظر آئے

اور سب پانی ہی پانی تھا ' کنارا تو تھا
یعنی منۂ زور سمندر میں سہارا تو تھا

میرا صحرائے بدن دھوپ پجاری نکلا
ورنہ یہ طے ہے کہ بارش کا اشارہ تو تھا

دنیا میں عزت ذلت، بڑائی، رسوائی، صرف اور صرف حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ جو

دنیا و آخرت کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ خالد بشیر بھی اس بات پر پوری طرح متفق نظر آتے ہیں۔ اور اس کی عکاسی بھی اپنے اشعار میں بہت خوبصورتی سے یوں کرتے ہیں ؎

ایسی ہلچل تھی کہ سب روند رہے تھے مجھکو
اس تلاطم میں جسے میں نے پکارا تو تھا

بجز زیاں نہیں کچھ بھی کسی سے کہنے میں
میرے خدا پہ میرا سارا حال روشن ہے

پیاس بھی ہے اور کچھ تسکین بھی
ہاتھ میں دنیا بھی ہے اور دین بھی

''ماں'' نہایت ہی پاک اور وسیع المانی لفظ ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی بدنصیب ہوگا جو اپنی ماں سے محبت نہ کرتا ہو۔ انسان کے لئے ماں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں میں نعمت عظمیٰ ہے۔ ماں کی محبت کا دنیا میں نظیر نہیں ملتا ہے۔ انسان دنیا میں مختلف افراد سے تعلق رکھتا ہے جن میں ماں باپ، بیوی بچے، بھائی، بہن، دوست رشتہ دار وغیرہ سب شامل ہیں۔ ان تمام افراد میں صرف ماں کی محبت ہی بے غرض اور بے لُوث ہوتی ہے باقی وابستگان میں بیشتر کی محبت کسی نہ کسی مقصد یا غرض کے لئے ہوتی ہے۔ خالد بشیر احمد بھی اپنی والدہ محترمہ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اگر چہ انہوں نے ''والدہ مرحوم'' کے نام سے ایک نظم بھی لکھی ہے۔ جس میں ماں کے ساتھ ان کی والہانہ محبت جھلک رہی ہے۔ وہیں ان کی غزلوں میں بھی متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں وہ ماں کی عظمت اور اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ؎

سفر کٹھن ہے میرا رہنما ہے میرے ساتھ
کہ دشتِ خار میں ماں کی دعا ہے میرے ساتھ

یہ زخم وہ ہے کبھی مندمل نہیں ہوتا
کبھی جہاں میں خدایا کسی کی ماں نہ مرے

خالد بشیر احمد زندگی کے سفر میں ماں کی دعا کو خاص توشہ قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی وہ رخت سفر باندھتے ہیں تو اس میں ماں کی دعا لازماً شامل رکھتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

یہ جو سامان سفر ہے اس میں
اپنی اماں کی دعا بھی رکھنا

خالد بشیر احمد کی غزلوں کا سب سے نمایاں موضوع کشمیر ہے۔ شاعر جس ماحول میں سانس لیتا ہے جس میں زندگی گزارتا ہے اس کی نمائندگی وہ اپنے کلام میں ضرور کرتا ہے۔ خالد بشیر چونکہ کشمیر سے تعلق

رکھتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے وطن عزیز کے حالات و واقعات کو بھی اپنی غزلوں میں سمو دیا ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ خالد نے اپنی غزلوں میں کشمیر کی خوبصورتی بیان نہیں کی ہے جس کے لئے یہ دنیا بھر میں مشہور ہے بلکہ گذشتہ تین چار دہائیوں سے کشمیر جن حالات سے گزر رہا ہے اس کی مرقع کشی اپنے مخصوص انداز میں کی ہے۔ خالد بشیر کشمیری عوام کی پُر دور اور کربناک صورت حال کو یوں شعری سانچے میں ڈھالتے ہیں۔

میرا شہر میرے بچپن سے کچھ نہیں بدلا
وہ نہر خون جو پہلے تھی 'اب بھی جاری ہے
عجیب لوگ تھے خوابوں کی بات کرتے تھے
گزوں کے فاصلے پر دشمنوں کا لشکر تھا
ہم سے حالات نے اس طرح نبھایا رشتہ
مختلف دکھایا نہ دن ' سال ' مہینہ کوئی

خالد بشیر بہت ہی حساس طبیعت کے مالک ہیں وہ اپنے گردونواح میں رونما ہونے والے حادثات وسانحات کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ کشمیر اور کشمیریوں کے سیاسی' سماجی اور معاشرتی حالات پر خالد بشیر احمد گہری نظر رکھتے ہیں۔ گذشتہ دہائیوں سے کشمیر میں مصائب و آلام' قتل و غارت گری اور افراتفری کا جو بازار گرم رہا ہے۔ جس کی وجہ سے عوامی زندگی درہم برہم ہوگئی۔ اہل کشمیر کی روز مرہ زندگی میں سکون اور چین کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ ہر سو افسردگی ہی افسردگی کی صورت حال چھائی ہوئی ہے۔ وادی کشمیر کے ان پرُفتن حالات اور افراتفری کے عالم کو خالدؔ نے کہیں بیانیہ اور بیشتر علامتی پیرائے میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

پانیوں پر فوج کا پہرا کڑا ہو جائے گا
ایک قطرے کے لئے ہر شخص کو ترسائے گا
فصیل شہر پر لہرا رہا تھا اس کا پرچم
دوران شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا
میرے وطن میں سیاہؔ جنون کے ہاتھوں نے
گلی گلی میں فروزاں کئے ہیں ہو کے چراغ
لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی
لٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی

آئے دن وطن عزیز میں قتل عام اور وفاتوں کے بعد جنازوں کے طویل سلسلوں کا نظارہ اب معمول ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ ظلم کی انتہا کو برداشت کرتے کرتے بے حس ہو گئے ہیں ۔ یہاں تک کہ جب ان کے اپنوں کا قتل ہوتا ہے اور وہ ان کی لاشوں کو سپرد خاک کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں غم نہیں ہوتا۔ کیونکہ موت، کفن، جنازہ، قبر اب یہاں کے لوگوں کی زندگی کا معمول کا بن گیا ہے۔ خالد اس صورتحال کا انعکاس کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے دل ملول کم
ہمارے عہد کو جو منصفی ہوئی ہے نصیب
لہو سے آشنا کم ہے زیادہ خنجر سے

ایسے نازک حالات میں گھر سے نکلنا اور ضروریات زندگی کو پورا کرنا بعض اوقات بہت مشکل ہوتا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

یہ روز وشب جو ہمیں مل گئے ہیں محشر سے
اب ان کے ہوتے نکلنا محال ہے گھر سے
ہوتا نہیں ہوائے بلا کا نزول کم
اس گل زمین پر کھلتے نہیں پھر بھی پھول کم

خالد کی غزلوں میں ایسے متعدد اشعار ملتے ہیں جو کشمیر کے پُر تشدد حالات اور حادثات سے لبریز ہیں۔ اگر ان اشعار کو موضوع کے اعتبار سے الگ کیا جائے تو ایک شہر آشوب آسانی سے برآمد ہو سکتا ہے۔ خالد بشیر کی شاعری میں کشمیر کے سیاسی اور سماجی صورتحال کی عکاسی کے بارے میں ڈاکٹر شفق سوپوری لکھتے ہیں۔

''خالد بشیر احمد کی شخصیت کا ایک لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ایک مدّت تک صحافت سے جڑے رہے۔ ادبی صحافت کے توسط سے ان کا تعلق اخباروں کے ساتھ ساتھ بھی رہا ہے۔ انہوں نے کشمیر کے سیاسی حالات کا ایک صحافی کی طرح مشاہدہ کیا اور ان کا اظہار تخلیقی سطح پر ایک حساس شاعر کے طور سے کہیں علامتی اور کہیں اشعاراتی پیرائے میں کیا۔ گذشتہ دہائیوں سے جن حالات سے اہل کشمیر دوچار ہیں اُن کی المناکی سے ہر حساس اور دردمند شاعر متاثر ہوا ہے۔ اور ریاست جموں وکشمیر کے تقریباً ہر شاعر نے اپنے مخصوص

انداز میں اپنے عصر کے درد و کرب کا تذکرہ کیا ہے عصری حسیت کے تعلق سے خالد بشیر احمد اس وجہ سے بھی زیادہ بیدار ہیں کہ انہوں نے کشمیر کی المناک سیاسی تاریخ کے دردناک ابواب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ لہٰذا ان کے کلام میں جگہ جگہ اہل کشمیر کی حرماں نصیبی کا ذکر مختلف پیرایوں میں ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی سرزمین کو خونیں چادر کا کفن اوڑھتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ مگر حالات و واقعات کی ترجمانی میں وہ راست بیانی سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے استعارے اور علامتیں عالم گیر دردنا کی کا مظہر بن جاتی ہیں۔'' ۶ے

خالد بشیر احمد نہ صرف کشمیر کے حالات بلکہ عالمی سطح پر اہل حرم جن مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں ان کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔ فلسطین ہو یا شام' بغداد ہو یا لبنان یا افغان یہاں کے باشندوں کے دُکھ درد کو بھی خالد محسوس کرتے ہیں اور ان کے غموں کا مداوا اشعار کے ذریعے اس طرح کرتے ہیں ۔

کچھ ابتلا میں تمہیں اہل فلسطین نہیں
تمہارے حال سا ہے ہو بہو ہمارا بھی
ابتلا کا دور ہے اہل حرم مشکل میں ہیں
کابل و بغداد کیا ' گجرات کیا ' کشمیر کیا

خالد بشیر احمد جدید حسیت کی بھرپور آگہی رکھتے ہیں۔ وہ موجودہ دور کے مسائل اور ان سے پیدا شدہ صورتحال کے اسرار و رموز سے بھی واقف ہیں۔ فکر و نظر کی بلندی اور احساس کی شدت کو خالد بشیر اپنی غزلوں میں شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ابھارتے ہیں۔ وہ جدید عصری میلانات کا انعکاس اپنے منفرد لب و لہجے' الفاظ اور علامتوں کے موزوں اور مناسب استعمال سے ماہرانہ طور پر کرتے ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے خالد بشیر کے پہلے شعری مجموعے ''صدائے نیم شب'' میں ان کی غزل گوئی کے حوالے سے جو پیش گوئی کی تھی وہ بالکل سچ اور صحیح ثابت ہوئی ہے۔ حامدی لکھتے ہیں:

''کشمیر کے نئے شعراء میں خالد بشیر بھی پورے انہماک لگن اور آگہی سے اپنی ذات کے حوالے سے نئی حسیت کی پیکر تراشی کر رہے ہیں۔ وہ ابھی چند برسوں سے لکھ رہے ہیں اُن کے یہاں شروع ہی سے لفظوں کے دشت و سراب میں بھٹکنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے حسی تجربوں کی بازآفرینی کا جو تجسس اور اشتیاق ملتا ہے وہ ان کے روشن مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔'' ۷ے

خالد بشیر احمد جدید دور کے شاعر ہیں لیکن وہ روایتی اور کلاسیکی شعری قدروں کا بھی احترام کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں بعض اشعار کلاسیکی شاعری کے بالکل قریب نظر آتے ہیں۔ موصوف نے قدیم اور جدید شعری روایتوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ اس حوالے سے چند شعر دیکھیے۔

معیار اہل جفا بھی بدل گیا ہے کیا
کہ اب کے وہ بھی ہمیں مہرباں سا لگتا ہے

یا میری بدقسمتی کا ذکر رہنے دیجیے
یا حریفوں کے مقابل ہم زبان ہو جائیے

بہت دنوں سے جسے دیکھنے کی خواہش تھی
وہ آفتاب جو نکلا تو سو رہا تھا میں

کلام خالد میں روایت اور جدت کے امتزاج کے بارے میں مصطفےٰ اکبر لکھتے ہیں:

''خالد بشیر کے کلام میں غزل اور اُردو شاعری کی روایتی قدروں کا احترام بھی جا بجا ملتا ہے۔ جدید و قدیم کے امتزاج سے انہوں نے غزل کو ایک رنگ و آہنگ دینے کی کوشش کی ہے۔'' ۸؎

خالد بشیر احمد نے اپنے خیالات اور جذبات کی ترسیل کے لئے ایک مخصوص ڈکشن کو خلق کیا ہے۔ موصوف نے بعض ایسی ترکیبیں اور مرکبات وضع کیں ہیں جو ان کے ذہنی اپج اور زبان دانی کا بین ثبوت ہیں۔ خالد بشیر احمد کی تخلیق کردہ چند اہم ترکیبوں کو یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے ان کی شعری کائنات کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے۔ دست قاتل، محوزیست، آمادۂ وصال، گہر قید صدف، شعاع وصل، یخستان، اصحاب کہف، چشم انتظار، فصیل شہر، برگ گل جاں، سپاہ دشمناں، ملک سخن، ماورائے غم و سرخوشی، واماندۂ دل، گرداب سخن، دست مہ وش، طلوع اشک، لرزیدہ کوہ شہر، سیل حوادث، محرومی قسمت، بازارِ دہر، کرب خود تلاشی، فصلِ ذات، دیارِ خواب، بیکراں صحرا، سرحدِ بدن، کشتی دل، ستارۂ خیال، خمیۂ دل، سفیر دشت، افق دل، حساب زیست، آسودگئی دل، ہجوم یاس، مسافرانِ شب۔ ایسے الفاظ اور تراکیب ہیں جو خالد بشیر احمد کی غزلوں میں معنی اور مفاہیم کے نئے باب وا کرنے میں ان کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ خالد کی غزلوں میں الفاظ اور تراکیب کی اس خوبصورت پیوند کاری کے بارے میں جاوید انور اپنے تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''خالد بشیر احمد نے اپنی شعری کائنات کے نظام کے لئے جو الفاظ کا ڈھانچہ مرتب کیا ہے وہ ان کے تجربات کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے آگے

جا کر الفاظ کی جمالیاتی وحدت اور اس میں پنہاں معنی کا ایک وسیع اور بسیط سلسلہ فراہم کرتا ہے۔ جو سماجی صداقتوں کی مختلف سطحوں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ ان کی شاعری عصری اور مکانی منظرنامے کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ ابدی اور آفاقی افکار سے بحث کرتے ہوئے اپنے شعری موقف کو منطقی اساس فراہم کرتی ہے۔'' ۹ے

خالد کی غزلوں میں مستعمل علامتوں اور استعاروں میں دو لفظ ایسے ہیں جن کے ساتھ ان کو خاصی دلچسپی رہی ہے۔ ''خوشبو'' اور ''پرندہ'' خالد کی شاعری میں بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں۔ خالد بشیر احمد نے ان دونوں لفظوں کو متنوع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان کی غزلیں ابہام سے پاک ہیں۔ خالد بشیر کو جذبات کی تصویر کشی کرنے کے لئے الفاظ کو برتنے کا ہُنر خوب آتا ہے۔ متذکرہ دونوں علامتوں کے مختلف النوع استعمال سے اس بات کی وضاحت آسانی سے ہوسکتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

وہی سماں ہے ' وہی پیڑ ہے ' وہی موسم
گئے برس کا پرندہ نظر نہیں آتا

مہاجر پرندے ہوا خوشبوئیں
کبھی روکنے سے رُکا ہے کوئی

آسمانوں کے پرندوں کی طرح
اب ہواؤں کے سفر پر جاؤں میں

تیرا خیال خوشنما پرندہ تھا
مگر اُڑان میں ہی انتقال اس نے کیا

چہچہاتے ہیں کئی روز پرندے دل میں
وہ جو ملتا ہے تو کھلتے ہیں سویرے دل میں

اسی طرح لفظ خوشبو کا معطر استعمال بھی دیکھئے ۔

وہی خوشبو وہی ریشم سی باتیں
ابھی ہوں خواب کی آوارگی میں

گلاب جسم سے خوشبو تمام لب سے ہے
وہ شخص جیسے گلوں کے حسب نسب سے ہے

پھول دھنگ خوشبو تتلی

یہ القاب تمہارے نام

خوشبو ہے تو ہمسائے بھی معلوم کریں گے

یوں برگ گل جاں کو بکھیر ا نہیں کرتے

اُس کے سخن نے پھول کھلائے ہزار رنگ

خوشبو کا جان و دل پراثر دیر تک رہا

ترے کلام سے دن خوشبوؤں میں ڈوب گیا

ترے خیال سے شب ہو رہی ہے سہانی

خالد بشیر احمد زبان کے استعمال پر کامل دسترس رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب اور انداز بیاں نہایت ہی سلجھا ہوا ہے۔ وہ سیدھے سادے الفاظ کو دقیق اور مشکل الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے معنی اور مطالب کو پوری طرح ادا کرنے کے لئے خالد بعض دفعہ ہندی اور انگریزی الفاظ کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں کمپیوٹر انٹرنیٹ اور دیگر ایجادات کا استعمال معمول بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں خالد بشیر احمد روزمرہ زبان میں مروجہ الفاظ کو بھی اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح بروئے کالاتے ہیں ۔

اُوزون کے پردے میں یہ جو چھید ہوا ہے

ممکن ہے اُتر آئے گی تاثیرِ دعا بھی

دوستی کا کمپیوٹر، اطمنان سے بھائی

اس کے سافٹ وئیر کو وائرس نہ ہو جائے

کون بھولے گا وہ ٹرین کا پہلا سفر

سو بہانے سے وہی چہرہ مکرّر دیکھنا

کلام خالد کے مطالعے سے یہ حقیقت کھل سامنے آتی ہے کہ ان کی شاعرانہ شخصیت، مزاج اور افتادِ طبع نیز تجربات و محسوسات حقیقی ہیں۔ خالد بشیر کی فکری جڑیں زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہو کر ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ بڑے خلوص کے ساتھ شاعری کے تخلیقی لوازمات کو نبھانے کی کوشش میں منہمک نظر آتے ہیں۔ ان کے مستعمل الفاظ استعارے اور علامتیں زندگی کی حقیقتوں سے آب و تاب لیکر اپنے فکری آہنگ کو اس میں آمیز کر کے معاملات زندگی پر شاعرانہ اور دانشورانہ بحث کرتے ہیں۔ جس کی بدولت ان کی غزلوں میں تازگی اور دلکشی کے بے شمار پہلو اُجاگر ہوتے ہیں ۔

خدا جانے کس کی نظر لگ گئی

تنفر تو اس کے نفس میں نہ تھا
معمولی باتوں میں بھی آجائے گا
میرا دل کیا اعلیٰ ذات پرہمن ہے
ہزار خواب اور اتنی ہی زخم تعبیر یں
حسابِ زیست کا یہ میرا گو شوارہ ہے
دل کے رشتے ٹوٹنے سے کب بھولتے ہیں
ان پھولوں میں رہتی ہے بو باس تیری

شاعری میں صنائع بدائع کا استعمال اس کے حُسن کو دوبالا کرتا ہے۔ خالد بشیر احمد اس فن سے بھی پوری آگہی رکھتے ہیں۔ تشبیہ، حسن تعلیل، تلمیح، تکرار، تجنیس وغیرہ جیسی شعری صنعتوں کو خالد نے اپنی غزلوں میں بروئے کار لایا ہے۔ شعری محاسن وہ زیورات ہیں جن سے شاعر اپنے کلام کو آراستہ کرتا ہے اور ان کی بدولت شاعری میں فکر انگیزی اور معنی آفرینی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ خالد بشیر بھی ان شعری صنعتوں کے زیورات سے اپنے کلام کو مزیّن کرتے ہیں۔ موصوف کے کلام سے مختلف صنائع کی چند مثالیں دیکھئے۔

بھری جوانی اور اس پر یہ خدوخال ایسا
کہاں سے لائی ہو یہ حسن بے مثال ایسا
آنگن آنگن کو چہ کو چہ ایک سراب
اس بستی کا سارا نقشہ ایک سراب
وہ شخص پھول سا خوش رنگ بھی ملائم بھی
کہ جس کے ہوتے سکوں دل کا پارہ پارہ ہے
بہت دنوں سے جسے دیکھنے کی خواہش تھی
وہ آفتاب جب نکلا تو سو رہا تھا میں
ابتلا کا دور ہے اہل حرم مشکل میں ہیں
کابل و بغداد کیا ' گجرات کیا ' کشمیر کیا

خالد بشیر احمد کے کلام میں تازگی، انداز بیان میں انفرادیت اور لب ولہجہ میں نیا پن بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس حوالے سے ایاز رسول نازکی لکھتے ہیں:

''خالد بشیر احمد کو اپنی تازہ کاری اور منفرد انداز بیان ایک ممتاز مقام عطا

کرتے ہیں۔ان کی شاعری عصری حالات و واقعات کا ان کی اپنی ذات کے حوالے سے احتساب بھی ہے اور اظہار بھی۔اُن کے لب و لہجے میں ایک نیا پن اور ان کے تجربات اور مشاہدات میں نئے زاویئے ان کی شاعری کو مختلف اور منفرد (perspective) بخشتے ہیں۔''۸۰

تنہائی، محرومی، نا امیدی اور مایوسی ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو اپنی ذات کے اندر جھانکنے کی دعوت دیتے ہیں۔دورِ رفتہ کا فنکار اپنے وجود اور اپنی ذات کے تشخص کے لئے بہت ہی متفکر نظر آتا ہے۔ چاروں طرف پھیلی بے شمار آدمیوں کی بھیڑ میں شاعری تنہائی کی راہ اختیار کرتا ہے۔اور اپنی شناخت، اپنی پہچان کی تلاش و جستجو میں منہمک ہوتا ہے۔خالد بشیر کی غزلوں میں بھی ایسے اشعار موجود ہیں جو ان کی تنہائی، محرومی، اُداسی، بے چینی اور شناخت ذات وغیرہ کی داستان بیان کرتے ہیں ؎

اب یہ لگتا ہے کہ وہ کچھ کچھ میرے ایسا ہی تھا
ہاں یونہی میری طرح وہ شخص بھی تنہا ہی تھا
کوئی تنہا ہو تو اس کا مداوا سوچ سکتے ہیں
مگر ذہنوں میں بیٹھی ہو جو تنہائی نہیں جاتی
رات بھر رہتا ہے پھر ضبط کی لہروں میں تناؤ
میری تنہائی کے ساحل پہ اترتا کیوں ہے

ہمایوں اقبال خالد بشیر احمد کی شاعری میں احساسِ تنہائی اور اندرونی درد و کرب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''تنہائی اور اندرونی کرب کا شدید احساس خالد بشیر کی شاعری میں جابجا ملتا ہے۔اس احساس نے ان سے اگر ایک طرف گہرے مشاہدات اور سچے تجربات کے آئینہ دار اشعار کہلوائے وہیں انہیں طنز کی لطیف اور چھپی ہوئی ادا بھی عطا کی ہے۔'' ۸۱

خالد کی غزلوں کی ایک اور خوبی موسیقی اور غنائیت ہے۔ان کے کلام میں ایک ساحرانہ موسیقیت، ایک مخصوص ترنم اور بے حد شیرنی ملتی ہے۔انہوں نے ردیف قوافی اور بحور کے انتخاب میں بڑی فنکارانہ مہارت دکھائی ہے۔چھوٹی بحروں میں پُر تاثیر غزلیں کہیں ہیں ؎

نیدیں خواب تمہارے نام
سب اسباب تمہارے نام

دراحساس کھلا بھی رکھنا
میرے حصّے کی ہوا بھی رکھنا
قہقہوں کی پھوار ہے گھر میں
اور چھت پر کوئی سسکتا ہے

چھوٹی بحروں کے ساتھ ساتھ خالد بڑی اور طویل بحروں کو بروئے کار لانے میں بھی اچھی دسترس رکھتے ہیں۔

ہرے بھرے موسم کی کس نے بشارتیں دیں
کہ چشم دیوارودر میں سمٹی گزارشیں ہیں
گھر کی دیواریں سبھی اندار سے ہو نگی منہدم
اور دروازے پر تالا جھولتا رہ جائے گا

مدت سے جو بند پڑے تھے سارے دریچے کھول دیئے
اب کمرے میں در آئیں گی دیکھو ہوائیں تازہ کیا

مختصراً خالد بشیر احمد نے اُردو غزل میں موضوع، فن اور زبان و بیان کی بدولت انفرادیت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اگر چہ ان کے عہد میں اُردو غزل کے بے شمار شعراء موجود ہیں لیکن موصوف اپنے مخصوص انداز، فنی بصیرت، بلند تفکر کی بنا پر دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مولا بخش کے تاثرات پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

''اُردو غزل کی کائنات میں اپنے انفراد کا نشان قائم کرنا ہر شاعر کا مقدر نہیں کیونکہ اس سے پہلے کہ شاعر اپنی غزل کہے غزل کا صدیوں پر محیط نظام شعراء کو غزل کی غزل لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شعراء کے لئے اپنی غزل کہنا ٹیڑھی کھیر ثابت ہوتا ہے۔ خالد بشیر کے غزلیہ متن کے مطالعے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے خالد بشیر کی غزل شعری کائنات اور اس کے آسمان پر اپنے انفراد کے ستارے ٹانکنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔''
۸۲

☆☆☆☆☆

فریدؔ پربتی

کشمیر میں اُردو کے شعری گلستان میں جن شاعروں نے تقسیم ہند کے بعد اپنا شعری انفراد قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، ان میں حکیم منظور، حامدی کاشمیری، ہمدم کاشمیری، مظفر ایرج اور فاروق نازکی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء کی راہ نمائی میں ایک نئی نسل بھی دھیرے دھیرے اپنی شعری کاوشوں کی جولانیاں دکھانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئی نسل بھی یہاں منظر عام پر آنے لگی۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں کشمیر کی جدید تر نسل کے شعراء میں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ان میں رفیق راز، خالد بشیر احمد، نذیر آزاد، ایاز رسول نازکی، سید رضا، شفق سوپوری کے ساتھ ساتھ فرید پربتی کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

فرید پربتی کا اصلی نام غلام نبی بٹ ہے۔ لیکن وہ ادبی حلقوں میں اپنے قلمی نام فرید پربتی ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا نام ان کی شخصیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان کا قد بہت اونچا لمبا تھا شاید اسی مناسبت سے ''پربتی'' کا لاحقہ اپنے تخلص کے ساتھ جوڑا تھا۔ اور ریاست کے اونچے اونچے پربتوں کے سائے میں ان کی پرورش کا بھی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ سرینگر کے مشہور اور تاریخی محلّہ سنگین دروازہ ''حول'' میں ۴ اگست ۱۹۶۱ء کو فرید پربتی خواجہ حبیب اللہ بٹ کے گھر میں تولد ہوئے ہیں۔ خواجہ حبیب اللہ بٹ بہت ہی نیک، ملنسار اور خوش طبیعت انسان تھے، اور یہی اوصاف حمیدہ ان کے فرزند ارجمند میں بھی موجود تھیں۔ فرید کی والدہ محترمہ کا نام مصرہ بیگم تھا وہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی گھریلو امور کو اپنی فہم و فراست سے انجام دیتی تھیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی انہوں نے ہی خاص توجہ دی ہے۔ فرید پربتی بچپن سے اچھی صحبت اور نیک لوگوں میں رہے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکول سے حاصل کی، میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی اسکول سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ فرید نے کامرس میں گرائجویشن اسلامیہ کالج حول سرینگر سے کی۔ ایم۔ کام کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ کامرس سے کیا۔ لیکن ان کی طبیعت اُردو کی جانب بڑھنے لگی اور کامرس سے دلبرداشت ہو کر انہوں نے اُردو کی وادی کا سفر کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں میں فرید پربتی نے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد فرید کے دل میں اُردو کے لئے مذید محبت اور دلچسپی پیدا ہوئی، جس کی بدولت انہوں نے اردو میں ایم۔ فل اور بعد ازاں پی۔ ایچ۔ ڈی کی اسناد بھی حاصل کیں۔ اس طرح فرید اُردو کی خوبصورت دنیا کے ایک اہم راہی بنکر اپنی شناخت کی تلاش میں محو سفر ہوئے۔ ''خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری'' کے موضوع کے تحت ایم۔ فل اور ''حاتم دہلوی حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے لکھے۔ جن سے ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فرید پربتی نے ملازمت کا آغاز ۱۹۸۷ء میں ایگریکلچر یونیورسٹی سرینگر کے شعبہ اکاونٹس میں بحیثیت کلرک کے کیا۔اس محکمے میں ملازمت کے مختلف مراحل طے کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کشمیر یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی اعلیٰ ڈگری بھی حاصل کی ،جس کی بدولت ان کا تقرر ۲۰۰۱ء میں شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر کے ہوا۔۲۰۰۶ء میں ترقی پا کر ایسوسیٹ پروفیسر کے طور پر اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کشمیر یونیورسٹی میں نیا عہدہ سنبھالا۔۲۰۰۱ء سے آخری دم تک اُردو درس وتدریس اور تحقیق وتنقید میں پورے انہماک سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۱۴دسمبر ۲۰۱۲ء کو کینسر جیسی مہلک بیماری نے ان کو عالم جوانی میں ہی واصلِ جنت کر دیا۔

فرید پربتی شاعری اور شعری محفلوں کو بہت پسند کرتے تھے۔کشمیر یونیورسٹی میں جب وہ کامرس کے طالب علم تھے اس زمانے میں جب بھی کبھی کوئی ادبی محفل یا پروگرام کا انعقاد یونیورسٹی میں ہوتا تھا فرید اس میں ضرور حصہ لیتے تھے۔یہیں سے ان کو شاعری کا شوق پیدا ہو گیا، کیونکہ ان محفلوں میں اُردو اور دیگر مضامین کے وہ اساتذہ بھی برابر شرکت کرتے تھے جو شعروادب میں دلچسپی رکھتے تھے اس حوالے سے محمد اشرف ٹاک لکھتے ہیں:

> ''ہماری دوستی اُن دنوں کی بات ہے جب وہ فرید پربتی نہیں بلکہ غلام نبی بٹ تھا۔وہ یونیورسٹی کے کامرس دیپارٹمنٹ کا طالب علم تھا اور میں نے شعبہ قانون میں داخلہ لیا تھا۔۔۔۔یونیورسٹی میں وقفے وقفے سے ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔یہیں پر فرید صاحب سے اکثر ملنا جلنا ہوتا تھا۔پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر زمان آزردہ، پروفیسر قاضی غلام محمد اور دیگر اساتذہ کرام ان محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔غلام نبی فرید کامرس ڈیپارٹمنٹ کے تجارتی اسباق بلائے طاق رکھ کر لیلائے سخن کے گیسو سنوارنے لگے۔''۸۳

یہیں سے فرید پربتی کو شاعری کی تحریک ملی جس کو بعد میں انہوں نے محنت وریاضت سے نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔ان کی ابتدائی نگارشات مقامی اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔جن میں آفتاب ،سرینگر ٹائمز، الصفا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔رفتہ رفتہ ان کو خود پر اعتماد بڑھنے لگا اور وہ ملک اور بیرون ملک بھی اپنی شعری تخلیقات بغرض اشاعت بھیجنے لگے۔جو ملک کے طول وعرض میں اپنے وقت کے موقر رسائل میں تواتر کے ساتھ شائع ہونے لگیں۔شاعر، آج کل ،بیسویں صدی، سب رس ،ایوان اردو، انتساب وغیرہ جیسے جرائد میں فرید پربتی کا کلام زیادہ تر چھپتا رہا ہے۔فرید پربتی نے اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ

کیا ہے۔جس کی بدولت ان کے فن میں نکھار پیدا ہوا ہے۔فرید پربتی نے اپنے تجربات کی پیش کش کے لئے غزل،نظم،رباعی،قطعہ،حمد،نعت،منقبت وغیرہ جیسی شعری اصناف کا انتخاب کیا ہے،لیکن اُردو ادب میں ان کی پہچان اور شناخت بحیثیت غزل اور رباعی گو شاعر کے قائم ہوئی ہے۔وادیٔ اُردو میں فرید کا پہلا گلاب ۱۹۸۷ء میں ''ابرتر'' کی صورت میں کھلا ہے۔یہ شعری سوغات غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔جس کی نہ صرف کشمیر بلکہ بیرون کشمیر کے ادبی حلقوں میں بھی اچھی خاصی پزیرائی ملی۔اس مجموعے کے چرچے ابھی لوگوں کی زبان پر موجود ہی تھے کہ فرید پربتی ایک اور خوبصورت تحفہ ''آب نیساں'' ۱۹۹۲ء کی شکل میں اپنے قارئین کے لئے لیکر آئے۔اس مجموعے کو بھی لوگوں نے بہت پسند کیا۔فرید نے یہیں پر بس نہیں کیا بلکہ وہ مسلسل شاعری کے سمندر میں غوطہ زنی کرتے رہے اور ایک سے بڑھ کر ایک موتی اس سمندر سے نکال لاتے گئے۔''ابرتر'' اور ''آب نیساں'' کے بعد ''اثبات'' ۱۹۹۷ء، ''فرید نامہ'' ۲۰۰۳ء، ''ہزار امکان'' ۲۰۰۶ء، ''خبر تحیر'' ۲۰۰۷ء، کے ناموں سے یکے بعد دیگرے فرید پربتی کے شعری مجموعے منظر عام پر آتے گئے اور قارئین اور ناقدین ادب سے داد و تحسین وصول کرتے رہے۔اس کے ساتھ ہی ۲۰۱۰ء میں فرید نے ''ہجوم آئینہ' کے نام سے کلیات بھی شائع کیا۔شاعری کے علاوہ نثر میں بھی فرید پربتی نے اہم تحقیقی اور تنقیدی کارنامے انجام دیئے ہیں۔اس سلسلے میں ''شہ زور کاشمیری شخص اور شاعر''، ''داغ بحیثیت مثنوی نگار''، ''شاہ حاتم دہلوی حیات اور کارنامے''، ''اُردو ادب میں اصلاح سخن کی روایت''، ''اُردو ادب میں تاریخ گوئی کی روایت''، ''تخلیقی رویوں کی تفہیم''، ''کلیات داغ''، ''مقدمہ صنف رباعی''، ''تدوین کلیات قلندر بخش جرأت'' جیسے متفرق موضوعات پر ان کی مذکورہ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔فرید پربتی کی اس پہلودار ادبی شخصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''فرید پربتی ادب کے ان پرستاروں میں سے ہیں،جنہوں نے بیک وقت شعر و نثر دونوں میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ہماری ادبی روایت میں vessibility کی مثال زیادہ نہیں ملتی۔فرید پربتی کو پڑھ کر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔جنہوں نے بیک وقت ایک اچھے شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کی۔خلیل صاحب کے ساتھ فرید کا ذکر یوں بھی مناسب لگتا ہے کہ دونوں نے نسبتاً زیادہ سروکار رکھا ہے،لیکن نظم بھی کہی ہے اور نثری مضامین کی حد تک صرف ادبی تنقید لکھی ہے۔''۸۴

جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ کر چکا ہوں کہ فرید پربتی ۱۹۸۰ء کے عشرے میں وارِدِ گلستان شعر ہوئے ہیں اور جب سے آخری سانس تک وہ شعر وشاعری کے ساتھ منسلک رہے۔فرید شاعری اور لوازمات شاعری کے دل دادہ رہے ہیں۔شاعری کے میدان میں داخل ہونے کے بعد بہت ہی قلیل عرصے میں فرید کامیابی کی منزلوں کو چھونے لگے۔فرید روایتی شاعری کے ساتھ والہانہ شغف رکھتے ہیں۔اگر چہ ان کا تعلق جدید اور مابعد جدید دور سے رہا ہے،لیکن ان کی شاعری ماضی کی قدیم روایات کی بازیافت بھی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ فرید پربتی ایک ایسے سخنور ہیں جن کے یہاں روایت اور جدیدیت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔فرید پربتی ایک خوش فکر غزل گو ایک صاحب اسلوب رباعی گو اور ایک بالغ النظر نقاد ہیں۔اپنے موضوع کے پیش نظر آخر الذکر دو پہلوؤں سے قطع نظر یہاں ہم فرید پربتی کے فکر وفن کو ان کی غزل گوئی کے آئینے میں دیکھنے کی سعی کریں گے۔

فرید پربتی نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا ہے،اور اس فن میں مسلسل مشق جاری رکھنے کے باعث انہوں نے اُردو کے شعری حلقوں میں بہت جلد اپنی شناخت ایک اچھے اور صاحب اسلوب غزل گو کے طور پر قائم کی ہے۔فرید کی غزلوں میں اگر موضوعات کے اعتبار سے بات کریں تو ان کے یہاں یکسانیت نہیں بلکہ تنوع پایا جاتا ہے۔موصوف نے اپنے آپ کو کسی مخصوص تحریک، رجحان، تجربے یا احساس کے دائرے میں قید نہیں کیا، بلکہ زندگی اور اور اس کے معاملات کے نشیب وفراز فرید کی غزلوں میں راہ پاتے ہیں۔فرید پربتی نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لئے وہ اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔زندگی کو فرید جس طور سے محسوس کرتے ہیں اسے اسی انداز میں من وعن اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔فرید کے کلام کا نمایاں وصف روایت کی پاسداری کا گہرا ادراک ہے۔انھوں نے اردو شاعری کی کلاسیکی روایات سے اپنا فکری وفنی رشتہ مستحکم طور پر قائم کیا ہے۔روایتی غزل کی جمالیات کا برتاؤ فرید کے یہاں برجستہ موجود ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ فرید کلاسیکی روایت میں ہی الجھ کر رہتے ہیں۔وہ عصری حسیت اور جدید فکر سے اچھی طرح شناسا ہیں۔ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ پرانی لفظیات کو نئے اور جدید فکری سانچوں میں ڈھالتے ہیں اور ایک انوکھی اور نادر شعری دنیا کو آباد کرتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

عشق میں عزت سادات گی کیا اس کا غم
دل کی نسبت یہ کبھی نام ونسب پوچھتی ہے

ڈھونڈنے نکلا ہوں اپنے آپ کو
کوئی کہتا تھا مجھے اپنا تو بن

میرے چراغ کو طاقِ زیاں پہ رکھتا ہے

جہاں اندھیرا نہیں ہے وہاں پہ رکھتا ہے
درونِ خانہ سے غافل ہے لیکن
بیرونِ خانہ زینت کر گیا وہ
یہ جانتا ہوں تغیر ہے زندگی کی دلیل
میں اس لئے بھی تیرا انتظار کر نہ سکا
عجیب لطف دیا مجھکو عشق تازہ نے
میرے وجود میں اب ناچتا ہے مور نیا
میرے سر پے ہے باقی ایک سایہ میرے ماضی کا
سنبھل کر عصر حاضر کا نظارہ کر رہا ہوں میں

فرید پربتی کی غزلوں میں روایت کی پاسداری اور جدیدیت کی رواداری کے حسین امتزاج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قدوس جاوید فرید کو عصرِ حاضر کے ایک اہم غزل گو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فرید پربتی کی غزلیہ شاعری اُردو غزل کی مضبوط و مستحکم روایت پر اپنی اساس رکھتی ہے لیکن اپنے انداز میں اپنے تخلیقی شرطوں کے ساتھ.... فرید کی غزل کلاسیکی غزل کے لسانی اور اظہاری رویوں سے رشتہ تو رکھتی ہے لیکن دوسری جانب عصری زندگی اور ثقافت کے حوالے سے سوچ اور فکر کو تخلیقی تجربہ کے بطور شعر میں پیش کرنے کی ہنرمندی کے سبب جدید ترین لسانی اور جمالیاتی شعور کا جواز بھی پیش کرتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا ہے۔"یہ بالکل ممکن ہے کہ غزل جدید بھی ہو اور کلاسکی اصولوں کی پابندی بھی کرے"فرید کی غزل اس کی عمدی مثال ہے۔"۸۵ے

فرید پربتی فکر و احساس کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار قاری کو سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ زندگی کے تلخ اور شیریں حقائق سے فرید تمام عمر جوجھتے رہے۔ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے۔ اُن کی غزلوں میں زندگی اور متعلقاتِ زندگی کے کئی مسائل موضوع کی شکل میں رونما ہوئے ہیں۔ عصر حاضر کے انسان کی ناکامی، محرومی، بے چارگی اور تنہائی جیسے موضوعات فرید کی غزلوں میں ان کے مخصوص لہجے کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ فرید کے کلام میں اساتذۂ غزل کے مثبت اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اساتذہ کے انداز سے متاثر ضرور ہوئے ہیں لیکن اس کو اپنے اسلوب اور بیان پر حاوی نہیں ہونے دیتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کو اپنی آواز اور اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔

فرید نے اپنے خیالات کی خوب صورت ترسیل کے لئے اپنا اسلوب، انداز اور لہجہ ایجاد کیا ہے، جس میں فرید کی تخلیقی صلاحیت کی انفرادیت مضمر ہے۔اس انداز کوانھوں نے بڑی محنت اور لگن سے اپنے اندر پیدا کیا ہے۔فرید پربتی کے لہجے کی متانت کوان کے درج ذیل اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے ۔

مدتوں جی لئے مگر اب تک
زندہ رہنے کے ڈھب نہیں آتے

کن حادثوں کو دیکھ کر سکتے میں آئے لوگ
حیران ہر نگاہ ہے اور ہر زبان بند

کرتا ہے خواہشوں کا مری پھر وہ احتساب
کہتا ہے بول کیا ہے تمہارا سرِ فلک

اٹھتا ہے عجب درد مسلسل میرے دل میں
ہے ہاتھ اسی کا میری تعمیر میں شاید

پہلے پوچھا جو نہیں تھا وہی سب پوچھتی ہے
زندگی رات سے جینے کا سبب پوچھتی ہے

کھو گئے گاڑھے دھوئیں میں شہر کے منظر تمام
اک پرندہ رہ گیا آہ و فغاں کرتا ہوا

آنکھوں کی پتلیوں میں مقید ہے کائنات
اب تک خمار گندم و جو کم نہیں ہوا

فرید پربتی کے مذکورہ بالا اشعار سے ان کے نئے لہجے کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔جس کو انھوں نے سعیٔ مسلسل سے حاصل کیا ہے۔اس حوالے سے جاوید آذر لکھتے ہیں:

"انھوں (فرید) نے میر، ناصر کاظمی، شکیب جلالی اور بانی کے لہجے سے یقیناً مثبت اثر لے لیا ہے مگر اپنی آواز کوان اثرات کے وزن تلے دبنے سے بچالیا ہے۔ میں تو کہوں گا کہ فرید لہجوں کے اس مونتاژ میں علیحدہ لہجہ تراشنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ان کی ہر غزل یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ ایک منفرد لہجے کو تراشنے میں مصروف ہیں۔"[۸۶]

علامت سازی اور پیکر تراشی میں بھی فرید پربتی نے اپنی ذہنی فراست اور فنی پختگی کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔فرید زبان اور بیان پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔انہوں نے عصری مسائل کومختلف استعاروں

اور پیکروں کی صورت میں اپنے منفرد انداز میں اپنی غزلوں میں برتا ہے۔ جن کی بدولت ان کی غزلوں میں معنی ومفاہیم کے نئے دروا ہوتے ہیں۔ان استعاروں اور پیکروں کے استعمال سے فرید پربتی کی غزل میں معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کے عمدہ اور نادر تجربات نظر نواز ہوتے ہیں۔''خواب'' فرید پربتی کی غزلوں میں ایک کلیدی استعارے کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔فرید پربتی خواب اور خوابوں کی دنیا کو عزیز رکھتے ہیں۔زندگی کے سفر میں وہ کبھی خوابوں کو خریدتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی بیچتے ہوئے،کبھی چاند ستاروں کی انوکھی دنیا میں پہنچنے کے خواب بھی دیکھتے ہیں۔وہ زندگی کی ہزار مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود اپنے اندر حسین اور روشن مستقبل کے خوابوں کی شمعیں فروزاں رکھنے کے روادار نظر آتے ہیں۔فرید پربتی نے اپنے کلام میں خوابوں کا ہجوم تخلیق کیا ہے۔وہ خواب کو زندگی کا لازمی جزو تسلیم کرتے ہیں۔فرید خوابوں کی دنیا کو کس طرح اپنی غزلوں میں آباد کرتے ہیں،اور خواب کی حقیقت اور فسانے کو کس طرح افہام وتفہیم کے نئے معنوں میں استعمال کرتے ہیں،اس کا بھرپور اندازہ ان کے درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

بچا کے رکھ لیے جو خواب اپنی خاطر تھے
اُنھی کی تاک میں سارا زمانہ رہتا ہے

رنگوں کے تعقب میں وہ ہے سرگرداں
خوابوں کی بس اک دھن میں رواں ہوں میں بھی

تمام عمر خریدے اور بیچے خواب
علاوہ اس کے کوئی کاروبار کر نہ سکا

آتے ہیں خواب میں نظر چاند اور ستارے
ہے گھر سے نکلنا مری تقدیر میں شاید

میں خوابوں کی شمعیں جلاؤں گا اک دن
زمیں پر ستاروں کو لاؤں گا اک دن

لے نکلا ہوں میں پھر سوختہ خوابوں کا جلوس
خود تماشائی بنوں خود ہی تماشا ہو جاؤں

خوابوں کا اک ہجوم شکیبائی لے گیا
چھوڑا مجھے مگر مری تنہائی لے گیا

وسوسوں کے شہر میں اپنا مقدر دیکھ کر

مر رہا ہوں تل تل خوابوں کو بنجر دیکھ کر
نہیں دور ہے خوابوں سے کیوں حقیقت
میں تفصیل اس کی سناؤں گا اک دن

''خواب'' کے علاوہ فرید کی غزلوں میں دیگر اہم استعاروں میں چراغ، دھوپ، روشنی، سایۂ دیوار، دشت، طوفان، درخت، مکان، آندھی، کشتی، شاخ، تتلی، ثمر، شجر، گھر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان الفاظ کے علامتی استعمال سے فرید پربتی کی غزلوں میں معنوی تہہ داری پیدا ہوئی ہے۔فرید اپنے تجربات اور خیالات کو مذکورہ استعاروں کے سہارے سے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کچھ اس طرح نوکِ قلم پر لاتے ہیں۔

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اک دکان پر
خود ہی رکھتا ہے دیے تیز ہوا کی زد پہ
اور آندھی سے خبردار بھی کردیتا ہے
یاد کے گہرے سمندر میں نہ ڈالو پتھر
دائرے سے کھینچتی ہے موج ہوا پانی پر
اُداسیوں کے پرندے منڈیر پر رکھ کر
خموشیوں کے شجر صحن میں اُڑا گیا
دور لگتا ہے مجھے پاس کا ہر اک منظر
پھیلتا جاتا ہے یہ کیسا دھواں ایک نیا

سفر انسانی تجربات کا ایک اہم جزو ہے، پیدائش سے موت تک انسان مسلسل طور محوسفر رہتا ہے۔زندگی کے اس طویل سفر میں ایک دور وہ بھی آتا ہے جب انسان ظاہر سے باطن اور بیرون سے درون کا سفر کرتا ہے، یعنی وہ اپنے ہونے کا احساس اور اپنے وجود کا تشخص چاہتا ہے۔یہ زندگی کا سب سے اہم سفر ہے، بلکہ مقصد حیات ہے، کیوں کہ جب انسان اس امر سے آگاہ ہوگا کہ وہ دنیا میں کیوں، کہاں سے اور کس لئے آیا ہے، تو وہ خود کو اور اپنے بنانے والے کو پہچانے کی کوشش کرے گا جو کہ انسان ی زندگی کا اصل مقصد ہے۔فرید پربتی بھی اپنی ذات اور اپنے وجود کی تلاش میں ظاہر سے باطن کا سفر کرتے ہیں ۔فرید کی غزلوں میں ان کی ذات اور باطن کے اسرار کا انکشاف ہوتا ہے۔ان کو خود سے ملنے کا بڑا اشتیاق رہا ہے۔وہ اپنے تشخص کے خواہش مند ہیں مگر اپنے وجود کو پہچانے کا امر ان کو بہت کٹھن لگتا ہے۔لیکن اس

کے باوجود بھی وہ مسلسل تلاش ذات میں محو رہتے ہیں۔فرید جب اپنے وجود اور اپنی ذات کے راز سے آشکار ہوتے ہیں،تو اس انوکھی دنیا کو اتنا جامع اور وسیع پاتے ہیں کہ اس کو بیان کرنے کے لئے وہ ایک کتاب لکھنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔

انکشاف ذات کا ہے مرحلہ
لکھ رہا ہوں پھر سے اک تازہ کتاب
میں خواہاں خود سے ملنے کا بہت
مگر یہ مرحلہ دشوار نکلا
یہ کس تلاش میں نکلا ہوں خود کو کھو کر میں
شعورِذات میں گم ہو گیا ہوں مدغم بھی
سکوت مرگ نہ شور ثبات سے مجھکو
ملا رہا ہے کوئی میری ذات سے مجھکو
جو اپنی ذات سے باہر نکل گئے ہوتے
تو اے زمانے ترے ساتھ چل گئے ہوتے
فرصت جو ملے خود سے ملاقات بھی ہوگی
دیوار کے سائے سے نئی بات بھی ہوگی

عشق اور محبت کے حسین اور تلخ تجربات بھی فرید پربتی کی غزلوں میں اہم موضوعات کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ جہاں ان کا محبوب انہیں ستانے کے لئے نئے نئے حربے اختیار کرتا ہے۔ان کو زخم پہ زخم دیکر تڑپاتا ہے،وہیں دوسری جانب جب مہربان ہوتا ہے تو ان کا دل اتنی خوشی اور لطف محسوس کرتا ہے کہ جیسے مور ناچتا ہے۔فرید اپنے محبوب سے روٹھتے ہیں اور ان سے شکوہ اور شکایت کرنا چاہتے ہیں لیکن جب وہ ان کے سامنے آتے ہیں تو جو لفظ شکایت وہ کرنا چاہتے تھے وہ زبان پر نہیں آتے اور وہ چپ ہو جاتے ہیں۔فرید اپنے محبوب کی یاد میں بے قرار و بے چین بھی رہتے ہیں اور جب یہ بے چینی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو فرید کے دل سے بے اختیار ایسے اشعار نکلتے ہیں۔

بات کوئی ضرور ہوگی فرید
یاد وہ بے سبب نہیں آتے
ستم گری کا نکالا ہے اس نے طور نیا
پُرانے زخم پر دیتا ہے زخم اور نیا

عجیب لطف دیا مجھکو عشق تازہ نے
میرے وجود میں اب ناچتا ہے مور نیا

رنج وغم اور دکھ درد کے ایام ہر کسی کی زندگی میں آتے ہیں۔فرید پربتی کی زندگی میں بھی مصیبتوں اور غموں کے دور آئے ہیں ۔جن کا مقابلہ انہوں نے مردانہ وار کیا ہے،لیکن اس دوران وہ کن حالات سے گزرتے ہیں اور کس طرح غم کی تاریکیوں میں شب وروز بسر کرتے ہیں،اس کا اظہار انہوں نے اپنی غزلوں کے اشعار میں پر درد انداز میں کیا ہے۔درد وغم کی داستان فرید کی غزل کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔اپنے دل کے مجروح اور غم انگیز جذبات کو فرید پربتی کچھ اس انداز سے شعری جامہ پہناتے ہیں۔

لکھتا ہوں غم ورنج کی تختی اے دل
حاصل ہے فقط تیری دو لختی اے دل
دل غم سے ہے بھر پور نگاہوں میں تھکن
کم کم ہی مزا دیتی ہے اب سیر چمن
کیا بتاؤں کس طرح پیش آئی مجھ سے زندگی
سو نہ جاؤں میں یہی قصہ بیان کرتا ہوا

فرید پربتی نے زندگی میں مصائب وعلائم کا ہمیشہ خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ہے اور ہر وقت اور ہر حال میں ثابت قدم رہے ۔کبھی بھی حرف شکایت لب پر نہیں لاتے ہیں۔اگر چہ وہ مرغ بسمل تھے لیکن اپنی خوش نوائی سے اپنے درد کو چھپاتے رہے ہیں۔ بقول جاوید احمد ڈار:

''فرید صاب نے زندگی میں بڑی مصیبتیں اٹھائیں ہیں،بڑی سختیاں جھیلی ہیں،زمانے کے گرم وسرد کو دیکھا ہے۔لیکن ان کو کبھی کسی نے روتے بسورتے نہیں دیکھا ہے۔انہوں نے دار ورسن کی منزلوں کو مسکراتے ہوئے طے کیا ہے۔''۸۷

ڈاکٹر حقانی القاسمی فرید پربتی کی غزل میں درد وغم کو ایک کلیدی اہمت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''درد وغم ان کے تخلیقی وجدان کا اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں اسی لئے ان کی شاعری میں وہ ساری آوازیں مل جاتی ہیں جو کسی ٹوٹے ہوئے زخمی دل سے آہ کی صورت میں ابھرتی ہیں۔''۸۹

ہر شاعر اپنے جذبات اور تجربات کے اظہار کے لئے ایک مخصوص ڈکشن تیار کرتا ہے،جو اس کی ذہنی پختگی اور فکری بالیدگی کا مظہر ہوتا ہے ۔فرید پربتی نے بھی الفاظ وتراکیب کی ایک انوکھی اور نرالی

کہکشاں تیار کی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں ترکیب سازی کے نمایاں جوہر دکھائے ہیں۔اپنے جذبات کو موثر انداز میں پیش کرنے کے لئے روایتی تراکیب کے ساتھ ساتھ نئی اور معنی خیز ترکیبیں بھی تراشیں ہیں جو اردو غزل میں ایک اہم اضافہ قرار دی جاسکتی ہیں۔فرید کی خلق کردہ تراکیب میں،شکستہ پیکر ،بکتی دھوپ،سائے دیوار،حدادراک،لہورنگ، تیرہ بخت،مرقد کا دیا،بے جرم اسیر،آسودہ مکان،آب بقا، سنگ زنی،لمحاتِ گریزان،جائے اماں، حصارِ باغ،خوش رنگ تتلیاں،موجِ ہوا،سلگتے خواب،ہجومِ خواب، سلگتی ریت، چراغِ یاد،قربت دوروزہ، راہِ طلب، گہرا کرب، نقشِ تحیر،کہنہ الم، متاعِ غم ، بے چہرہ خوا ہشات ، ریگ رواں ، اجاڑ راستے اور خوش نوایانِ چمن وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ان تراکیب کو بروئے کار لاکر فرید پربتی اپنے احساسات وجذبات کو تخلیقی اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔

فرید کی غزلوں میں ترکیب سازی،علامت نگاری اور پیکر تراشی کا ایسا خوب صورت التزام ملتا ہے، جو ان کی زبان دانی اور وسیع مطالعے کا نتیجہ کہلایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر نورالدین اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''فرید پربتی نے اپنی جودتِ طبع اور زرخیز قوت متخیلہ سے اردو غزل کو نئی فکر،نئی سوچ اور نیا تیور دیا ہے۔ان کے ہاں پامال لفظیات سے اعتراض، پیش پا افتادہ مضامین سے گریز اور نئی پیکر تراشی اور استعاروں وعلامتوں کو معنوی پس منظر میں استعمال کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔''۹۰

عبدالاحد ساز بھی فرید پربتی کی غزلوں کے فکری پہلوؤں اور الفاظ کے انتخاب واستعمال کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۱۹۸۰ء کی دہائی میں متعارف ہونے والے شعراء میں فرید پربتی ایک مخصوص حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے یہاں مشترکہ عصری فکر واحساس کے اظہار کے ساتھ پختہ کلامی اور الفاظ کے انتخاب، برتاؤ اور دروبست پر خاصی تو جہ نظر آتی ہے۔''۹۱

شاعر اپنے معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے گردونواح کے حالات وحادثات سے دیگر لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہوتا ہے، اور اپنی اس حسی قوت کو بروئے کار لاکر اپنے سماج اور ماحول کی صورت حال کو شعری زبان دے کر اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے۔فرید پربتی بھی اپنے ملک ووطن کے حالات وواقعات سے پوری طرح آگاہ ہیں، کشمیر گزشتہ دو چار دہائیوں سے جن حالات سے نبرد آزما ہے، اس کا اثر عام لوگوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے تخلیق کاروں پر بھی براہ راست پڑا ہے۔ وادی

کے نامساعد حالات، لوٹ مار، قتل وغارت گری، بے چینی و بے یقینی، محرومی، ناامیدی، جبر واستحصال، عدم تحفظ اور انسانی حقوق کی پامالی وغیرہ کا اظہار فرید پربتی نے اپنی شاعری میں متعدد جگہ کیا ہے۔ فرید اپنے ہم وطنوں کے دکھ درد اور لاچاری سے بہت رنجیدہ ہوتے ہیں چونکہ وہ اسی معاشرے کے ایک ذی حس فرد ہیں لہٰذا وہ اس درد و بے چینی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں، اور پھر اس کا برملا اظہار اپنے کلام میں کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا مجھ سا دکھی ہے گھر میں کون
چھت پر چڑھ کر میں نے دیکھا لگی ہوئی ہے گھر گھر آگ

اب اسی شہر میں کرتا ہوں طلب جائے اماں
لوگ جس شہر سے جان اپنی بچا کر نکلے

رونق یہ میرے شہر کی لے گیا کون
ایک اک سڑک خموش ہے ایک اک دکان بند

اس درجہ گھٹ گیا ہے مکینوں میں اعتماد
کرتے ہیں شام ہونے سے پہلے مکان بند

ایسا تو ایک شخص نہیں میرے شہر میں
جس کو کہ اب ملالِ زوال، شرف رہے

یہ عصر، کربلا سے نہیں کم کسی طرح
ہر حق پرست ہے یہاں مظلوم بے طرح

اس درجہ بڑے نقلِ مکانی کے یہاں شغل
تعمیر کہیں پر بھی مکان کر نہیں پائے

ستم کو دینے کو عنوان نیا فریؔد اس نے
پھر ایک بار حریفوں سے اشتراک کیا

مرقومہ اشعار کشمیر اور اہلِ کشمیر کی حالتِ زار کی منہ بولتی تصاویر پیش کرتے ہیں۔ فرید پربتی بڑی بے باکی سے کہتے ہیں کہ میں اس شہر میں آج بھی بود و باش اختیار کرتا ہوں جہاں سے کثیر تعداد میں لوگ جان کی امان کی خاطر اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ شاعر کو اپنے وطن کے روزمرہ حالات سے شدید صدمہ پہنچا ہے، کیوں کہ ایسے حالات کی وجہ سے ان کے شہر کی رونق ماند پڑ گئی ہے۔ لوگ خوف و دہشت سے سرِ شام اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ فرید کو اپنے وطن کا موجودہ دور کربلا جیسا معلوم ہوتا ہے، کیوں

کہ ان کے یہاں بھی کربلا کے حق پرستوں کی طرح ظلم وزیادتی کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ان حالات سے ہر ایک نہ صرف متاثر ہوا ہے بلکہ وہ اس کی شکایت تک نہیں کرتے کیوں کہ ظلم کو مذید تقویت دینے کے لئے اپنوں نے غیروں کے ساتھ ہاتھ ملایا ہے۔فرید پربتی اس پرآشوب ماحول میں امن وسکون کے شب و روز کی خواہش کو فضول اور لاحاصل تصور کرتے ہیں۔

ٹھن گئی جنگ اب کے حریفوں میں
امن کے روز و شب نہیں آتے

فرید پربتی انسانی رشتوں اور قدروں کے پاس دار ہیں، لیکن موجودہ عہد کی سائنسی ترقی اور مادیت پرستی نے آج کے انسان کو خودغرض لالچی اور حریص بنا دیا ہے۔رشتوں کی اہمیت اور قدر ومنزلت دورِ حاضر کے ترقی یافتہ انسان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔فرید پربتی آج بھی انسان کے گفتار کو نہیں بلکہ اس کے کردار کو پسند کرتے ہیں،صورت کو نہیں سیرت کو عزیز رکھتے ہیں۔لیکن لوگ دنیاوی عیش وعشرت اور مال ودولت کی کثرت کی خاطر قول وقرار اور کردار واطوار کا بے جھجک جنازہ نکالتے ہیں یہاں تک کہ خون کے رشتوں کو بھی بالائے طاق رکھا جاتا ہے۔ایسے حالات دیکھ کر فرید پربتی کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ اپنے ذرخیز قلم کو جنبش دے کر کہتے ہیں۔

سہہ رہا ہوں دیر سے لاسیمیت کا اک عذاب
کٹ گیا اپنوں سے خود کو آسماں کرتا ہوا
میں سیرتوں کا ہمیشہ رہا ہوں شیدائی
میں صورتوں سے کسی وقت پیار کر نہ سکا
آتا ہے اگر کوئی خوشی سے میرے پاس
پلکوں پہ اسے بٹھا دیتا ہوں
اسی دور میں جیتا ہوں کہ جس میں انسان
وحشی و درندہ اور حیوان ہوا
مٹی کی سب امانتیں مٹی کو سونپ دیں
اک گھر بچا تھا وہ بھی میرا بھائی لے گیا
ملنے کو تو ملتے ہیں مگر دل نہیں ملتا
رشتے ہوئے ہیں اب کے بحال اور طرح کے
رات پھر ڈھونڈنے نکلا تھا پتا اپنوں کا

صبح پھر تھک کے میں گھر لوٹ گیا یاد آیا

اس درجہ بڑھیں گے کبھی اخلاص کے رشتے

جو بات نہ کہنے کی ہے وہ بات بھی ہوگی

فرید پربتی ایک دردمند اور حساس دل کے مالک ہیں۔ان کی غزلوں میں عصرِ حاضر کی کرب ناکی، انسانی قدروں کی پامالی اور رشتوں کی شکست و ریخت کو ملحوظ رکھتے ہوئے منشور بانہالی لکھتے ہیں۔

''فرید پربتی ایک حساس اور دیدہ ور شاعر تھا۔ وہ دورِ حاضر کی برق رفتاری مادی ہماہمی اور پھیلتی دنیا میں فرد کے ذہنی انتشار، غاصب قوتوں کی درندگی اور سرزوری، قتل و غارت گری، عصمت و محبت کی غلامی، روحانی اقدار کی بیخ کنی اور انسانی عظمت کی زوال آمادگی کے المیے کو دیکھ کر خیالات کے بے شمار جھلتے پیکر سامنے لاتا ہے۔'' ۹۲

فرید پربتی فنِ عروض پر بھی کامل دسترس رکھتے ہیں۔ مروجہ ردیف اور قافیوں کے ساتھ ساتھ فرید کے یہاں مشکل اور نامانوس ردیفوں اور قافیوں کا التزام بھی ملتا ہے۔لیکن معنی و مفہوم پر آنچ نہیں آنے دیتے ہیں۔ چھوٹی بڑی دونوں بحروں کو برتنے پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔فنِ غزل گوئی کے اسرار و رموز سے پوری آگہی رکھتے ہیں۔ فرید پربتی کے یہاں مشکل زمینوں میں بھی غزلیں ملتی ہیں لیکن وہ اس فن سے اچھی طرح واقف ہونے کی بدولت بظاہر اس کٹھن مرحلے سے بھی بڑی ہنرمندی اور آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ فرید کی غزلوں میں جو بات کھٹکتی ہے وہ ان کی بعض غزلوں میں موجود غیر ضروری اور بھرتی کے اشعار ہیں۔موصوف اپنی خوبیوں اور خامیوں سے باخبر ہیں۔خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

''آج تک میرے بارے میں جتنا کچھ بھی لکھا جا چکا ہے اس کو میں نے کبھی اپنے احتساب کا آئینہ نہیں بنایا۔ کیوں کہ میں اپنے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہوں، میں اپنی خوبیوں اور خامیوں سے کما حقہ واقفیت رکھتا ہوں ۔میں اپنے تخلیقی تجربے سے اپنے خیالات سے اپنے موقف سے اکیلے ہی سامنا کرتا ہوں۔'' ۹۳

زبان و بیان، علم و آگہی، فکر و فن، عروض و آہنگ، مضمون و معنی، تخیل و احساس وغیرہ غرض ہر سطح اور ہر اعتبار سے فرید پربتی ایک کامیاب غزل گو شاعر ہیں۔اگر چہ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، لیکن ان کا نام ان کے کلام کی بدولت وادیٔ غزل میں ایک خوبصورت گلاب کی مانند ہمیشہ مہکتا رہے گا۔اپنی بات ڈاکٹر اشرف آثاری کے فرید پربتی کے کلام پر کئے گئے اس خوبصورت تجزیے پر ختم کرتا

ہوں:

''فرید پربتی کا شاعرانہ فکر و احساس تر و تازہ بھی ہے اور غور و فکر کی نئی جہات لئے ہوئے بھی، ان کا بات کرنے کا سلیقہ اور الفاظ و تراکیب کا استعمال الگ بھی ہے، جدید بھی ہے اور تندرست و توانا بھی ہے اور متاثر کن بھی ہے۔ ان کی گفتگو میں بے ساختگی بھی ہے اور جامعیت و قطعیت بھی ہے کہ وہ کسی مخصوص نظریئے کی ترجمانی کرتے ہوئے نہیں دکھائی دیتے۔ وہ ہر اس خیال کو فن شعر کا لبادہ اوڑھا دیتے ہیں جو انہیں متاثر کرتا ہے۔ وہ بھی بڑی پختہ کاری اور فنی گرفت کے ساتھ کہ ان کا خیال، ان کا تجربہ، حسین و خوبصورت بھی لگے اور متاثر بھی کرے۔ ان کا ہر شعر دعوتِ تفکر بھی دیتا ہے اور سر پھری موجوں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی دیتا ہے اور ساحل سے آگے بڑھنے کی طاقت بھی عطا کرتا ہے۔ خوف و خطر سے بے نیاز بھی بنا دیتا ہے اور کارواں سے قبل ہی منزل مقصود کو چھو لینے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ ظلم و تشدد سے لڑنے کی ہمت و جرأت بھی پیدا کر دیتا ہے اور خطرات سے نبرد آزمائی کا سبق بھی سکھاتا ہے کیونکہ ان کے خالق کو اپنی جنبش قلم پر مکمل بھروسہ ہے۔''۹۴

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ مصرہ مریم، ''حامدی کاشمیری حیات اور خدمات'' ص نمبر ۷۴۔۷۵

۲۔ ''میرا تحقیقی سفر'' حامدی کاشمیری، مشمولہ ''شیرازہ'' (کلچرل اکیڈمی سرینگر، جلد۔۲۴، شمارہ۔۳) ص نمبر ۱۵

۳۔ ''میرا تحقیقی سفر'' حامدی کاشمیری، مشمولہ ''شیرازہ'' (کلچرل اکیڈمی سرینگر، جلد۔۲۴، شمارہ۔۳) ص نمبر ۱۵

۴۔ مصرہ مریم، ''حامدی کاشمیری حیات اور خدمات'' ص نمبر ۹۰

۵۔ عبارت بریلوی ''غزل اور مطالعہ'' ص نمبر ۱۲۵

۶۔ مصرہ مریم، ''حامدی کاشمیری حیات اور خدمات'' ص نمبر ۱۰۵۔۱۰۶

۷۔ مشمولہ ''تعمیر''، جموں و کشمیر ادب نمبر، منیب الرحمٰن، ص نمبر ۱۵

۸۔مشمولہ ''تنقید نما'' از مظہر امام، ص نمبر ۹۷
۹۔محمد یوسف خان عادلؔ ''کشمیر میں اُردو شاعری ۱۹۴۷ء کے بعد'' ص نمبر ۱۰۵
۱۰۔مخمور سعیدی ''تحریک'' (دسمبر ۱۹۹۷ء) ص نمبر ۳۵
۱۱۔ڈاکٹر برج پریمی ''جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو نما'' ص نمبر ۱۹۸
۱۲۔مصرہ مریم، ''حامدی کاشمیری حیات اور خدمات'' ص نمبر ۴۹۔۵۰
۱۳۔مشمولہ ''شیرازہ''، حامدی کاشمیری نمبر، نشاط انصاری، ص نمبر ۳۸
۱۴۔مشمولہ ''شیرازہ'' (کلچرل اکیڈمی سرینگر، جلد۔۴، شمارہ۔۶۔۷) ص نمبر ۲۸
۱۵۔حامدی کاشمیری ''لاحرف'' (دیباچہ) ص نمبر ۸
۱۶۔بل راج کومل، سہ ماہی ''سطور'' (مارچ تا مئی ۱۹۷۸ء) ص نمبر ۲۵
۱۷۔مصرہ مریم، ''حامدی کاشمیری حیات اور خدمات'' ص نمبر ۹۸
۱۸۔''قومی آواز'' (مہ نامہ ستمبر ۱۹۹۵) ص نمبر ۳۸
۱۹۔حامدی کاشمیری ''شاخ زعفران'' ص نمبر ۷
۲۰۔مصرہ مریم، ''حامدی کاشمیری حیات اور خدمات'' ص نمبر ۱۵۸
۲۱۔(مباحث، ڈاکٹر برج پریمی۔ص:۱۳۹
۲۲۔(کشمیر میں اردو، حصّہ سوم، ص:۱۴۰)
۲۳۔(ماہنامہ ''شیرازہ'' سرینگر، حکیم منظور نمبر، ص:۱۰۴)
۲۴۔(راجندر منچندہ بانی، ''پیش لفظ'' ناتمام، ص:۵)
۲۵۔(دیباچہ ''سخن برف زاد، حکیم منظور، ص:۴)
۲۶۔(ماہنامہ ''شیرازہ'' سرینگر، حکیم منظور نمبر، ص:۱۸۹)
۲۷۔(پریمی رومانی، توازن، ص:۶۷)
۲۸۔(ماہنامہ، شیرازہ، سرینگر، حکیم منظور نمبر، ص:۳۷۔۳۸)
۲۹۔(ڈاکٹر پریمی رومانی، توازن، ص:۶۴)
۳۰۔(پروفیسر گوپی چند نارنگ، ناتمام، فلیپ سے)
۳۱۔(ماہنامہ، شیرازہ، حکیم منظور نمبر، ص:۱۹۱)
۳۲۔(حکیم منظور، ماہنامہ، شیرازہ، سرینگر، ص:۴۶)
۳۳۔(محمد یوسف خان عادل، کشمیر میں اردو شاعری ۱۹۴۷ء کے بعد، ص ۱۲۱)

۳۴۔ ہمدم کاشمیری، ''دھوپ لہو کی'' (دیباچہ، عرفان صدیقی) ص نمبر ۱۵
۳۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''ہمدم کاشمیری کی غزلیں'' (مشمولہ ''ورق سادہ)
۳۶۔ ہمدم کاشمیری، ''دھوپ لہو کی'' (دیباچہ، عرفان صدیقی) ص نمبر ۱۶۔۱۷
۳۷۔ ہمدم کاشمیری، ''دھوپ لہو کی'' (دیباچہ، عرفان صدیقی) ص نمبر ۲۰۔۲۱
۳۸۔ شفیق سوپوری ''ہمدم کاشمیری کا شہر غزل'' (مشمولہ ''جہات'') ص نمبر ۳۶
۳۹۔ شفیق سوپوری ''ہمدم کاشمیری کا شہر غزل'' (مشمولہ ''جہات'') ص نمبر ۳۶
۴۰۔ ہمدم کاشمیری، ''دھوپ لہو کی'' (دیباچہ، عرفان صدیقی) ص نمبر ۲۲
۴۱۔ جاوید انور، ''وادی کشمیر کے چند اہم شعراء'' ص نمبر ۱۲۱۔۱۲۲
۴۲۔ جاوید انور، ''وادی کشمیر کے چند اہم شعراء''، ص نمبر ۶۱
۴۳۔ جاوید انور، ''وادی کشمیر کے چند اہم شعراء''، ص نمبر ۶۰
۴۴۔ محمد ہاشمی، مشمولہ ''تحریک ادب'' (وارانسی، شمارہ ۱۴، ۲۰۱۲ء) ص نمبر ۹۱
۴۵۔ جاوید انور، ''وادی کشمیر کے چند اہم شعراء''، ص نمبر ۶۵
۴۶۔ جاوید انور، ''وادی کشمیر کے چند اہم شعراء''، ص نمبر ۶۶
۴۷۔ مظفر حنفی، مشمولہ ''سہ ماہی تحریک ادب'' (وارانسی، شمارہ ۱۴، ۲۰۱۲ء) ص نمبر ۸۲
۴۸۔ (مشمولہ، قرطاس، ماہنامہ ناگپور، ص: ۶۴)
۴۹۔ (دیباچہ ''ثبات، ص: ۵)
۵۰۔ (مشمولہ، قرطاس، گوشہ ایرج ناگپور نومبر دسمبر ۲۰۱۱ء، ص: ۱۷)
۵۱۔ (بشیر نواز، انکسار، فلیپ سے)
۵۲۔ (مشمولہ، ماہنامہ ''قرطاس'' ناگپور نومبر دسمبر ۲۰۱۱ء، ص، ۱۰)
۵۳۔ (افتخار اجمل شاہین ''اثبات'' فلیپ سے)
۵۴۔ (مشمولہ قرطاس، ماہنامہ گوشہ مظفر ایرج، دسمبر ۲۰۱۰، ص: ۴۴)
۵۵۔ (قدوس جاوید، سخن آئینہ، فلیپ سے)
۵۶۔ (مشمولہ، انتساب عالمی، سرونج، شمارہ ۹۲، ص: ۱۶۵)
۵۷۔ (دیپاچہ، مشراق، ص: ۱۳)
۵۸۔ (احمد فیضان، بحوالہ، رفیق راز آئینہ تمثال دار، مرتبہ، ریحانہ اختر ص ۱۵)
۵۹۔ (ڈاکٹر شفیق سوپوری، مشمولہ، جہات، ص: ۲۹)

۶۰۔(میکش امروہی، مشراق، فلیپ سے)
۶۱۔(شمس الرحمٰن فاروقی، انہار، فلیپ سے)
۶۲۔(حامدی کاشمیری، بحوالہ ''رفیق راز آئینہ تمثال دار'' مرتب، ریحان اختر، ص نمبر ۶۲)
۶۳۔(حامدی کاشمیری ''انہار'' فلیپ سے)
۶۴۔(ڈاکٹر نذیر آزاد، مشمولہ مہنامہ ''شیرازہ'' سرینگر، شمارہ ۔۵، جلد ۔۵۱، ص نمبر ۱۷)
۶۵۔(عادل بنارسی ''مشراق'' فلیپ سے)
۶۶۔''نقد ایاز'' فلیپ سے
۶۷۔مشمولہ ''توازن'' ص نمبر ۱۵۹
۶۸۔(''نقدِ ایاز'' فلیپ سے)
۶۹۔(''جموں و کشمیر میں اردو شاعری''، مشمولہ ''شاعر''، ممبئی مئی ۲۰۰۹، ص ۲۵)
۷۰۔ (مشمولہ ''قدر ایاز'' ص ۱۰)
۷۱۔(مشمولہ، شیرازہ، جموں کشمیر میں اُردو شاعری نمبر، ص ۱۹۷)
۷۲۔(ظفر اقبال ''نقد ایاز'' فلیپ سے)
۷۳۔خالد بشیر احمد، ''خالد بشیر احمد شخص شاعر اور ادیب'' مرتب جاوید انور، ص، ۳۳
۷۴۔خالد بشیر احمد، ''خالد بشیر احمد شخص شاعر اور ادیب'' مرتب جاوید انور، ص، ۳۳۔۳۴
۷۵۔خالد بشیر احمد، ''خالد بشیر احمد شخص شاعر اور ادیب'' مرتب جاوید انور، ص، ۳۵
۷۶۔ڈاکٹر شفق سوپوری، بحوالہ، ''خالد بشیر احمد شخص شاعر اور ادیب'' مرتب جاوید انور، ص، ۱۳۴
۷۷۔ڈاکٹر شفق سوپوری، بحوالہ، ''خالد بشیر احمد شخص شاعر اور ادیب'' مرتب جاوید انور، ص، ۱۳۳
۷۸۔حامدی کاشمیری، مشمولہ، پیش لفظ، ''صدائے نیم شب'' ص، ۵
۷۹۔ مصطفٰی اکبر، بحوالہ،، ''خالد بشیر احمد شخص شاعر اور ادیب'' مرتب جاوید انور، ص، ۲۷
۸۰۔جاوید انور، ''وادیٔ کشمیر کے چند اہم شعراء، ص ۱۵۵۔۱۵۶
۸۱۔ایاز رسول نازکی، ''شیرازہ'' جموں و کشمیر میں شاعری نمبر، جلد ۔۵۲، (شمارہ ۶۔۷) ص ۸۱
۸۲۔خالد بشیر احمد، مشمولہ، ''خالد بشیر احمد شخص شاعر اور ادیب'' مرتب جاوید انور، ص ۶۴
۸۳۔ڈاکٹر مولا بخش، بحوالہ،، ''خالد بشیر احمد شخص شاعر اور ادیب'' مرتب جاوید انور، فلیپ سے
۸۴۔(محمد اشرف ٹاک ''شیرازہ'' فرید پربتی نمبر، ص، ۹۰۔۸۹)
۸۵۔(مشمولہ ''فرید پربتی شعر شعور اور شعریات''، مرتب، سلیم سالک، ص، ۴۸)

۸۶۔(مشمولہ پیش لفظ ''ہزار امکان'' ص ۷)
۸۷۔(مشمولہ شیرازہ، فرید پربتی نمبر، ص ۵۷)
۸۸۔(مشمولہ، ''شیرازہ'' فرید پربتی نمبر، ص، ۹۷)
۸۹۔(مشمولہ ''شعر شعور شعریات'' مرتب، سلیم سالک، ص، ۲۳)
۹۰۔(مشمولہ ''شیرازہ'' فرید پربتی نمبر، ص ۲۸،۲۹)
۹۱۔(مشمولہ فرید پربتی، شعر شعور اور شعریات، مرتب، سلیم سالک، ص ۴۷)
۹۲۔(مشمولہ، شیرازہ، فرید پربتی نمبر ص ۷۵)
۹۳۔(ہزار امکان، فرید پربتی، ص، ۵)
۹۴۔(مشمولہ ''شیرازہ'' فرید پربتی نمبر، ص ۱۱۵)

☆☆☆☆☆☆☆☆

جموں و کشمیر کے نمائندہ غزل گو شعراء ۱۹۴۷ء کے بعد

(ب) صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے شعراء

جموں و کشمیر میں اُردو کو سرکاری سرپرستی ملنے سے پہلے ہی یہ یہاں عوامی سطح پر مقبول ہو رہی تھی۔ ریاست میں اردو زبان کا باقاعدہ آغاز کب اور کہاں ہوا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ کشمیر کے مقابلے میں جموں صوبے میں اردو کے آثار پہلے ملتے ہیں۔ اسکی خاص وجہ یہ ہے کہ جموں کا علاقہ پنجاب کے ملحقہ علاقوں سے تجارتی اور دوسری ضروریات کے لئے عرصۂ دراز سے منسلک رہا ہے۔ پنجاب کے ان علاقوں میں لاہور، سیالکوٹ، دہلی وغیرہ میں اردو کا خوب چلن تھا۔ جموں کے باشندوں کا ان علاقوں کے باشندوں کے ساتھ تجارتی اختلاط آپسی میل ملاپ کے نتیجے کے طور پر اردو زبان کا اثر بھی ان پر پڑھا۔ اور دھیرے دھیرے یہاں کے لوگ اردو کی جانب متوجہ ہوئے۔ اور اس زبان میں بات چیت کرنے لگے۔ عوام میں اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے بنا پر مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اس کو ۱۸۸۹ء میں سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر اسد اللہ وانی لکھتے ہیں:

''جموں خطے میں اردو کے ابتدائی آثار تلاشتے وقت اس بات کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ یہاں اردو کی ابتدا کہاں اور کب ہوئی؟ البتہ ایک حقیقت کا اعتراف سب کو کرنا ہوگا کہ کشمیر کی بہ نسبت جموں میں اردو کا آغاز بہت پہلے ہوا ہے کیونکہ تقسیم ہند سے پہلے جموں کے متحدہ پنجاب سے گہرے تعلقات تھے۔ یہاں دلی، لاہور، سیالکوٹ اور دوسرے ملحقہ علاقہ جات سے ایسے لوگوں کا آنا جانا تھا جو اردو زبان پر دسترس رکھتے تھے۔۔ اور مہاراجہ کے دربار میں اردو کی کافی پزیرائی تھی'' [۱]

اردو زبان کو درباری زبان کا اعزاز ملنے کے بعد ریاست کے قلم کاروں نے مقامی زبانوں کے پہلو بہ پہلو اردو زبان کو بھی وسیلہ اظہار بنانا شروع کیا۔ جہاں تک جموں میں اردو شاعری کا تعلق ہے اس کی شروعات باقاعدہ طور پر انیسویں صدی کے آخری عشرے اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اردو داں حضرات ریاستی مہاراجہ کے دربار میں ملازم کی حیثیت سے تعینات ہو کر آئے۔ ان حضرات میں پیرزادہ محمد حسین عارف، لالہ کنورسین، پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی، منشی سراج الدین احمد، چودھری خوشی محمد ناظر، محمد الدین فوق، مولوی عبدالصمد، مولوی نذیر احمد، شیخ بشیر محمد، منشی امیر الدین امیر، صادق علی صادق وغیرہ کے علاوہ بھی بہت سارے لوگ مہاراجہ کی حکومت میں مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ ان حضرات نے اپنے فرائض احسن طریقے سے انجام دینے کے علاوہ

ریاست میں اردو شاعری کی محفلیں بھی منعقد کیں۔ جن میں ان کے علاوہ ملک کے نامور شعراء کے ساتھ ساتھ مقامی شعراء بھی شرکت کرتے تھے۔ ان لوگوں کی مسلسل کوششوں کی بدولت ریاست میں اردو شعروادب کا ایک ماحول قائم ہوا اور باقاعدہ انجمنوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ ریاست میں مختلف ادوار میں قائم کی گئی ان انجمنوں میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، آل انڈیا کشمیری کانفرنس، انجمن اسلامیہ جموں، انجمن نصرت الاسلام سرینگر، انجمن مفرح القلوب، انجمن مفرح الارواح، ینگ منز مسلم ایسوایشن جموں، بزمِ مشاعرہ جموں، بزمِ اردو جموں وکشمیر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا انجمنوں کی جانب سے مختلف اوقات میں منعقد کئے جانے والے مشاعروں میں ہندوپاک کے جن نامور شعراء نے شرکت کی ہیں ان میں سیماب اکبر آبادی، یگانہ چنگیزی، علامہ اقبال، فیض احمد فیض، روش صدیقی، تاجور نجیب آبادی، اثر لکھنوی، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، اختر شیرانی، ساغر نظامی، جوشؔ ملسیانی، پنڈت دتاتریہ کیفی، حاجی لقلق، سید عابد علی عابد، سوہن لال ساحر، ڈاکٹر محمد الدین تاثیر، میلا رام وفا، خلیفہ عبدالحکیم، صوفی تبسم وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایسی محفلوں اور ایسے شعراء کی صحبت میں ریاست کے اس دور کے بہت سے پڑھے لکھے نوجوانوں کا شعری اور ادبی ذوق بھی پروان چڑھنے لگا اور وہ بھی ان شعراء کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی کاوشیں پیش کرنے لگے۔ ان حضرات میں مرزا مبارک بیگ مبارک، غلام رسول کامگار کشتواڑی، پیر غلام محی الدین محیؔ، رانا گوپال سنگھ طالبؔ، منشی غلام نبی مسکین، عبدالرحیم اعما بانہالی، قاضی شمس الدین شمس، مولوی حسن حسنؔ، منشی نورالدین عنبر، قیس شیروانی، حکیم عبدالغنی شجر طہرانیؔ، عما الدین سوز، جمیل نظامی، حبیب اللہ کوثر، منوہر لال دلؔ، آذر عسکری، منشی بشارت احمد، شیخ غلام حسن رساؔ وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ شعراء جموں کے شعری منظرنامے پر بیسویں صدی کے اوائل میں سرگرم رہے ہیں۔ ان کے بعد جموں میں آزادی سے پہلے جن شعراء نے صنف غزل میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے اور اس صنف سخن میں اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے ان میں رسا جاودانی، اثر صہبائی، کشن سمیل پوری، چراغ حسن حسرت، غلام حیدر کگرو کشتواڑی، غلام حیدر چستی، دینا ناتھ رفیق، نشاط کشتواڑی، منوہر لال دلؔ، مہجور راجوری، ضیا الحسن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم کے کرب ناک واقع کے نتیجے میں ملک کے بعض اہم ادبی مراکز کی طرح ریاست جموں وکشمیر میں بھی شعراء اور ادباء کا شیرازہ منتشر ہوا۔ جموں خطے کے بیشتر شعراء ہجرت کر کے لاہور، سیالکوٹ، راولپنڈی اور پاکستان کے دیگر مقامات پر آباد ہوگئے۔ ان کے جانے سے جموں کی شعری محفل سونی سی پڑگئی۔ لیکن رفتہ رفتہ شعراء کی ایک نئی پود منظر عام پر آنے لگی۔ جو اپنی تخلیقات کی

بدولت جموں کے شعری منظرنامے پر چھانے لگے۔ آزادی کے بعد صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے جن شعراء نے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں اندرجیت لطف، عرش صہبائی، وفا بھدرواہی، کنول سین نگہت، ودیا رتن عاصی، مشتاق فریدی، قاضی محمد اسد اللہ، بشیر بھدرواہی، اکرام سانبوی، مرزا یٰسین بیگ، عابد مناوری، شہباز راجوروی، تنویر بھدرواہی، پرتپال سنگھ بیتاب، احمد شناس، فاروق مضطر، حسام الدین بیتاب، آنند سروپ انجم، راج کمار چندن، بلراج بخشی، ساگر صحرائی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جموں کے مذکورہ بالا شعراء میں سے جو آزادی کے بعد صنف غزل کے گیسو سنوارنے میں خاص طور پر منہمک رہے ہیں۔ ان کے مختصر حالاتِ زندگی اور غزل گوئی کی تفصیل آگے آنے والے صفحات میں پیش کی جارہی ہے۔ یہاں صرف انہی شعراء کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جنہوں نے جموں صوبے میں آزادی کے بعد صنف غزل میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے اور جو اس خطے میں ۱۹۴۷ء کے بعد اردو غزل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

عرش صہبائی

ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کے علم بردار شعراء میں جناب عرش صہبائی کا نام سرفہرست ہے۔ موصوف صنف غزل سے والہانہ شغف رکھتے ہیں۔ اگرچہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی شناخت بحیثیت غزل گو ہی زیادہ نمایاں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عرش ریاست میں اردو غزل کے میر کارواں ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ انہوں نے ریاستی سطح پر صنف غزل کی ایسی آبیاری کی ہے جو ناقابلِ فراموش ہے۔

اردو دنیا میں ۱۹۵۰ء کے بعد نمودار ہونے والے سخن سنج عرش صہبائی کا اصلی نام ہنس راج ابرول ہے۔ ان کی پیدائش ریاست کے سرحدی تحصیل اکھنور کے گاؤں باختن میں ۲۳ دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ اسی گاؤں میں عرش کی نانیھال بھی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ماہ وسال یہی گزارے ہیں۔ ان کے والد مادھورام ابرول فوج میں حوالدار کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد مقامی اسکول میں مدرس ہوگئے۔ ان کی والدہ کا نام رام رکھی تھا۔ جن کا انتقال اس وقت ہوا جب عرش فقط ۲۲ دن کے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بچپن کن حالات میں گزرا ہوگا۔ شفقتِ مادر سے شیر خوری میں ہی محروم ہونا صدمہ جانکاہ ہے۔ ماں کی ممتا کی کمی زندگی بھر محسوس کرتے رہے ہیں۔ تعلیمی سفر کا آغاز گاؤں کے پرائمری اسکول سے کیا۔ اس کے بعد ان کے والد مع خاندان گاؤں سے جموں شہر منتقل ہوئے اور علاقہ

کٹھی چھاونی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ یہاں عرش نے دسویں کا امتحان رنبیر ہائی اسکول سے پاس کیا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے جموں کے مشہور کالج گاندھی میموریل کالج میں داخلہ لیا اور یہاں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ گھر کے کمزور مالی حالات کے پیش نظر انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ یہی پر منقطع کیا اور جموں کی ریسرچ لیبارٹری میں ملازمت اختیار کی۔ لیبارٹری میں چونکہ جانوروں پر تجربات کیے جاتے ہیں۔ یہ عمل عرش جیسے حساس شخص کی طبیعت پر بڑا گراں گزرتا تھا۔ وہ جانوروں کی اس چیر پھاڑ سے افسردہ ہوتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس ملازمت کو ترک کردیا۔ ۱۹۵۵ء میں آل انڈیا ریڈیو میں عرش صہبائی کو نوکری ملی اور وہ ریڈیو کے اکاؤنٹس شعبہ سے منسلک ہوگئے۔ ملازمت کا سلسلہ ۳۳ سال تک جاری رہا۔ اس دوران جموں، دہلی، جودھپور، سلی گوڑی، سرینگر، روہتک، جیسی جگہوں پر انہیں اپنی خدمات انجام دینے کا موقع ملا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں سبکدوش ہوئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد عرش صحافت میں دلچسپی لینے لگے اور روزنامہ ''قومی آواز'' جموں سے منسلک ہوگئے۔ قومی آواز اور دیگر اخبارات سے عرش تقریباً آٹھ برس تک وابستہ رہے۔ آج کل جموں کے محلہ ریشم گھر کالونی میں ایامِ پیری گزار رہے ہیں۔

عرشؔ صہبائی شاعری کے میدان میں اس وقت وارد ہوئے جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اس وقت سے ان کو شاعری کا شوق پیدا ہوا اور یہ سلسلہ روز افزوں بڑھتا گیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ان کے اردو کے استاد شیخ حمید اللہ کلاس میں بیت بازی کے مقابلے کراتے تھے۔ جس میں عرش بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ حصّہ لیتے تھے۔ علاوہ ازیں جموں شہر میں مشاعروں کا سلسلہ آزادی سے پہلے ہی چلتا رہتا تھا۔ جن میں مقامی شعراء کے علاوہ بیرون ریاست سے چوٹی کے شعراء بھی مدعو کئے جاتے تھے۔ عرش بھی ان مشاعروں میں شروع میں ایک سامع کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے۔ ان مشاعروں اور دیگر ادبی محفلوں میں اُٹھنے بیٹھنے سے عرش کے اندر خوابیدہ شاعر بیدار ہوا، اور وہ بھی شعر موزوں کرنے لگے۔ اس طرح سے انہوں نے مشق سخن شروع کیا اور بہت جلد مقامی سطح پر اپنی شناخت قائم کی۔ مقامی سطح پر منعقد ہونے والی شعری اور ادبی نشستوں میں اب عرش صہبائی باقاعدہ شریک ہونے لگے اور بہت پسند کیے جانے لگے۔ علاوہ ازیں ملک کے اہم ادبی رسائل و جرائد میں بھی ان کا کلام شائع ہونا شروع ہوگیا۔ اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' ان دنوں ہندوستان میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ ادبی جریدہ تھا اور اس میں تخلیقات کا چھپنا کسی بھی ادیب یا شاعر کے لئے باعث افتخار بات ہوتی تھی۔ عرش نے بھی اپنی غزل اشاعت کی غرض سے ارسال کی اور وہ اگلے شمارے میں شائع ہوئی۔ جسے دیکھ کر انہیں دلی مسرت ہوئی تھی۔ مذکورہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہمارے ضبط کی آخر فغاں تک بات آپہنچی

ذرا سی بات سے بڑھ کر کہاں تک بات آ پہنچی
انہوں نے مسکرا کر بات کا موضوع بدل ڈالا
کبھی جب اُن کے حسن دلستان تک بات آ پہنچی
کہیں باتوں ہی باتوں میں نہ پھر تکرار ہوجائے
وہیں تک بات رہنے دو جہاں تک بات آ پہنچی

جوشؔ ملسیانی نے ریاست جموں وکشمیر کے متعدد شعراء کے شعری ذوق کو سنوارنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ریاست میں ان کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ وہ لگ بھگ ہر سال جموں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی غرض سے آتے تھے۔ ایک کل ہند مشاعرے میں عرشؔ صہبائی سے بھی ان کی ملاقات ہوئی اور اس کے بعد انہوں نے عرش کو اپنا شاگرد بنایا۔ اس طرح سے عرشؔ صہبائی اپنا ابتدائی کلام اصلاح کے لئے جوش ملسیانی مرحوم کو بھیجنے لگے۔ اس واقع کا تذکرہ عرش نے راقم کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران کچھ اس طرح کیا:

''جموں کے ایک کل ہند اردو مشاعرے میں قبلہ جوش ملسیانی کے نیاز حاصل ہوئے۔ اس کے بعد میں نے اپنا کلام اصلاح کے لئے ان کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا۔''[۲]

اپنے شاگردوں کے حلقے میں جوش ملسیانی، عرش کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کے کلام کے معترف تھے۔ عرش کو وہ پنجاب اور دوسری جگہوں پر منعقد کیے جانے والے مشاعروں میں بھی مدعو کرتے تھے۔ جن کی بدولت عرش ریاست کے باہر بھی مشہور ہونے لگے۔

عرش صہبائی نے اردو شاعری بالعموم اور اردو غزل بالخصوص کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ وہ جموں وکشمیر کے واحد ایسے شاعر ہیں جن کے ڈیڑھ درجن شعری مجموعے شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۸ء میں ان کے پہلے شعری مجموعے ''شکست جام'' کے منظر عام پر آنے سے شروع ہوا اور پھر یکے بعد دیگرے ''شگفت گل (۱۹۶۱)، صلیب (۱۹۶۳)، یہ چھونپڑے یہ لوگ (۱۹۷۵)، اسلوب (۱۹۹۱)، ریزہ ریزہ وجود (۱۹۹۵)، اساس (۲۰۰۱)، نایاب (۲۰۰۴)، توازن (۲۰۰۵)، دسترس (۲۰۰۷)، چشم نیم باز (۲۰۰۷)، عکسِ جمال (۲۰۰۷)، خوشبو تیرے بدن کی (۲۰۰۸)، خدوخال (۲۰۰۸)، تجھ بن چین کہاں (۲۰۰۹)، سائے تیری یادوں کے (۲۰۱۰)، جواز (۲۰۱۱)، شبنم تیری یادوں کی (۲۰۱۳)، دل کے خواب ادھورے (۲۰۱۴)، جیسے شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

عرش صہبائی کے اس گراں قدر شعری سرمایہ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے اردو غزل کی بے لوث خدمت کی ہے کیونکہ مذکورہ شعری مجموعوں میں متعدد بہ حصّہ صنف غزل پر ہی مشتمل ہے۔عرش صہبائی نے جب گلستان غزل میں قدم رکھا تو انہوں نے بھی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے ساغر و مینا، حسن و عشق، رند و مستی، ہجر و وصال وغیرہ جیسے موضوعات کا انتخاب کیا۔عرش کے ابتدائی کلام میں بادہ و ساغر، ساقی و میخانے سے متعلق متعدد مضامین در آئے ہیں۔ چند اشعار دیکھے۔

ہر گام پر تھیں ٹھوکریں راہ حیات میں
لیکن بہ فیض ساغر و مینا سنبھل گئے

جناب شیخ بھی آئے ہیں اے ساقی زیارت کو
عقیدت ہے انہیں بھی تیرے میخانے سے تھوڑی سی

مے کدے میں جب میسّر ہے سکون
کون کافر سجدہ دیر و حرم کرتا ہے

ہم بادہ کشی ترک تو کر سکتے ہیں لیکن
دل پر غمِ دوراں کا اثر اور پڑھے گا

عرش جب دیر وحرم میں نہ ملا اس کو سکون
زندگی چپکے سے میخانے چلی آئی ہے

زندگی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں نعمت عظمیٰ ہے اس زندگی میں انسان روز افزوں نئی نئی منزلوں، حادثوں اور حالاتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔زندگی ہر وقت، ہر عہد اور ہر زمانے میں نئے نئے روپ اور رنگ اختیار کرتی ہے۔غرض زندگی مسلسل بدلتی رہتی ہے۔عرش کی غزل میں زندگی سب سے اہم اور متحرک موضوع ہے۔انہوں نے اپنے کلام میں وہی کچھ بیان کیا ہے جو زندگی نے ان کو دیا ہے۔زندگی کے نشیب و فراز کو عرش نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ تو اپنی غزلوں میں سمویا ہے۔زندگی جامد نہیں بلکہ متحرک چیز کا نام ہے۔عرش نے جس ماحول اور جن حالات میں اپنی زندگی گزاری ہے اس کی عکاسی نہایت خلوص کے ساتھ اپنی غزلوں میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

فضائے زندگی میں اک مہک سی پھیل جاتی ہے
کبھی دل میں جو تیری یاد کے غنچے چٹکتے ہیں

اور سب کچھ ہے مگر ایسا گہر کوئی نہیں
اس جہاں میں زندگی سے معتبر کوئی نہیں

زندگی حادثوں کی ہے تقریب
وقت نامہ نگار ہوتا ہے

کوئی بھی ہو مرحلہ اس سے گزر جاتے ہیں عرش
ہم نہیں اُن میں جنہیں بار گراں ہے زندگی

اس میں غم بھی ہیں اور راحت بھی
زندگی کا یہی رکھ رکھاو ہے

میں نے تمام عمر گزاری ہے اس کے ساتھ
اس زندگی سے بڑھ کر کوئی خو برو نہیں

عرش زندگی میں بچپن سے ہی مشکلات اور مصائب میں مبتلا رہے ہیں۔ وہ زندگی کی بعض بنیادی ضروریات سے بھی محروم رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں مصیبتوں اور پریشانیوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں مگرانہوں نے ایک حساس انسان اور شاعر کی طرح ان کٹھن ایام کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا اور کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ ہمیشہ ہمت اور حوصلے سے کام لیا اور ہنستے مسکراتے مشکلات کا سامنا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ زندگی کی دھوپ چھاؤں سے اچھی طرح واقف ہیں اور ہر حال میں زندگی جینے کا طریقہ اور سلیقہ جانتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

گو زیست میں ہر چیز سے محروم رہے ہیں
یہ ظرف طبیعت ہے کہ ہم جھوم رہے ہیں

جو بھی لمحہ ہے تپتی ہوئی ریت ہے
زندگی کربلا کے سوا کچھ نہیں

زندگی گزری ہے میری مسئلوں کے درمیان
زندگی کے مسئلے میری طرح سمجھے گا کون

عرشؔ کی غزلوں میں زندگی کے متنوع موضوعات کے پیشِ نظر ڈاکٹر جاوید وششٹ انہیں ''مغنی حیات'' کا لقب دیتے ہیں۔ وہ ان کی شاعری میں زندگی کو انفرادی عنصر ٹھہراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عرش نے اپنی شعری انفرادیت کا سنگِ بنیاد ''زندگی'' پر رکھا ہے۔ اس لئے وہ استوار بھی ہے اور زندگی کی طرح جمود سے بے نیاز بھی، اس میں روانی بھی ہے اور تسلسل بھی۔ عرش صہبائی نے اپنی غزلوں میں زندگی کو اسطرح پیش کیا ہے کہ وہ خود اپنا محور بن جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان کی غزل میں آ کر زندگی

خود غزل بن جاتی ہے۔'' ۳۔

رنج وغم اور راحت ومسرت زندگی کے اہم تجربات ہیں۔ جن سے ہر خاص وعام نبرد آزما ہوتا ہے۔ عرش صہبائی کی زندگی میں بھی ان دونوں پہلوؤں کا نمایاں اثر رہا ہے۔ یہاں وہ خوشی اور سکون کے لمحات کی خواہش کرتے ہیں اور جو کسی حد تک ان کو حاصل بھی ہوتی ہے۔ وہ درد وغم کو بھی عزیز رکھتے ہیں، کیونکہ زندگی کی حقیقت ان دونوں چیزوں میں مضمر ہے۔ عرش نے اپنی متعدد غزلوں کے اشعار میں زندگی کی اس ٹھوس حقیقت کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چند اشعار یہاں اس حوالے سے نقل کرتا ہوں :

خزاں کا عکس بھی ہے پر تو بہار بھی ہے
یہ زندگی غم وراحت کا آبشار بھی ہے

یہ بحر زندگی ہے مختلف ہیں زاویے اس کے
سکوت بیکراں کے ساتھ طغیانی بھی ہوتی ہے

ہم سفر ہے آفتوں کا اک ہجوم
زندگی میں ہم کبھی تنہا نہیں

ہے لذت حیات سے ناآشنا ابھی
وہ بد نصیب دل کہ جو محروم غم سے ہے

راحتیں چونکہ دائمی نہیں ہوتی ہیں یہ مختصر اور قلیل مدت تک ساتھ نبھاتی ہیں اس لئے عرش راحتوں کی بہ نسبت رنج وغم کو زیادہ مرغوب رکھتے ہیں۔ غم وہ شے ہے جو انسان کو بہتر زندگی جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ عرش رنج وغم کو زندگی کا لازمی جزو تصور کرتے ہیں۔ مصائب وآلام عرش کے مطابق زندگی کو بامقصد بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ راحتیں انسان کو بے فکر بنا دیتی ہیں جبکہ غم اس کو فکر ،عزم، حوصلہ ، ہمت جیسی چیزوں سے بہرہ ور کرتا ہے۔ اگرچہ عرش ایک طرف خوشی، سکون، راحت ومسرت کے لئے ترستے بھی نظر آتے ہیں، وہیں دوسری جانب ان چیزوں کو ناپائیدار اور عارضی سمجھ کر غم کو ہی اپنا ہمدم مانتے ہیں۔ جس نے زندگی کے ہر موڑ پر ان کا ساتھ کسی بے لوث ساتھی کی طرح دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

راحتیں ابر رواں بن کر بکھر جائیں گی عرشؔ
زندگی کی ہر حقیقت غم کے پس منظر میں دیکھ

ڈھونڈتے ہی رہ گئے ہم راحتوں کے سلسلے

زندگی میں ہر قدم پر غم کی زنجیریں ملیں
جینے کی خاطر غم لازم ہوتے ہیں
یہ کشتی طوفان کے سہارے چلتی ہے
غنیمت ہے کہ راحت اور غم پہلو بہ پہلو ہیں
وگرنہ زندگی بے کیف سا افسانہ بن جائے
زندگی ایک مرقع ہے غم وراحت کا
خار وگل دونوں سے تزئین چمن ہوتی ہے

پروفیسر عبدالقادر سروری عرشؔ کی غزلوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

حیات اور کردار حیات کے بارے میں ان کے اپنے تجربات اور مشاہدات ہیں۔ یہ موضوع غزل کی شاعری کے لئے نئے نہیں لیکن جب شاعر کا ذاتی احساس اس کو دہراتا ہے تو وہ نئے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کی طرح جو زندگی کو بند غم جانتے ہوئے بھی ایک عملی مفکر کی طرح اس کے امکانات سے چشم پوشی نہیں کرسکتے تھے اور اپنے عدم زندگی پر ہر حال فوقیت دینے پر مجبور تھے۔ عرش بھی زندگی تلاش، راحت وعشرت میں ناکام رہ کر بھی زندگی کے قدردان ہیں۔'' [۴]

عشق وہ جذبہ ہے جو ہر دل میں موج زن رہتا ہے اس عشق کے ہزاروں رنگ وروپ ہیں۔ جب سے اردو غزل نے آنکھ کھولی ہے اس روز سے عشق اس کا بنیادی اور نمایاں موضوع رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عشق اور غزل لازم وملزوم ہیں تو بے جانہ ہوگا۔ کیونکہ عشق کے جتنے بھی روپ ہیں ان کی عکاسی جس خوبصورتی کے ساتھ صنفِ غزل میں کی گئی ہے وہ کسی دوسری صنف میں نادید ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''صنفِ غزل میں جن انفرادی کیفیات کی تصویر کشی ملتی ہے اس میں عشقیہ کیفیات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ غزل نے متنوع اور رنگارنگ عشقیہ کیفیات کو اپنے دامن میں جگہ دے کر ان جذباتی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ جو کسی اور صنفِ ادب سے پورے نہیں ہوسکے۔'' [۵]

غزل کے آقاؤں ولی، میر، غالب، فیض، حسرت، فراق وغیرہ کی طرح عرشؔ کی غزلوں میں

بھی عشق کی مختلف کیفیات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ موصوف عشق کے پاک اور مقدس جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ بعض اوقات انہیں وصال نصیب ہوتا ہے لیکن اکثر ہجر پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرش وصل کے بجائے ہجر ہی کو پسند کرتے ہیں ۔محبوب کی بے التفاتی اور کج روی کا ذکران کی غزلوں میں صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔اس کے باوجود بھی عرش حوصلے اور ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں۔ اور نہ ہی محبوب کی ستم ظریفی کی شکایت اپنے لب پر لاتے ہیں، بلکہ انہیں اپنے محبوب کی زیادتیوں میں بھی لذت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ عشق میں ایک سی کیفیت زندگی کا لطف کم کر دیتی ہے۔اس میں اُتار چڑھاو لازمی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؂

وہ میری روح میں تحلیل ہو چکا ہے عرش
اگر وہ مجھ سے جدا ہے چلو جدا ہی سہی
مان لیتا ہوں بھلا دو گے مجھے دل سے مگر
تم فراموش نہ کرپاؤ گے میری یادیں
کسی صحرا میں جیسے کوئی چشمہ پھوٹ پڑتا ہے
وہ یاد آئے تو روئیں اس طرح بے اختیار آنکھیں
دل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اتر گئے ہوتے
تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح
کسی کی یاد میں آنکھوں سے جو چھلکتے ہیں
اُن آنسوؤں میں محبت کا رنگ ہوتا ہے
میں تجھ سے بچھڑ کر یوں رہتا ہوں پریشان سا
جیسے کسی کھنڈر میں اک روح بھٹکتی ہے
عرشؔ اُن جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور
ڈوبنے والے کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا
زخم دیئے جو اُن پر چلاتے ہو نشتر
کہاں ملے گا تم جیسا ہمدرد کوئی

مذکورہ بالا اشعار سے عرشؔ کی غزلوں میں عشقیہ پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔عرشؔ کا محبوب خود ان کی روح میں تحلیل ہو چکا ہے۔ وہ محبوب کے ظلم وزیادتی کو ان کی کشادہ دلی خیال کرتے ہیں۔ بعض

اوقات عرش کی آنکھیں محبوب کی جدائی میں بھیگ بھی جاتی ہیں۔لیکن انھیں پھر بھی اپنے محبوب پر اس قدر بھروسہ ہے کہ اگر انہیں بھلانا بھی چاہیں لیکن دل میں بسی ان کی یادیں نہیں بھلاسکتا ہے۔عرش صہبائی کی غزلوں میں عشق کے پاک جذبے اور اس سے منسلک مختلف واقعات کے پیش نظر ڈاکٹر علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

''عرش صہبائی احساس حُسن میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ان کی صحت مند محبت عشق مریض کو نہیں چھوتی۔ان کا عشق ایک جوان اور صحت مند عشق ہے جو ایک مسکراہٹ پر دنیا کو نثار کرسکتا ہے۔اور ایک نظر سے دنیا کا سودا کرسکتا ہے۔'' ٦ے

عرؔش کے کلام میں صرف انسانی عشق اور اس کے مادی تصورات ہی کی کارفرمائی نہیں، بلکہ عشق حقیقی اور تصوف جیسے نازک اور سنجیدہ موضوعات بھی نظر آتے ہیں۔وہ اللہ کے قادرِ مطلق ہونے اور ہر سو موجود ہونے کا گہرا احساس رکھتے ہیں۔دونوں جہاں میں جتنی بھی چیزیں نظر آتی ہیں وہ سب اللہ کے دستِ قدرت کے تابع ہیں۔اس کا اعتراف عرش نے اپنی غزلوں میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

عجیب سلسلہ ہوگا سکوت کا اُس وقت
نہیں تھا کچھ بھی زمانے میں جب خدا کے سوا

جئیں ہم اس کی خوشی تو مریں ہم اُس کی خوشی
یہ کیا کہ ہم کو کسی شے پر اختیار نہ ہو

تو کرم کی نگاہ میں رکھنا
مجھ کو اپنی پناہ میں رکھنا

عرش نے اپنے کلام کو عشق کے موضوع تک ہی محدود نہیں رکھا ہے۔وہ عصرِ حاضر کے حالات و واقعات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔عرش معاشرتی تقاضوں، عصری حسیت اور تاریخی شعور سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔دراصل شاعر جس دور میں سانس لیتا ہے اس عہد کے حادثات، سانحات اور سیاسی و سماجی حالات کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور پھر اس کا اظہار اشعار کی صورت میں کرتا ہے۔عرش کے کلام میں ایسے اشعار کی کثیر تعداد نظر آتی ہے، جن میں وہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کی عکاسی کر تے ہیں۔

بگڑی ہوئی سماج کی صورت ہے اس طرح
جیسے کسی چتا میں کوئی ادھ جلا بدن

انسان سے انسان کی قربت نہیں ممکن
جب تک یہ سیاست کا اثر ختم نہ ہوگا
اب کہاں کہیں یہ سیاست کی دین ہے
ہر کوئی بے اصول سا ہے بے ضمیر سا
کیوں چڑھاتے ہو رنگ مذہب کا
کیوں دلوں میں زہر بھرتے ہو

نئی تہذیب اوراس کے اثرات پر عرش اپنے کلام کے ذریعے طنز کے تیر برساتے نظر آتے ہیں۔آج جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں اس میں مادیت کی قدر و قیمت اخلاقی قدروں اور رشتوں سے کئی زیادہ ہے۔آج کل سائنس کا دور ہے اور جس برق رفتاری سے سائنس نئی نئی ایجادات کرتا ہے جن سے انسان بظاہر ترقی کرتا ہے مگر اخلاقی سطح پر اتنا ہی گرتا جاتا ہے۔وہ اپنے آپ کو اتنا ترقی یافتہ تصور کرتا ہے کہ اخلاقی قدریں اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔عرش ایک بااخلاق اور دیانت دار غریب آدمی کو مغرور دولت مند، امیر اور ترقی یافتہ شخص پر ترجیح دیتے ہیں۔عرش کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ آج کے اس مادیت پسند دور میں بااخلاق اور ایماندار شخص کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اوراس کی اخلاق پسندی اور ایمانداری ہی اس کی سزا کا باعث بنتی ہے۔اس کے باوجود عرش چاہتے ہیں کہ ہر انسان حقیقت پسند اور ایماندار رہو اور انھیں اپنے ضمیر کو زندہ رکھ کر زندگی گزارنی چاہیے۔چنانچہ کہتے ہیں۔

اور ہی رنگ لائی ہے نئی تہذیب عرش
ورنہ اخلاص و وفا کے پیڑ بے سایہ نہ تھے
اخلاص بنا دے گا ہمیں اپنا ہی دشمن
کیا علم تھا بے جرم سزائیں بھی ملیں گی
ہر اک شے سے برتر ہے تیرا ضمیر
اگر یہ تیرے پاسبانوں میں ہے

عورت ہمارے سماج کا جزلاینفک ہے۔اس کے تصور کے بغیر سماج ادھورا ہے۔لیکن موجودہ دور میں حوا کی بیٹی جن حالات سے دوچار ہے،اس کی طرف عرش یوں اشارہ کرتے ہیں:

ثابت نہ رہ سکی کسی مریم کی آبرو
شہر ہوس میں دھجیاں بن کر اُڑا لباس
عرش عورت عظیم ہوتی ہے

شرم وحیا کے پیکر میں
کہنے کو عورت ہے مگر قدرت کا شہکار
ایک کھلونے کی طرح بکے سر بازار
عصمتیں لٹتی ہیں اس دور میں چوراہوں پر
وہ مناظر ہیں کہ آنکھوں میں چبھن ہوتی ہے

اسی طرح عہد رفتہ کا انسان اپنی انفرادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے رشتوں اور قدروں کا کچھ لحاظ نہیں رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنے ضمیر کا سودا کرتا ہے۔ اس کڑوے سچ کی عکاسی عرش اس طرح کرتے ہیں:

صرف انسانیت نہیں اس میں
اور انسان میں کمی کیا ہے
بیچ کر دنیا میں تو اپنا ضمیر
اپنے مستقبل کو تابندہ نہ کر

عرش کی غزلوں میں عصری آگہی کے اظہارات اور نئے تصورات کے برتاؤ کے تعلق سے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''عرش کی غزل کا مرکزی موضوع حسن و عشق ہے لیکن وہ نئے عہد کے غزل گو ہیں اور نئے تصورات اندازِ فکر کا پرتو ان کی غزل میں جگہ جگہ ملتا ہے۔'' ۷

جہاں تک غزل کی فنی خصوصیات کا تعلق ہے عرش نے اس میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔ ان کا شعور پختہ ہے۔ انہوں نے سیدھی سادی زبان میں پُر تاثیر خیالات پیش کیے ہیں۔ انہیں زبان کے استعمال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ وہ معمولی اور بظاہر کم اہم بات کو بھی اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دل کو چھو جاتی ہے۔ لہجے کی نرمی اور زبان کی چاشنی ایسی خصوصیات ہیں جو عرش کے کلام کو ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔ خیال کی بلند پروازی، احساس کی شدت اور جذبات کی نازک عکاسی عرش کی غزلوں کی اہم خوبیاں ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست پر بہت توجہ دیتے ہیں بلکہ اس فن میں وہ مہارت رکھتے ہیں۔ انہی خصوصیات کی بنا پر ان کے کلام میں استادانہ شان پیدا ہوئی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

عرش جس رہ سے تھا گزر اس کا
میں نے پلکوں سے اُس کو صاف کیا

آج انسان کی پہچان بڑی مشکل ہے
آج انسان ہے اوڑھے ہوئے کتنے چہرے

میں ہوں جھونکا ہوا کا گزر جاؤں گا
بے ٹھکانہ ہوں میرا ٹھکانہ کہاں

کبھی تو میرے ساتھ رہ کر دیکھ
بڑا لطف کچّے مکانوں میں ہے

غزل کے اسرار و رموز اور اس کی فنی باریکیوں سے عرش پوری طرح واقف ہیں۔اس فن میں مسلسل مشق کی بدولت آج انہیں ایک نمایاں مقام حاصل ہوا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

''غزل میں ان کی تربیت ہوئی اور غزل پر ہی انہوں نے زیادہ توجہ صرف کی ۔اس صنف میں اب انہیں ایک خاص مقام حاصل ہو چکا ہے۔غزل کے آداب اور لوازم کی عرش کو پوری آگاہی ہے اور اظہار کے اسالیب پر بھی انہیں قدرت حاصل ہے ان کے اندازِ بیان میں حُسن بھی ہے اور فنی رچاؤ بھی۔'' 8

عرش کے کلام کا نمایاں وصف ان کا اسلوب ہے انسانی جذبات کی عکاسی کا موثر ذریعہ شاعری ہے۔شاعری الفاظ اور بیان الفاظ کے ذریعے ہی اثر انداز ہوتی ہے۔عرش کے کلام میں ہمیں یہ دونوں چیزیں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔ان کے اسلوب میں انفرادیت اور نیا پن موجود ہے۔جس کا احساس ان کو خود بھی ہے اور اعتراف بھی برملا کرتے ہیں۔چنانچہ کہتے ہیں:

میرا اندازِ سخن ہی میری پہنچان ہے عرش
اس قدر بھیڑ میں بھی ہے میری پہنچان الگ

عرش نے یوں تو سنوارا ہے اس سے سو رنگ سے
وہ غزل میں اک نئے اسلوب کا بانی بھی ہے

زبان و بیان پر قدرت اور خیالات میں ندرت ہونے کے باعث ان کے کلام میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔اصولِ فن اور زبان کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں اور فرسودہ مضامین نظم کرنے کے بجائے نئے نئے خیالات کو عمدہ الفاظ کے پیرہن میں جلوہ گر کرتے ہیں۔آسان اور سہل زبان کا استعمال عرش کا شیوہ رہا ہے۔وہ اپنے مشاہدات، تجربات، جذبات اور احساسات کو اپنے منفرد انداز میں بیان کرنے میں غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔سادہ اور عام فہم الفاظ کے استعمال سے ان کے کلام میں غنائیت پیدا ہوئی

ہے۔ میر امتیاز حسین اُن کی غزلوں کی زبان اور بیان کے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں:

''ان کی شاعری بامعنی اور فکر انگیز ہے۔ فنی اسلوب کی گرفت کے ساتھ ساتھ عرش صاحب کی شاعری کا اچھوتا پہلو یہ ہے کہ انتہائی آسان اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے جس سے اُن کی شاعری عام اور مجھ ایسے نیم خواندہ قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔ اس جانب عرش صہبائی نے اردو غزل کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کر کے اردو شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ عرش ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے روایت سے ہٹ کر اردو غزل کو نئے اسلوب دیئے'' ۹

عرش نے عموماً اپنی غزلوں میں چھوٹی بحروں کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے تشبیہات اور استعارات کا استعمال بھی موقع کی مناسبت سے کیا ہے۔ جس کی بدولت ان کے کلام میں حسن پیدا ہوا ہے ۔عرش کی غزلوں میں اصلیت بھی ہے، واقعیت بھی، سوز و گداز بھی ہے، شیرینی بھی، گھلاوٹ بھی ہے اور سادگی بھی ۔انہوں نے اردو غزل کو ایک منفرد انداز اور آہنگ عطا کیا ہے جس کی بدولت وہ نہ صرف ریاست بلکہ برصغیر میں اعلیٰ مقام کے متحمل ہیں۔ بقول کوشل کرن ٹھاکر:

''عرش کے کلام کا خاص جوہر سادگی اور دل کشی ہے ان کے ہاں نہ ہی دقیق مضامین ملتے ہیں اور نہ ہی بھاری بھرکم الفاظ، مشکل الفاظ و تراکیب سے اکثر پرہیز کرتے ہیں۔ وہ عام طور پر شعر چھوٹی بحروں ہی میں کہتے ہیں لیکن جب طویل بحروں کا استعمال کرتے ہیں تو بھی توازن برقرار رہتا ہے۔'' ۱۰

عرش نے اپنی زندگی میں مفلسی اور تنگ دستی کا طویل دور دیکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ان میں حساسیت پیدا ہوئی ہے۔ وہ ایک دردمند دل کے مالک ہیں۔ وہ غریبوں اور ناداروں کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ معاشرے کے نچلے طبقے کے افراد کے لئے عرش کے دل میں بہت ہمدردی ہے۔ وہ ان کا دکھ درد اپنے کلام کے توسط سے بانٹتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں غریبوں اور مفلسوں کی دل دوز تصویریں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

چھونپڑں کا بھی احترام کرو
جھونپڑوں میں بھی لوگ رہتے ہیں

مفلسی آدمی کے ہونٹوں سے
مسکراہٹ بھی چھین لیتی ہے

نظر اداس تھی دل میں کوئی اُمید نہ تھی
کہ جشن عید میں کبھی مفلسوں کی عید نہ تھی

ریاست میں اردو غزل کو فروغ دینے اور اسے نئی بلندیوں سے ہمکنار کرنے میں عرش نے اہم رول ادا کیا ہے۔ عرش نے دیگر شعراء کے مقابلے میں صنف غزل پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ جس کی بنا پر انہوں نے غزل کو ایک مخصوص آہنگ اور منفرد لہجہ عطا کیا ہے۔ انہیں خصوصیات کی بنا پر عرش نہ صرف ریاست جموں وکشمیر بلکہ ملک اور بیرون ملک میں بھی اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے جناب خورشید کاظمی صاحب لکھتے ہیں:

''عرش صہبائی کا آج اردو شاعری میں ایک مقام ہے۔ وہ اپنی ریاست کی حدیں پھلانگ کر ملک کی حدود کو بھی پار کر کے برصغیر کی حد سے بھی آگے غیر ممالک میں بھی اپنی شاعری کے حوالے سے ایک معتبر حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے یہ مقام ایک منفرد شاعر کی حیثیت کے طور پر حاصل کیا ہے۔'' [11]

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عرش صہبائی اردو غزل کی پچھلے سٹھ پینسٹھ برسوں سے بے لوث خدمت کرتے آئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ریاست میں اردو غزل کے علمبرداروں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، جن کی بدولت غزل کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ عرش نے ریاست کی نئی نسل کے کئی شعراء کی تربیت کی ہے اور ان کے مذاق سخن کو سنوارا بھی۔ یہ امر ریاست میں اردو شاعری کے مستقبل کے لئے بہت ہی خوش آئند ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ عرش اسی طرح اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں گے اور صنف غزل کے گیسو سنوارتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆☆

ودیا رتن عاصی

ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کے حوالے سے جو شعراء ۱۹۴۷ء کے بعد شعری منظر نامے پر اُبھرے ہیں ان میں پنڈت ودیا رتن عاصیؔ ایک معتبر نام ہے۔ صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے غزل گو شعراء میں عاصی دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے غزل کے سانچے میں اپنی ذات کو سمیٹنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ عاصیؔ کی شاعری میں آپ بیتی جگ بیتی نظر آتی ہے۔ عاصی ادھمپور کے ایک پنڈت گھرانے میں ۱۱ جولائی ۱۹۳۸ء کو جوگان سل تھیاں جموں میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان آپ کی پیدائش کے بعد ادھمپور سے جموں منتقل ہو گیا تھا۔ پنڈت ودیا رتن نام اور عاصیؔ تخلص ہے۔ والد کا نام پنڈت شنکر

داس اور والدہ ماجدہ کا نام تارا دیوی تھا۔ شفقت مادر سے بچپن میں ہی محروم ہو گئے ہیں۔ تعلیم کا آغاز جموں کے رنبیر ہائی اسکول سے کیا۔ یہاں سے عاصیؔ نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ گھر میں معاشی بدحالی کی وجہ سے عاصیؔ اپنے تعلیمی سفر کو چاہ کر بھی جاری نہ رکھ سکے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ ذاتی طور پر مختلف نوع کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے اور اپنے علمی ذوق کو پورا کرتے رہے۔ اردو زبان سے عاصیؔ کو والہانہ شغف ہے۔ اگر چہ ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ سنسکرت اور ہندی پڑھے مگر عاصیؔ کا دل ان کی بہ نسبت اردو کی جانب زیادہ راغب تھا۔ اور اس لئے وہ والد سے چھپ چھپ کے اردو کی کتابیں پڑھتے تھے۔

عاصیؔ کے کلام پر بات کرنے سے قبل عاصیؔ کی زندگی کے مختلف مراحل اور متنوع واقعات کا جاننا از حد ضروری ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری ان کی زندگی کی ترجمان ہے۔ وہ زندگی میں کن حالات سے گزرے ہیں اس کی ہو بہو عکاسی انہوں نے اپنے کلام میں کی ہے۔ گویا انہوں نے اپنی زندگی کی کہانی اپنی شاعری کی زبانی بیان کی ہے۔ عاصیؔ اور ان کے والد صاحب دو بہنوں کی شادی کے بعد کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ والدہ چونکہ بچپن میں ہی اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ لہٰذا گھریلو کام کبھی عاصیؔ تو کبھی ان کے والد صاحب انجام دیتے تھے اور اس طرح ان دونوں کے شب و روز گزرتے تھے۔ عاصیؔ جموں کی ایک سرسوں کے تیل کی فرم میں کلرک کی حیثیت سے قلیل تنخواہ پر کام کرتے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں عاصی کے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں عاصی بالکل اکیلے ہو گئے۔ عاصی کی تنہائی اور اکیلے پن کو دیکھ کر ان کے رشتہ داروں نے ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی ایک برہمن لڑکی سے کروادی۔ جس کا مزاج عاصی جیسے حساس طبیعت والے شخص سے بالکل بھی نہیں مل سکا۔ جس کی وجہ سے شادی بہت جلد ناکام ہوئی۔ اس طرح عاصی ایک بار پھر تنہا ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی دوسری شادی کرنے کا خیال بھی نہیں کیا اور یوں اکیلے زندگی کے سفر کو طے کرتے رہے۔ کھانا، پینا اور باقی دوسرے کام عاصی خود کرتے ہیں۔ خوشی، غم، راحت، انبساط، آنسو، ہنسی وغیرہ ہر حالت اور ہر کیفیت عاصی تن تنہا گزارتے ہیں۔ کوئی ہمدرد نہیں، کوئی ساتھی نہیں، کوئی غمگسار نہیں، صرف عاصی اور ان کی تنہائی۔ اس تنہائی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے دو چیزوں شراب اور شاعری کا سہارا لیا ہے۔ جو آخری وقت تک ان کا برابر ساتھ دیتے رہے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

معلوم آج تک نہ ہمیں ہوسکا یہ راز
ہم کو شراب پی گئی یا ہم شراب کو

عاصی کی طبیعت بچپن سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ انہوں نے اسکول کی تعلیم کے

دوران ہی شعر موزوں کرنے شروع کیے تھے۔ چودہ برس کی عمر میں انہوں نے پہلی غزل کہی ہے۔اس کے بعد مشق سخن جاری رکھا ہے۔شاعری میں عاصی نے ابتدأ عرش صہبائی سے اصلاح لینا شروع کی۔جس کا اعتراف انہوں نے محمد آصف ملک کے پوچھے گئے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کچھ اس طرح کہا ہے:

"استاد محترم عرش صاحب سے ۱۹۵۷ء میں اصلاح لینا شروع کی اور ان کی پہلی اصلاح شدہ غزل ۱۹۵۸ء میں "پرتاپ" اخبار دہلی نے چھاپی۔" ۱۲

مذکورہ غزل عاصی کے شعری مجموعے میں بھی شامل ہے۔جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہمیں نفرت ہے ایسی زندگی سے
تعلق ہی نہ ہو جس کو خوشی سے

عاصی نے بہت جلد غزل کی باریکیوں تک رسائی حاصل کی اور اس طرح ان کو خود پر اعتماد ہوگیا۔اس کے بعد انہوں نے عرش سے مشورہ لینا چھوڑ دیا۔جموں یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر شام لال کالرا جو عرف عام میں عابد پشاوری کے نام سے مشہور ہیں،درس وتدریس کے ساتھ ساتھ شعروادب میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔عاصی کے ساتھ ان کے اچھے مراسم تھے اور بعض اوقات عاصی ان سے بھی مشورہ سخن کیا کرتے تھے،ان کی صحبت کی بدولت عاصی کی شاعری میں نکھار آتا گیا۔

عاصی کا شعری سرمایہ ایک مجموعہ "دشت طلب" جو کہ ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آیا ہے۔یہ کلام ان کے گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں کا انتخاب ہے۔دراصل اس سے قبل بھی انہوں نے اپنا کلام شائع کرانے کی کوشش کی تھی مگر کچھ مالی پریشانیوں کی وجہ سے ناکام رہے۔مذکورہ مجموعے کو شائع کرنے میں ان کے دوست خالد حسین کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔اس کے علاوہ ان کا کلام ملک اور ریاست کے موقر رسائل اور جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔عاصی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔انہوں نے کچھ نظمیں اور قطعات بھی لکھے ہیں لیکن غزل ہی ان کی محبوب صنف سخن رہی ہے۔ودیا رتن عاصی کی غزلیں موضوع اور فن کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں۔عاصی شاعری میں کلاسیکل روایات کے پاسدار نظر آتے ہیں۔اس کا اثر ان کی شاعری میں صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ عاصی صرف روایت میں ہی اُلجھ کررہ گئے ہیں بلکہ ان کے یہاں جدید اور عصری موضوعات بھی درآئے ہیں۔

غزل کا اہم اور کلیدی موضوع عشق اور اس کے مختلف معاملات ہیں۔عشق ایک ایسا موضوع ہے جس کو عہد قدیم سے عہد جدید تک کے بیش تر شاعروں نے اپنے محسوسات کے مطابق شاعری میں پیش کیا ہے، کیونکہ عشقیہ جذبات ہر کس وناکس کے اندر موجزن ہوتے ہیں۔اردو غزل میں عشق کے موضوعات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی تصنیف "غزل اور مطالعہ غزل" میں

لکھتے ہیں:

''صنف غزل کا بنیادی موضوع معاملات عشق کی مختلف کیفیات کی ترجمانی ہے۔ خود غزل یا تغزل کے لغوی معنیٰ بالعموم عورتوں سے یا عورتوں کے متعلق باتیں کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اور یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے لیکن غزل کی یہ تشریح مکمل اور ہمہ گیر نہیں ہے۔ اس میں بہت کچھ اضافے کی ضرورت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسانی زندگی میں عشق و محبت کے جذبات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت بنیادی ہے۔ ان جذبات کے محرکات میں صنف لطیف کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے غزل کو عام طور پر عشق و محبت اور اسکے نتیجے میں پیدا ہونے والی مختلف ذہنی کیفیات اور جذباتی واردات کا ترجمان اور عکاس سمجھ لیا گیا ہے۔ اور بعضوں کا جی تو صرف اسی وجہ سے لبھاتی ہے۔ لیکن اس موضوع کی ترجمانی غزل ہی پر کیا منحصر ہے، دنیا کے اکثر ملکوں اور قوموں کی شاعری کا بیشتر حصّہ انہیں موضوعات کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔ اور سبب اس کا صرف یہ ہے کہ خود انسانی زندگی میں عشق و محبت کی ساری واردات و کیفیات اور تمام اسرار و رموز کو اس نے اس طرح اپنے دامن میں سمویا ہے کہ اس کا یہ کرشمہ قدم قدم پر دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔''[۱۳]

جہاں تک عاصی کی غزلوں میں موضوعات کا تعلق ہے انہوں نے بھی عشق کو ہی زیادہ اہمیت دی ہے اور معاملات عشق کی مختلف کیفیات کو غزل کا لباس پہنا دیا ہے۔ کیونکہ عاصی نے بھی عشق کیا ہے۔ عاصی کا محبوب ہمارے معاشرے کا ایک فرد ہے۔ ان کا عشق اگر چہ پاک اور سچا ہے، لیکن وہ محبت کی بازی میں ناکام ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عاصی کے کلام میں متعدد عشقیہ اشعار نظر آتے ہیں۔ انہوں نے تغزل کے مختلف پہلوؤں کو بڑی ندرت اور جدت کے ساتھ شعری پیکر عطا کئے ہیں۔ حسن و عشق اور پیار و محبت کی مختلف کیفیات کو عاصی پر لطف انداز میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

محبت پہ تیرا احسان ہوگا
محبت میں جی سے گزر جانے والے

ہم پر نگاہ لطف کبھی ہے کبھی نہیں
تم ہی کہو یہ کیا ہے اگر دل لگی نہیں

اس گفتگو کی طرز پہ ترقیم کیجئے
کب تک میں خاموشی سے سنوں آپکی نہیں
بھری محفل میں اظہارِ محبت
یہ لغزش اور پھر میری نظر سے
مرتا تیرا خیال بھی ہوتا اگر جدا
مجھ سے تیرا خیال مگر کب جدا ہوا

عشق میں محبوب کی یاد عاشق کو جینے کا سہارا عطا کرتی ہے۔ جب عاشق معشوق کو یاد کرتا ہے تو اس کا دل کیا چاہتا ہے اور وہ کن کیفیات سے گزر جاتا ہے، ان کو عاصی کے اشعار میں یوں محسوس کیا جاسکتا ہے:

یہ کن بیتے دنوں کی یاد آئی
یہ کیسے اشک ٹپکے چشم تر سے
شب غم اس طرح بھی کٹ گئی ہے بارہا اپنی
کسی کی یاد پہروں گفتگو کرتی رہی ہم سے
مدت سے کریدے بھی نہیں یاد کسی کی
پھر زخم مرے سینے کے بھر کیوں نہیں جاتے

مذکورہ اشعار سے عاصی کے دل میں محبوب کی شدتِ محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ عاصی اپنے محبوب کی یاد میں بعض اوقات آنسوں بھی بہاتے ہیں اور کبھی کبھی ماضی کی محبت کی یاد سے ان کے پرانے زخم تازہ ہوجاتے ہیں۔

عاصی نے محبت میں تقدیر کے ہاتھوں شکست ہی کھائی ہے، یہی معاملہ ان کے محبوب کا بھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے تڑپتے اور ترستے رہے لیکن کبھی ایک نہیں ہو پائے۔ عاصی نے محبوب کو دیوانگی کی حد تک چاہا ہے مگر حقیقی وصال کی لذتوں سے محروم رہے۔ البتہ دونوں اپنی اپنی جگہ وفا پر قائم رہے۔ نہ عاصی کے دل میں کوئی سما سکا اور نہ ہی ان کے محبوب نے کسی اور طرف نظر اُٹھائی بلکہ ساری زندگی گوشہ نشینی میں عاصی کے نام وقف کردی اور یوں دونوں زندگی کی خواہشات کی تکمیل سے محروم رہے۔ عاصی اپنی اور اپنے محبوب کی یکسانیت اور دل ودماغ کی ہم آہنگی کو کچھ اس طرح شعری صورت میں جلوہ گر کرتے ہیں:

عشق میں دونوں ہوگئے برباد

پہلے یہ حادثہ سُنا نہ ہوا
تری باتوں سے گماں ہوتا ہے
تو بھی مجھ سا دُکھی ہو جیسے
تجھ سے کیا فریاد کریں
تو تو خود فریادی ہے

اسی طرح عشق ومحبت کا ایک نازک پہلو محبوب کی کج ادائی اور بے رُخی ہے۔ جب عاصی کا محبوب ان کی جانب سے بے توجہی اور غفلت برتتا ہے۔ اس وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس کا اظہار اپنے بعض اشعار میں یوں کرتے ہیں۔ ؎

اس کی بلا سے کو جیے یا کوئی مرے
جس کو کسی کے درد کا احساس ہی نہیں
آخر ہم ان کے وعدوں پر ایمان لائیں کیا
جو ہم پر مہربان ابھی ہیں ابھی نہیں
مریض عشق سے اے چارہ گر یہ بے رخی کیسی؟
کسی بے بس کا دل رکھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا
وفاؤں کے عوض توڑے جفائیں
کہوں تو کیا کہوں بے داد گر سے

چین، سکون، راحت وانبساط، عیش وعشرت ایسی چیزیں ہیں جن کی خواہش دنیا کا ہر انسان کرتا ہے۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی یہ ساری آرزوئیں دنیا میں پوری ہوجاتی ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے، جو ان سب خواہشات کی آرزو ہی دل میں لئے اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ عاصی بھی ایسے ہی لوگوں کی طرح ہیں۔ جن کے یہ صرف خواب بن کر رہ گئے۔ عاصی کی زندگی صرف مصائب وآلائم سے عبارت ہے۔ ان کی زندگی ایک المیہ ہے۔ وہ دنیا میں آئے تو مصائب نے ان کا دامن تھام لیا۔ زندگی کے ہر موڑ پر مصائب رخ بدل بدل کر عاصی کے سامنے آتے رہے۔ وہ ہمیشہ خوشی کی آرزو میں تل تل مرتے رہے۔ وقت نے ہمیشہ ان کو درد وغم ہی سے دوچار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عاصی کی شاعری میں درد وغم ایک خاص موضوع کی صورت میں اُجاگر ہوا ہے۔ اور اس موضوع کو انہوں نے گہرے جذبات اور محسوسات کے ساتھ غزلوں میں سمیٹا ہے۔ کلام عاصی میں سے چند اشعار اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں ؎

کہے تو کسے کہے اس محفل دنیا میں
تکلیف تو ملتی ہے آرام نہیں ملتا
غم دنیا، کسی کی یاد، حسرت موت کی یارو!
انہیں وو چار پر اب مدارِ زندگی یارو!
پل ہی میں گزر جاتی ہیں سُکھ چین کی راتیں
دکھ درد کے دن پل میں گزر کیوں نہیں جاتے
بوجھ اس دل کا کسی روز تو ہلکا ہوگا
کھل کے برسیں گی کسی روز تو آنکھیں اپنی
بے ترے جو کچھ گزرتی ہے مرے دل پر نہ پوچھ
زندگی کو موت کے نزدیک تڑپاتا ہوں میں
زندگی خیر ہمیں تو راس نہیں
موت بھی بھول چلی ہو جیسے

کلام عاصی میں ناکامی ونامرادی، زندگی سے فرار، رنج وغم اور حسرت ویاس جیسے مضامین کوملحوظ نظر رکھتے ہوئے پروفیسر شہاب عنایت ملک اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''عاصی کی غزلیں عامیانہ تخیل وتصور کے بجائے ذاتی تجربات ومشاہدات کی زائیدہ ہیں۔۔۔عاصی عام آدمیوں کی بھیڑ میں شامل ایک ایسا ''خاص'' انسان اور شاعر ہے جس نے اپنے دل وجان کے نہ جانے کتنے درد وغم جمع کر کے پوری فنکارانہ مہارت کے ساتھ اشعار کے سانچوں میں ڈھالا ہے۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عاصی کے اشعار میں جہاں ایک طرف سچے اور کھرے تجربات ومشاہدات کی حرارت ہے وہیں عشق اور ازدواجی زندگی سے متعلق روح کی گہرائیوں تک اُتر جانے والے جذبات کی لطافت بھی ہے۔''[۱۴]

تصوف اردو غزل کی روایت میں ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔تصوف کی بدولت اردو غزل میں نئی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔تصوف میں ظاہری اعمال کے مقابلے میں باطنی کیفیات پر زور دیا جاتا ہے۔ایک اچھا انسان بننے کے لئے ظاہری رسومات کی پابندی کافی نہیں بلکہ صفائی دل اور خلوص نیت

اصل ایمان ہے۔ جب تک انسان کے ظاہر و باطن ایک نہیں ہو جاتے وہ عشق کی اصل منزل تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ انہی تصورات کے توسط سے آپسی برادری، رواداری، دوسرے مذاہب کا احترام اور اخلاقیات کی تعلیم غزل کے موضوعات میں شامل ہو گئے ہیں۔ اردو غزل میں تصوف اور اس کے متعلقات کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز الحق یوں رقمطراز ہیں:

''تصوف نے ہر طرح کی جکڑ بندیوں کے خلاف آواز اُٹھائی صوفی وسیع المشربی کے علمبردار تھے۔ انہوں نے ظاہر داری روزہ نماز سے زیادہ اہمیت صفائی قلب اور خلوص نیت کو دی۔ ریا کاری، نمائش، حسد، نفرت وغیرہ کی صوفیا کرام کے یہاں کوئی گنجائش نہیں، انہیں اسباب سے ان کا حلقہ اثر کافی وسیع ہو گیا۔ غزل اسی وسیع المشربی اور رواداری کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو کہ غزل کی بے پناہ مقبولیت کا ایک بڑا راز بھی ہے۔'' ۱۵

عاصی نے بھی اپنی متعدد غزلوں میں تصوف کے موضوع پر اشعار کہے ہیں۔ وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان ہیں۔ وہ ذات پات اور مذہبی تعصب کے سخت خلاف ہیں۔ موصوف تقدیر پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں اور اللہ کو خالق کائنات تسلیم کرتے ہیں۔ جن کو اگرچہ کسی نے نہیں دیکھا ہے لیکن وہ ہر سو موجود ہیں۔ تصوف کے موضوع سے متعلق عاصی کی غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہی چھایا ہوا ہے زندگی پر
وہ جس کو آج تک دیکھا نہیں ہے

تیرا رتبہ عرش سے اونچا
تجھ کو مجھ سے نسبت ہی کیا ؟

جسم ایسا مکاں ہے جس میں
رہنے والا نظر نہیں آتا

اخلاقیات کے متنوع پہلوؤں کو بھی عاصی نے اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے۔ وہ انسانی اقدار اور عظمت کے پرستار ہیں اور چاہتے ہیں کہ آدمی آدمی کی قدر کرے ایک دوسرے کے لئے رہبر و رہنما بن کر زندگی گزارے، نہ کہ رہزن و دشمن۔ انسان اور انسانیت کی تعلیم عاصی اپنے اشعار میں دیتے ہیں۔ جن میں شعریت کا حسن بھی ہے اور انسانی اقدار کا شعور بھی۔ اشعار دیکھئے۔

ہر بشر کے واسطے ہے لازمی
کام لے شیرینیِ گفتار سے

بھلا چاہیے گا کوئی کیا کسی کا
ہو دشمن آدمی جب آدمی کا
کیا بُرا جو کسی کے کام آئے
جان اک دن تو یوں بھی جانی ہے

انسانی اقدار کا آجکل ہرطرف فقدان نظر آتا ہے۔لوٹ کھسوٹ،حق تلفی،ظلم وبربریت،تعصب،بغض،نفرت، بے راہ روی، مادہ پرستی اور جنس پرستی وغیرہ آج کل کے معاشرے کا معمول بن گیا ہے۔جس کی طرف عاصی اپنے اشعار سے ہماری توجہ یوں مبذول کرار ہے ہیں۔

الٰہی کیا زمانہ آگیا ہے
ہے نفرت آدمی کو آدمی سے
پتھر کو گوہر کہہ کہہ کر
بدتر کو بہتر کہہ کہہ کر
ہم نے ماحول بگاڑا ہے
رہزن کو رہبر کہہ کہہ کر

خمریات اردو غزل کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔ساغر ومینا کے قصّے اردو کے قدیم غزل گو شعراء سے لیکر جدید شعراء تک کم وبیش ہر ایک نے سنائے ہیں۔خواہ کسی نے ایک آدھ شعر ہی کیوں نہ کہا ہو اور بعضوں نے تو اس میں نام پیدا کیا اور یہ ان کی پہنچان بن گئی۔ان میں سرفہرست ریاض خیرآبادی صاحب ہیں۔غالب،آتش،ریاض،اصغر،شاد وغیرہ ایسے شعراء ہیں،جنہوں نے ساغر ومینا کے خوب نغمے گائے ہیں۔ان حضرات کا ایک ایک شعر یہاں نقل کرتا ہوں:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر ومینا مرے آگے (غالبؔ)

کام ہے شیشے سے ہم کو اور ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شراب روح پرور سے غرض (آتشؔ)

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر ہو جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے (اصغرؔ)

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے (شادؔ)

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش
سن کر جو پی گئے مزہ مفلسی کا تھا (ریاضؔ)

عاصی نے بھی اس روایت کی پاسداری کرتے ہوئے مے و مینا اور میخانے کی خوب سیر کی ہے۔ عاصی نے جیسا کہ پہلے بھی رقم کر چکا ہوں کہ اپنی زندگی صرف دو چیزوں کے سہارے گزاری ہے اور وہ ہیں شاعری اور شراب۔ وہ شدت سے مے نوشی کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں بھی اس کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ساغر و مینا کے متعلق مختلف موضوعات ان کی شاعری میں در آئے ہیں۔ جن میں ندرت کے ساتھ شوخی اور ظرافت بھی صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؂

مٹ نہ پائیں زندگی کی تلخیاں
بادہ نوشی ہم نے گو ہر شام کی
اُن کی چشم مست ہی اب کارگر ہو تو ہو
جام و مینا سے تو بہلا کر طبیعت دیکھ لی
بے پیے مے حرام ہے
رند پی کر حلال کرتے ہیں
آج دھو میں مچا لیں سرِ میکدہ
کون جانے کہاں ہونگے کل دوستو!

عاصی کی غزلوں میں ساغر و مینا، ساقی و میکش اور رندی و مستی وغیرہ جیسے موضوعات کے پیش نظر محمد آصف ملک اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''کوچہ غزل کا شاید ہی کوئی ایسا فن کار ہوگا جس نے سُرخی مے سے مانگ غزل کو سجایا نہ ہو۔ جس شاعر نے کبھی مے و ساغر دیکھا نہ ہوگا اس نے بھی اس موضوع کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ لیکن عاصی نے بادہ خواری کی فضا میں زندگی کی سانسیں بھری ہیں وہ کیونکر خمریاتی موضوع سے پہلو تہی کرتے۔ بلکہ انہوں نے تو اس موضوع کو بڑی ندرت و طرفگی کے ساتھ جامہ الفاظ میں جلوہ گر کیا ہے۔ جن سے بڑی شوخی و ظرافت چھلکتی ہے۔'' [16]

عاصی کے کلام میں کلاسیکی غزل کے پہلو بہ پہلو جدید غزل کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ وہ جس دور سے گزر رہے ہیں۔ اس میں انسان انتہائی پستی اور زوال کا شکار نظر آرہا ہے۔ بظاہر انسان ترقی

کے عروج پر ہے لیکن انفرادی طو پر انسان کتنا تنہا ہو گیا ہے۔اس کا احساس عاصی کی غزلوں میں بڑی شدت سے ہوتا ہے۔انسانی رشتوں کی پامالی آج کے فرد کا معمول بن گیا ہے۔کوئی کسی کا غم خوار نہیں سب اپنے اپنے معاملات میں مشغول ہیں۔مکاری ،فریب ،دھوکہ ،وعدہ خلافی آج کل کی زندگی کا معمول بن گیا ہے۔آج کے دور میں کسی پر اعتماد کرنا بہت مشکل ہے۔کون دوست ہے اور کون دشمن اس کا فرق کرنا آسان نہیں ہے۔دور رفتہ کے آدمی کے ہر کات وسکنات کو دیکھ کر ایک ذی شعور انسان کو انسانیت ،دوستی ،رشتہ داری ،ایمانداری اور دیانتداری پر بھروسہ ہی اُٹھ گیا ہے۔ودیا رتن عاصی جو اسی سماج اور معاشرے میں سانس لے رہے ہیں کیسے ان معاملات سے چشم پوشی کر سکتے ہیں۔بلکہ رشتہ داروں کی لاتعلقی ،ناانصافی اور بے توجہی کے دُکھ عاصی نے خود بھی جھیلے ہیں۔جن کی روداد کبھی کبھی وہ اپنی غزلوں میں بھی سناتے ہیں ۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عبث اُمید اے عاصؔی کسی سے غم گساری کی
کسی کو کیا غرض جو ہو شریک آکر تیرے غم میں

اپنوں کی عنایات کا ہم ذکر کریں کیا
اپنوں کی عنایات نے دل توڑ دیا ہے

وہی دشمن ہوئے ہیں آج عاصی
جو دم بھرتے تھے کل تک دوستی کا

نظریں بچا کر چلتے ہیں بیگانہ وار لوگ
ایک پل میں بھول جاتے ہیں برسوں کا پیار لوگ

ہم سفر ہونگے تو بچھڑیں گے ضرور
اس لئے اک اک سفر تنہا کرو

سیاسی اور سماجی حالات اگر چہ خارجی چیزیں ہیں لیکن عاصؔی نے ان معاملات کو داخلی سطح پر محسوس کر کے سماج کے ایک ذی شعور فرد کی حیثیت سے ان کی عکاسی بھی اپنی غزلوں میں کی ہے۔سیاسی اور سماجی شخصیات کے ہاتھوں عام لوگوں کے استحصال کو عاصؔی نے موضوع بنایا ہے جس سے ان کے سیاسی اور سماجی شعور کی پختگی اور ذہن کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ہر شاعر اپنے دور کے سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنے تجربات اور مشاہدات کے مطابق شاعری میں پیش کرتا ہے۔عاصی نے بھی ان مسائل اور معاملات کو اپنے ذاتی تجربات اور محسوسات کے پیش نظر اشعار میں منعکس کیا ہے۔ان موضوعات کو پیش کرنے کے لئے عاصؔی اپنا نرم ونازک اور سادہ وسہل لب ولہجہ ہی بروئے کار لاتے ہیں۔اشعار دیکھئے:

امیر شہر کو اس سے غرض کیا
فقیر شہر کب سے در بدر ہے
اہل دنیا نے عاصیؔ بہت کچھ دیا
ایک جنس خلوص و وفا چھوڑ کر
بہت مشّاق ہوگا رہزنی میں
کسے تھی یہ توقع رہبر سے
یہی فضا ہے اس دور کی سیاست کا
سحر کو وعدہ کرو شام کومکرتے رہو
کبھی رہزن کبھی رہبر کا روپ بھرتے رہو
تمہارا وقت ہے جو جی میں آئے کرتے رہو

عاصیؔ اور میر تقی میرؔ کے حالات زندگی میں بڑی حد تک یکسانیت نظر آتی ہے۔میرؔ کی زندگی بھی ابتدائی عمر سے ہی مصائب و آلام سے بھری پڑی نظر آتی ہے اور عاصیؔ کی زندگی میں بھی کم وبیش ایسے ہی حالات رہے ہیں۔دونوں نفسیاتی الجھن، کرب ذات، اعصابی تناؤ،تنہائی،قنوطیت اور خستگی کی لہروں میں بہتے رہے۔یہی قنوطیت،تنہائی اور بے چارگی دونوں کے مزاج میں مشترک ہے۔اگر چہ دونوں الگ الگ دور کے شعراء ہیں لیکن مزاج کی ہم آہنگی کی بدولت دونوں کے کلام میں بھی ایک قسم کی ہم آہنگی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔دونوں غم والم، مصائب وآلام،حزن وملال،تنہائی وخستگی میں مبتلا رہے۔اور اپنی محسوسات کے مطابق ان حالات وکیفیات کوانہوں نے شعری لباس عطا کیے ہیں۔یہاں دونوں شعراء کے چند ایسے اشعار نقل کرتا ہوں جن سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ دونوں کے مزاج میں کتنی مماثلت تھی:

میرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں نے ناکامیوں سے کام لیا
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت ہی غم رہا
یاں کے سفید وسیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا،یا دن کو جوں توں شام کیا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
اک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

اب عاصیؔ کے چند اشعار دیکھئے:

ترک کردوں میں مرنے کا خیال
زندہ رہنے کی مگر صورت تو ہو

زندگی خیر ہمیں راس نہیں
موت بھی بھول چکی ہو جیسے

رہ رہ کے کھٹکتا ہو جو سانس میں پیہم
سینے میں کوئی خار ہے یا قلب حزیں ہے

ابھی کوئی ستم ٹوٹا ابھی کوئی بلا ٹوٹی
رہا جب تک میں زندہ بس یہی خدشہ رہا دل میں

عاصی تمام عمر رہیں آہ وزاریاں
دیکھی نہ تیرے ہونٹوں پر ہم نے ہنسی کبھی

غزل کا فن جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی۔ اس لئے پروفیسر آل احمد سرور نے بجا طور پر اس کو کافر صنف کہا ہے۔ اس کے فنی لوازمات تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مسلسل مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ غزل چونکہ داخلی صنف سخن ہے لہٰذا اس کو بیانیہ کے بجائے اشارتی اور علامتی انداز ہی زیب دیتا ہے۔ شاعر کو چونکہ دو مصرعوں میں ہی اپنی بات مکمل کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ جملہ شعری محاسن استعارات، تشبیہات، تراکیب، پیکر اور علامات وغیرہ کا بھرپور استعمال کرتا ہے، جن کی بدولت مختصر لفظوں میں مفصل بات بیان ہو جاتی ہے۔ یہ غزل کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس چیز کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا غزل کو ایک شرمیلی صنف قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"غزل بنیادی طور پر ایک شرمیلی صنف سخن ہے۔ اس لئے اس نے اپنے اظہار کے لئے عام طور سے تشبیہات اور استعارات ایسے استعمال کیے ہیں جن میں اس کا شرمیلا پن سما سکے۔" ۱۷

عاصیؔ نے بھی اپنے جذبات کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ان تمام شعری وسائل کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ عاصیؔ کے کلام میں تشبیہ، استعارہ، علامت، پیکر، تراکیب اور دیگر صنائع وبدائع کا خوبصورت نظام دیکھنے کو ملتا ہے۔ جن کے استعمال سے کلام عاصیؔ میں معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کی خصوصیات سما گئیں ہیں۔ جو کہ صنف غزل میں ان کی فنکارانہ مہارت کا بھی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں کہ برباد تھا برباد ہی ہوں
گردشِ وقت رکی ہو جیسے — تشبیہ

ہم نہ ہوں گے تو ہم بدلیوں کی طرح
آسمانوں سے ہو کر گزر جائیں گے — تشبیہ

بزم میں آفتاب دیکھئے ہوئے
ہنس کر کبھی ہم سے وہ گلفام نہیں ملتا — استعارہ

بحرِ غم میں آج پھر اک حشر برپا ہو گیا
کشتیِ دل آج پھر طوفان سے ٹکرا گئی — استعارہ

میں موسیٰ نہیں ہوں مگر پھر بھی عاصی
تجھے اک نظر دیکھنا چاہتا ہوں — تلمیع

کون سی ہے وہ مصیبت مجھ پہ جو ٹوٹی نہیں
رات دن گردش میں ہیں
ہفت آسمان میرے لئے — حسن تعلیل

موت اور زندگی میں ہے یہ فرق
اک حقیقت ہے اک کہانی ہے — تضاد

آج پھر یاد آ گئے بیتے دن
آج پھر آنکھوں سے دریا بہہ گیا — مبالغہ

عاصیؔ اپنی غزلوں میں چھوٹی بڑی دونوں طرح کی بحور کو کر برتنے میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ردیف اور قافیے کا انتخاب بھی بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ بیشتر غزلیں مردف اور چند غیر مردف ہیں۔ غرض غزل کے فنی اور ہیئتی لوازمات پر عاصیؔ ماہرانہ قدرت رکھتے ہیں۔ صنف غزل میں اپنی قادرانہ شان کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم مزاج غزل سے ہیں خوب آشنا
ہم سے قائم ہے حسنِ غزل دوستو
عاصی سچ مچ تیری طرح
غزل بھی سیدھی سادی ہے

پروفیسر شہاب عنایت ملک پنڈت ودیا رتن عاصیؔ کی غزل میں فن، موضوع، فکر اور تخیل کو ملحوظ

نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ودیا رتن عاصیؔ کے شاعرانہ امتیازات کئی ہیں۔ اول یہ کہ اردو شاعری کی روایت ورسومات اور خصوصاً غزل کی شعریات کی بھر پور آگہی رکھتے ہیں۔ دوئم یہ کہ عاصی شعر میں جذبہ واحساس اور فکر وخیال کی لسانی تشکیل کے ضمن میں اُستادانہ مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے تصورات انسان اور انسانیت کی شریف، حقیقت پسندانہ اور تعمیری قدروں کو مس کرتے ہیں۔ اسی لئے عاصیؔ کی شاعری آگہی وبصیرت سے بھر پور شاعری ہوتے ہوئے بھی فنی و جمالیاتی محاسن کی رنگینیاں بکھیرتی ہے۔ اور ان بحور، ردیف و قوافی ،استعارات وتراکیب کے برتاو کے باب میں ان کی انفرادیت صاف نظر آتی ہے۔'' ۱۸

عاصیؔ کی شاعری انسان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کی شاعری ہے۔ اپنے جذبات کو شعری جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے عام فہم اور آسان الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ اندازِ بیان سادہ اور دلکش ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی ،عربی اور ہندی زبانوں کے الفاظ بھی عاصی کی غزلوں میں در آئے ہیں۔ جن کی بدولت ان کی غزلوں میں نغمگی پیدا ہوگئی ہے۔ گھر، تقدیر، آسمان، طوفان، زندگی، خودکشی، ذات، کشتی دل ہفت آسمان، تنہا آشیاں، زیست، پوجا، اہنسا، یاد، صبر، ستم، تباہی، آرزو، خواب، خاموشی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو کلام عاصی میں متعدد مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ ان الفاظ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عاصی کس قدر سادہ سہل اور روز مرہ کے الفاظ کو دقیق اور مشکل الفاظ پر ترجیح دیکر انہیں لفظوں کے ذریعے شعریت کے حسن کو برقرار رکھتے ہوئے معنیٰ آفرینی کی نئی وسعتیں عطا کرتے ہیں۔ اشعار دیکھئے:

عشق میں تم گھر بار لٹائے بیٹھے ہو
لیکن میں؟ میرا تو کوئی گھر بار نہیں

دل کی لگی کا شاید مطلب یہی ہے عاصی
دل بے قرار تڑپے دل بے قرار روئے

مجھے وعظ پر وعظ فرمانے والے
اگر کوئی تیری بھی نیندیں چُرالے

زندگی خیر ہمیں راس نہیں
موت بھی بھول چکی ہو جیسے

مختصراً اہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عروض وآہنگ ہو یا لب ولہجہ، مضمون آفرینی ہو یا معنی آفرینی، زبان وبیان ہو یا موضوعاتی تنوع غرض عاصی ہر سطح پر اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے ریاست میں اردو غزل کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کرنے میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے، جو کہ نا قابلِ فرموش ہے۔ بہ الفاظ دیگر جموں وکشمیر میں اردو غزل کے استاد شعراء میں عاصی کا شمار ہوتا ہے۔ جس کی خاص وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے دیگر اصناف کی بہ نسبت صنف غزل کو ہی اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ذکر عاصیؔ کے بغیر جموں وکشمیر کی اردو غزل کی تاریخ نامکمل ہوگی تو بے جا نہ ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

پرتپال سنگھ بیتاب

ریاست جموں وکشمیر میں آزادی کے بعد اردو شاعری کے میدان میں نمودار ہونے والے شعراء میں ایک اہم نام پرتپال سنگھ بیتاب کا ہے، جن کا تعلق صوبہ جموں کے پونچھ ضلع سے ہے۔ بیتابؔ ۲۶ جولائی ۱۹۴۹ء کو کھڑی دھرم سال پونچھ میں تولد ہوئے۔ مقامی اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے جموں کے گاندھی میموریل کالج سے بی اے کیا ہے۔ ایم اے سیاسیات اور ایل ایل بی کی اسناد جموں یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ علاوہ ازیں مرکزی سول سروس (آئی اے ایس) کا امتحان بھی پاس کیا۔ اور اس طرح آپ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ مختلف سرکاری شعبہ جات میں رہ کر اپنی خدمات انجام دینے کے بعد موصوف آجکل سبکدوشی کی زندگی جموں کے گاندھی نگر علاقے میں گزار رہے ہیں۔

ریاست جموں کشمیر کا پونچھ علاقہ اردو زبان وادب کے اعتبار سے نہایت ہی ذرخیز علاقہ رہا ہے۔ یہاں کے ادباء وشعراء اپنے ادبی کارناموں سے اس علاقہ کو صفحۂ ادب پر اعلیٰ مقام دلاتے رہے ہیں۔ ان ادباء نے اردو نظم ونثر کی خوب خدمت کی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم اور اٹوٹ کڑی پرتپال سنگھ بیتاب ہیں۔ بیتابؔ کو شاعری کی جلا سکھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب سے ملی ہے، جس کا اعتراف انہوں نے راقم کے ساتھ ایک ذاتی ملاقات کے دوران کیا۔ اس کتاب میں شامل صوفیوں، سنت کویوں اور گرووں کی بانی جو شاعری کی شکل میں ہے۔ پڑھ کر سن کر اور گا کر بیتابؔ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ پونچھ کے ادبی اور شعری ماحول نے بھی انہیں اردو ادب کی طرف مائل کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز چودہ پندرہ سال کی عمر میں پنجابی اور اردو میں کہانی غزل اور نظم گوئی سے کیا۔ جو بعد میں صرف اردو شاعری تک ہی محدود رہا ہے۔ موصوف کو بچپن سے ہی شاعری سے خاص

دلچسپی اور فطری لگاؤ رہا ہے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ پروان چڑھتا گیا۔ بیتاب نے قدیم شعراء میں میر، غالب، ذوق، داغ وغیرہ کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اثر بھی قبول کیا۔ اس کے باوجود انہوں نے شاعری کے لئے اپنی ایک الگ اور منفرد راہ اختیار کی۔ جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ بیتاب کی شاعری دو حصّوں نظم اور غزل پر مشتمل ہے۔ اس لئے بعض نقاد انہیں نظم گو اور بعض غزل گو شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر شفق سوپوری کے مطابق بیتاب غزل اور نظم دونوں اصناف میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور اس قبیل کے اردو میں چند ایک شعراء ہی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے ہمیشہ ایسے شاعروں پر رشک کیا ہے جو اچھی غزل کہنے کے ساتھ ساتھ اچھی نظم کی صلاحیت کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ اردو میں گنتی کے ایسے کامیاب شعراء ہیں جنہوں نے دونوں اصناف میں اپنے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب بھی ان شعراء کی صف میں شامل ہیں۔'' ۱۹

دوسری طرف ڈاکٹر انور سدید کا خیال کہ پرتپال سنگھ بیتاب اچھی نظم بھی کہتے ہیں لیکن اردو ادب میں ان کو جو مقام حاصل ہے اس میں غزل کا کردار زیادہ اہم رہا ہے۔ ایک مضمون ''پرتپال سنگھ بیتاب کی غزلیہ شاعری'' میں موصوف رقم طراز ہیں:

> ''ہندوستان کے ممتاز شاعر پرتپال سنگھ بیتاب اگرچہ اردو شاعری کی متعدد اصناف کے تخلیق کار ہیں۔ نظم نگاری میں انہیں اکیسویں صدی کے جدید شاعروں میں بلند مقام حاصل ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے ادبی تشخص میں ان کی غزل زیادہ معاون ہے۔'' ۲۰

اگرچہ بیتاب کا کلام نظم و غزل دونوں اصناف پر مشتمل ہے لیکن اس میں متعدد حصّہ غزل کے پیرائے میں ہی موجود ہے۔ اور یہاں ہم بیتاب کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے ہی بات کریں گے۔ بیتاب کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۰ء میں ''پیش خیمہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد ان کے یکے بعد دیگرے متعدد مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ جن میں ''سراب در سراب'' (۱۹۸۴ء) ،خود رنگ (۱۹۹۵ء)، کیکٹس اور گلاب (۱۹۹۹ء)، دی تھر سٹنڈ اڈ (۱۹۹۹ء)، موج ریگ (۲۰۰۳ء)، نظم اکیسویں صدی، شہر غزل، فلک آثار (۲۰۱۳ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ادبی زندگی کے آغاز سے تاحال بیتاب ہند و پاک کے نامور اور معیاری ادبی رسائل اور جرائد میں مسلسل چھپتے ہیں۔ ملک کے جن موقر رسائل میں بیتاب کا زیادہ کلام شائع ہوتا رہا ہے ان میں ''شب خون'' (الہ آباد) ''شاعر'' (ممبئی) ''الفاظ'' (علی گڑھ) ''اوراق'' (لاہور) ''ایوان اردو'' (دہلی)

بیسویں صدی'' (دہلی) '' سطور'' (دہلی) '' ذہن جدید'' (دہلی) '' صبح امید'' (ممبی) '' شیرازہ'' (سرینگر) '' انڈین لٹریچر'' ساہتیہ اکیڈیمی (دہلی) '' اردو الائیو'' (لدھیانہ) سرسبز'' (دھرم شالہ) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بیتاب کا کلام ان کے ہم وطن معاصرین کے مقابلے میں سب سے زیادہ مذکورہ بالا رسائل میں چھپا ہے۔ جس کا تذکرہ مظہر امام نے اپنے ایک مضمون میں ایک یوں کیا ہے:

'' ان کا (بیتاب) شمار جموں وکشمیر کے سب سے زیادہ چھپنے والے شاعروں میں ہوتا ہے۔''[۲۱]

بیتاب اردو غزل کی ایک منفرد اور توانا آواز ہے۔ جموں وکشمیر میں آزادی کی بعد کے غزل گو شعراء کی صف میں وہ دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے قدیم روایات شعر کی پاسداری رکھنے کے باوجود ایک الگ راہ اختیار کی ہے۔ جو ان کی اپنی اختراع ہے اور جس میں ان کو کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

توڑ آیا ہوں اک روایت کو
اک روایت کا پاسبان بھی ہوں

بیتاب نے جب شاعری میں اپنے قدم جمانے شروع کیے تھے اس وقت جدیدیت کا دور عروج پر تھا۔ بیتاب نے بھی اس کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ منسلک ہوئے۔ البتہ انہوں نے کسی طے شدہ راستے پر چلنے کے بجائے اپنے لئے ایک ترچھی مگر انوکھی اور نرالی راہ کا انتخاب کیا جس میں بہت کامیابی کے ساتھ آگے نکلے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

سیدھے راستوں پر ہمیشہ بھی نہ کرئے تکیہ
اپنی جاگیر میں اک ترچھی ڈگر بھی رکھیے
بیتاب اجنبی تھا سبھی کے لئے مگر
برپا تمام شہر میں کہرام کرگیا
الگ پہنچان تھی بیتاب کس کی
قطاروں میں کہیں ہم بھی کھڑے تھے
بونے ہوجائیں گے یہ سارے اکابر ایک دن
ایک دن ہوجائیں گے ہم بھی قدآور دیکھنا

بیتاب نے اپنی غزلوں کے لئے مخصوص لفظیات کا انتخاب کیا ہے جو انوکھا شعری منظر نامہ پیش کرنے میں ان کا ساتھ دیتا ہے۔ نامانوس اور فارسی الفاظ ان کے کلام میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انہوں

نے ایسے الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے جن سے عام قاری بخوبی واقف ہے، عمارت، کھنڈر، سمندر، جزیرہ، زندگی، کوہسار، اعتبار، سفر، موسم شہر، موسم، ثمر، ڈگر، غار، دریچہ، پرواز، دہشت، بھیڑ، صدیاں، وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو بیتاؔب کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان میں بعض الفاظ جیسے سمندر، جزیرہ، شہر، سفر، پتھر، نیند وغیرہ کا استعمال کئی مرتبہ ہوا ہے لیکن یہ الفاظ ہر بار نئے مفاہیم کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جس سے شاعر کے قوتِ تخیل کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ دے پختہ عمارت اک کھنڈر دے
میں بے گھر ہوں مجھے کوئی گھر دے

نہ دے اونچائی میرے قد کو بے شک
میری ہر شاخ کو لیکن ثمر دے

جس کو ساحل سمجھ رہے تھے ہم
وہ جزیرہ دکھائی دیتا ہے

موسم تو کئی آئے مگر خواب ہمارے
سوکھے ہوئے پتوں کی طرح گرتے رہے ہیں

لفظ سفر کے ساتھ بیتاؔب کو ایک خاص اُنسیت نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہ لفظ ان کی غزلوں میں سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ بعض غزلیں تو ایسی ہیں جن میں دو تین بار لفظ سفر در آیا ہے، لیکن ہر غزل میں ایک نیا اور الگ معنی فراہم کرتا ہے۔ شعر دیکھ کر اندازہ ہو جائے گا:

اب سفر ہے نہ کوئی رخت سفر
سر پر اک بار گراں تھا پہلے

ڈھونڈتے تھے ہمیں لمحے کیا کیا
اور صدیوں کے سفر میں ہم تھے

اک میدان تھا تصور میں
جب سفر میرا کوہسار میں تھا

یہ آبلہ پائی تو میرا عزمِ سفر ہے
جانا ہے مجھے وادی پُرخار سے آگے

مذکورہ بالا اشعار میں اگر لفظ "سفر" پر غور کیا جائے تو ہر شعر میں بیتاؔب نے اسے نئے مفہوم میں پیش کیا ہے جو دل کو چھو جاتا ہے یہ ان کی ذہنی اُپج کا بین ثبوت ہے۔ عصر حاضر میں انسان جن حالات و

واقعات سے نبرد آزما ہو رہا ہے۔ان کی بھرپور عکاسی بیتاؔب نے اپنی غزلوں میں کی ہے۔تنہائی، محرومی، خودشناسی، غلامی، لاحاصلی، بدگمانی، گوشہ نشنی، فردیت، نا اُمیدی، مادیت، قدروں کی گراوٹ، رشتوں کی ناپائیداری، مادی مسابقت، عدم تحفظ، ادھوراپن، وغیرہ ایسے موضوعات ہیں موضوعات ہیں جن کو موصوف نے الفاظ کا جامعہ پہنا کر غزل کی صورت میں پیش کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھ کو اب لگتا ہے گھر سے جب نکلتا ہوں
ہر کوئی مکمل ہے ایک میں ہی ادھورا ہوں
اجنبی ہوں اپنوں میں بھیڑ میں اکیلا ہوں
میں کہ اک دریچہ ہوں اور بند رہتا ہوں
فرشتہ میرے حصّے کا عطا کر
مجھے بھی میرے ہونے کی خبر دے
گئی صدیوں کا حاصل پوچھتے ہو
صفر تک آئے ہم چل کر صفر سے

تصوف جیسے نازک اور سنجیدہ موضوع کو بھی بیتاؔب نے اپنی غزل میں پیش کیا ہے۔جس سے ان کی عقیدت کا اندازہ صاف طور پر ہوتا ہے۔انہوں نے جسم اور روح کی حقیقت کو بھی اشعار میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمایا ہے۔انسان کے ظاہر و باطن اور اعمال و کردار کی کیا اہمیت اور وقعت ہے اس بات کو بھی بیتاؔب اپنے منفرد انداز میں سمجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔چنانچہ کہتے ہیں۔

جسم تو فقط اک مکاں ہے
روح کو لامکاں چاہیے
وہ نہ ہوکر بھی ہے چار طرف
ہجر بھی اک وصال ہے گویا
میری تنہائی کی پگڈنڈی پر
میرے ہمراہ خدا رہتا ہے
سبھی ناخدا جب ہوا ہوگئے
ہر اک سمت باقی خدا رہ گیا

کلام بیتاؔب میں تصوف کی عکاسی کے پیش نظر جناب شباب للت یوں رقمطراز ہیں:

''خدا پرستی، بندے اور خالق کے مابین روحانی رشتہ مشرقی انداز حیات کا

ایک جزو لاینفک ہے عرفانیت اور عبودیت کے جذبات نسل انسانی کے قلوب واذہان میں پیدا کرنے میں شاعروں کا ازل سے ایک واضح اور اہم رول رہا ہے۔۔۔پرتپال سنگھ بیتاؔب گرو کے سکھ ہیں خدائے پاک کے تیئں انہوں نے اظہار عجز وارادت اپنی غزلوں کے اشعار میں کہیں اشاراتی انداز میں تو کہیں کھل کر کیا۔'' ۲۲

ہجرت اور اس کے اثرات بھی بیتاؔب کی غزلوں کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ بیتاؔب ایک درد مند دل کے مالک ہیں۔ تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ صورت حال نے پوری دنیا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ بیتاؔب نے اس کرب ناک دور کی باز دید اپنے بعض اشعار میں کرائی ہے۔ کہتے ہیں ؎

گھاٹ اپنا رہا نہ گھر ہی رہا
اب تو باقی فقط سفر ہی رہا

یاد ہے سروسمن کی خوشبو
اپنے گم گشتہ وطن کی خوشبو

ہجرت کے بعد مجھے معلوم ہوسکا
میرے سوا بھی کوئی میرے سونے گھر میں تھا

جو غیر منقسم تھا وہ تقسیم سب ہوا
رستوں کے نام لے کر مسافر جدا ہوئے

اردو شاعری کی جملہ شعری محاسن کو بیتاب نے اپنی غزلوں میں برتا ہے، خاص طور پر استعارہ، تلمیح، تضاد، تشبیہ، اشارہ کنایہ وغیرہ کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ جدید غزل گو شعراء کی طرح بیتاؔب نے علامتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں کئی نادر ترکیبیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جو خود ان کی خلق کردہ ہیں۔

مجھے پتھر ہی پتھر دیئے ہیں
اب ان ہاتھوں کو آذر کا ہنر دے

زندگی دیکھ میں تیری خاطر
روز کس کس طرح سے مرتا ہوں

منتظر ازل سے ہوں میں کسی کو لمبس کا
بیکراں سمندر میں بے نشاں جزیرہ ہوں

دن کی دہلیز پر سو چوں بیتاؔب
جائے گی یہ سیہ رات کہاں

بیتاؔب کی غزلوں میں فنی لوازمات کے برتاؤ کے سلسلے میں ارمان نجمی لکھتے ہیں:

''بیتاؔب کی غزلیں بھی اسی تخلیقی ہنر مندی اور حسی سچائی کی آئینہ دار ہیں جوان کی نظمیہ شاعری کی خصوصیات کہی جا سکتی ہیں۔اسے صنفِ غزل کے تقاضوں اور فنی مطالبات کا ادارک بھی ہے اور ان سے عہد برآ ہونے کا طریقہ اسے معلوم ہے۔ان کی غزلوں میں اشاریت اور علامتوں کا ایک ایسا نظام قائم ہے جس کے ذریعے اس کے باطن میں جھانکا جاسکتا ہے۔'' ۲۳

بیتاؔب کی شاعری میں جہاں تک زبان اور انداز بیان کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں انہوں نے روزمرہ کی بامحاورہ زبان کو بروئے کار لایا ہے۔ان کے طرز بیان میں روانی اور تسلسل پایا جاتا ہے۔انہوں نے مشکل اور ثقیل اردو اور فارسی الفاظ سے بڑی حد تک پرہیز کیا ہے۔ان کی غزلوں کی ردیفیں اور قوافی بھی دلکش ہیں۔غالبؔ اور اقبالؔ کی زمینوں میں بھی چند غزلیں کہیں ہیں۔بقول بلراج بخشی:

''بیتاؔب نے بحروں اور لفظوں کے انتخاب میں رواں دواں بحروں اور سامنے کے الفاظ کو غیر ہموار بحروں اور فارسی نژاد الفاظ اور تراکیب پر ترجیح دی ہے۔بیتاؔب کی وہ غزلیں جو چھوٹی بحر میں سہل ممتنع کی زندہ اور دلآویز مثالیں ہیں۔'' ۲۴

بیتاؔب چھوٹی اور بڑی دونوں نوع کی بحور کو برتنے میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ جو رہتا ہے آنکھ سے اوجھل
اُس کا سایہ دکھائی دیتا ہے

جزیرہ جزیرہ شجر شجر
کسے ڈھونڈتی ہے تمہاری نظر

برف ہے یہ جو رہ گئی جم کے
اور جو بہہ گیا وہ پانی ہے

پھر کسی شاخ پر کوئل بولی
پھر تیرا رنگ سخن یاد آیا

ابھی سرحد کی اُس جانب ہیں کچھ آثار باقی
ابھی تو آنے والے کچھ پرندے اور بھی ہیں

بیتابؔ کی غزلوں سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ وہ بظاہر خوشحال زندگی گزار رہے ہیں لیکن باطنی طور پر وہ خود کو بہت ہی تنہا اور اکیلا محسوس کر رہے ہیں۔ عصر حاضر کا انسان اس بھیڑ بھری دنیا میں اپنی پہنچان کی جستجو میں بھٹک رہا ہے۔ بیتاب اپنے عالی شان گھر میں دنیا کی ساری سہولتیں ہونے کے باوجود اکیلا پن محسوس کر رہے ہیں۔ اپنے روحانی تشخص کے لئے وہ مسلسل سفر میں محو ہیں۔ سمندر کی طرح خاموش نظر آنے والے بیتاب کے اندر کئی موجیں تلاطم برپا کر رہی ہیں۔ جس کے اندر وہ اپنے وجود کی تلاش میں ڈھوبتے ابھرتے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دونوں ظاہراً بھرپور دونوں باطناً خالی
دیکھتا ہوں میں اس کو اور مجھ کو گھر میرا

اجنبی ہوں اپنوں میں بھیڑ میں اکیلا ہوں
میں کہ اک دریچہ ہوں اور بند رہتا ہوں

ہجوم بیکراں کے درمیاں ہیں
کسی کو کیا بتائیں ہم کہاں ہیں

یاد ہوگا تجھے اے گرد سفر
مجھ سے بچھڑی تھی میری ذات کہاں

مجھ کو جینا نہیں ہے کچھ مشکل
مسئلہ تو میری بقا کا ہے

بظاہر تھے بھرپور بیتابؔ ہم
بباطن مگر اک خلا رہ گیا

بیتابؔ کے کلام کے مطالعے سے بعض ایسے اشعار بھی نظر نواز ہوتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس ادبی مقام اور مرتبے کے وہ حقدار ہیں وہ انہیں نہیں ملا ہے۔ انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ بعض لوگ ان کی شاعری کے بجائے ان کے مذہب کو دیکھتے ہیں۔ جو کسی بھی شاعر یا مصنف کے ادبی تشخص میں ایک دیوار کا کام کرتا ہے۔ اس سلسلے میں افضل شاہین کے پوچھے گئے ایک کا سوال جواب دیتے ہوئے بیتابؔ کہتے ہیں:

" ایک سکھ ہونے کی وجہ سے مجھے کئی قسم کی مشکلات کا سامنا رہتا

ہے۔۔۔افسوس کہ ہندوستان میں اردو ادب کے معاملات میں غیر مسلم شعراء واد با میں وہ خود اعتمادی نہیں پیدا ہونے دی گئی جس کی کسی شاعر ادیب فن کار کو اشد ضرورت ہوتی ہے۔ میرے بارے میں تو کچھ ایک نام نہاد اردو داں حضرات اکثر کہتے ہیں سکھ کیا اور اردو شاعری کیا۔" ۲۵

لیکن اس کے باوجود بھی بیتاب اُردو شعر و ادب کے سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ موصوف امید اور عزائم پر بھرپور یقین رکھتے ہیں۔ اور جذبات اور احساسات کا مسلسل اردو زبان ہی کے ذریعے اظہار کرتے ہیں۔ انہیں آنے والی نسلوں سے اچھی امید ہے جوان کے فن کو فن کے آئینے میں تولیں گے نہ کہ مذہب کے آئینے میں۔ یہی وجہ ہے کہ بیتاب اپنے آپ کو آئندہ کا شاعر تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

حال میں تو کیا کھوجتا ہے بیتابؔ مجھے
مستقبل کا خواب ہوں میں آئندہ ہوں

کچھ مزاج اپنا ہی تھا بیتاب اُن سب سے جُدا
بس اکیلے چل دیئے ہم کارواں رہنے دیا

حسرت اپنی کہ نام عبارت میں ہو کبھی
لیکن ہمیشہ ذکر مرا حاشیے میں تھا

ہم کو خاموش نہ جانو صاحب
اندر اک شور بپا ہے

بحیثیت مجموعی یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے کہ بیتاب نہ صرف ریاست جموں وکشمیر بلکہ برصغیر کے ایک اہم اور معتبر غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام لوازمات بدرجہ اتم موجود ہیں جو ان کے دیگر ہمعصروں میں نظر آتی ہیں۔ بعض مقامات پر موصوف ان سے سبقت لے جاتے ہیں۔ عصر حاضر کے جملہ حالات وواقعات، حادثات ومعاملات کو پیش نظر کرنے میں بیتابؔ نے ایک مخصوص لب ولہجہ اور زبان وبیان اختیار کر کے ایک انوکھا شعری منظر نامہ خلق کیا ہے۔ جوان کا اپنا ہے۔ جس کے لئے انہوں نے نئی نئی تراکیب، تشبیہات، استعارات اور علامات تراشے ہیں۔ امین بنجارا کی رائے پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

"پرتپال سنگھ بیتابؔ کی شاعری کا اہم وصف جذبات کی صداقت ہے۔ دور حاضر کی اخلاقی، گراوٹوں، کدورتوں، بے ضابطگیوں، منافرتوں،

انسان، کی محرومیوں، حتیٰ کہ اپنی ذات کے انتشار کرتے ہوئے بھی وہ کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتے ان کی یہی ادا انھیں اپنے معاصریں سے ممتاز کرتی ہے۔"[۲۶]

☆☆☆☆☆☆

بلراج بخشی

ریاست جموں و کشمیر کی قومی شہراہ پر آباد ضلع ادھمپور اپنی تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ملک اور بیرون ملک سے جتنے بھی سیاح زمینی راستے سے وادیٔ کشمیر کی سیر کرنے کے لئے آتے ہیں ان کا گزر اس شہر سے ناگزیر ہے۔ یہ ضلع تجارتی حیثیت سے بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے باشندے بہت ملنسار اور مہمان نواز ہیں۔ ادھمپور کی بیش تر آبادی ڈوگری زبان بولتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہندی، اردو اور انگریزی میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اردو چونکہ ریاست کی سرکاری زبان ہے اور دسویں جماعت تک تدریسی نصاب میں ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے یہاں کے باشندے اس زبان میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس علاقے کے بعض قلمکار اپنی تخلیقی کاوشوں کو اردو کے ذریعے ہی ظاہر کرنا پسند کرتے ہیں۔ ادھمپور کے جن قلمکاروں نے اردو کو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے وسیلہ بنایا ہے ان میں آنند سروپ انجم، سعد اللہ ملک حزیں، وشنو دیو کوتوال، عبدالمجید پہاڑی، خالد حسین، مشتاق احمد وانی کے علاوہ بلراج کمار بخشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تقسیم ہند کی وجہ سے بے شمار گھرانے دونوں جانب ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے وطن، اپنی زمین، اپنے گھر، اپنی جائیداد کو جان کی امان کی خاطر ہمیشہ ہمیشہ چھوڑنے پر نا چاہتے ہوئے بھی مجبور ہوئے تھے۔ ایسے ہی خاندانوں میں ایک خاندان بلراج بخشی کا بھی ہے۔ ان کے والد جو کہ محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے دردناک واقع کے بعد پاکستان کے زیر انتظام کشمیر چھوڑ کر جموں کے ادھمپور ضلع میں سکونت حاصل کی۔ اور اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ادھمپور کے ہی رہ گئے۔ یہیں بلراج بخشی کی پیدائش مہاجرین کے لئے بنائے گئے ایک خیمے میں ۱۰ دسمبر ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ راقم کے پوچھے گئے پیدائش سے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اس پُر درد واقع کو کچھ اس طرح بیان کیا:

"جموں کے پاس نگروٹہ پر پناہ گزینوں (رفیوجیوں) کے ایک خیمہ میں میری

پیدائش کا حادثہ ہوا تھا۔''[27]

بلراج بخشی نے تعلیم کے ابتدائی مراحل ادھمپور کے سینٹرل پبلک اسکول اور گورنمنٹ بائز ہائر سیکنڈری اسکول میں طے کیے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے بلراؔج نے ادھمپور کے گورنمنٹ ڈگری کالج میں داخلہ لیا۔ جہاں سے انہوں نے بی۔ ایس۔ سی کا امتحان کافی کوششوں کے بعد پاس کیا۔ بعدازاں انہوں نے جموں یونیورسٹی کے شعبہ قانون میں داخلہ لیا تھا لیکن معاشی تنگ دستی کی وجہ سے بیچ راستے میں ہی چھوڑنا پڑا، اور گھریلو زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اردو زبان اور شعر و ادب سے دلچسپی بلراؔج کو طالب علمی کے دوران ہی پیدا ہو گئی تھی۔ جب وہ سنٹرل اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ اردو جو کہ ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی تھی اور نصاب میں شامل شعراء ولی، میر، غالب، اقبال، فیض وغیرہ کے کلام سے لطف اندوز ہوتے رہے اور ان میں بعض شعراء کے کلام کو اپنی آواز میں گاتے بھی تھے۔ خاص طور پر فیض احمد فیض اور ساحرلدھیانوی کی غزلوں اور نظموں کو اسکول میں اکثر محفلوں میں گاتے تھے اور اردو کے مشہور شعراء کے جو شعر ان کو پسند تھے ان کو اپنی ذاتی ڈائری میں نوٹ کرتے تھے۔ اور ان اشعار کو بلراؔج کی والدہ پڑھ کر اپنے بچے کو سناتی تھی۔ جس کی بدولت ان میں شعر گوئی کا شوق و ذوق پیدا ہو گیا۔ راقم کے ایک استفسار پر انہوں نے اس بات کا انکشاف بہت ہی دلچسپ انداز میں کچھ اس طرح کیا:

''شعر گوئی کے آغاز کی وجہ بھی عجیب تھی میرے والد پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ لیکن ہجرت کی وجہ سے پاکستان زیر انتظام کشمیر چھوڑ کر جموں آنا پڑا اور پھر ادھمپور کے ہو کر رہ گئے۔ میری عمر آٹھ سال تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ انہیں یاد کر کے روتی رہتی تھیں۔ مجھے ان کی یونیفارم، ان کے دو اسٹار بیلٹ اور ان کی دوسری چیزیں دکھا دکھا کر روتی تھیں۔ انہیں Memorable میں والد صاحب کی ایک ڈائری بھی تھی۔ حالانکہ والد صاحب خود شاعر نہیں تھے پر شاعری سے رغبت ضرور تھی۔ چنانچہ وہ اس ڈائری میں اپنے پسندیدہ شعر، گیت، غزل، بھجن وغیرہ لکھتے تھے۔ میری ماں پڑھ کر سنایا کرتی تھیں اور میں دلچسپی سے متوجہ ہو جاتا تھا۔ بس یہی سے میری طبیعت اس جانب راغب ہو گئی۔''[28]

بلراؔج کی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو کالج کے زمانے میں جلا ملی ہے۔ ان دنوں کالج میں ان کے ہم جماعتی آنند سروپ انجم، سریندر ساجد اور کلدیپ گپتا صابرؔ بھی اچھا ادبی مذاق رکھتے تھے۔ اس

طرح سے یہ چاروں دوست ایک دوسرے کی شعری نگارشات کو پڑھ کر یا سن کر ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ باقی تین حضرات سے قطع نظر بلراؔج نے صنف شاعری میں یہ مشق اس حد تک بہم پہنچائی کہ آج کل ان کا شمار نہ صرف ریاست جموں وکشمیر بلکہ ہندوستان کے معتبر اور بلند پایہ شعراء میں ہوتا ہے۔ بلراؔج اپنے خیالات کو غزل اور نظم میں سموتے ہیں اور دونوں اصناف میں اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت صنف غزل کو سنوارنے اور نکھارنے میں زیادہ موزوں ثابت ہوئی ہے۔ بلراؔج کی غزلیں ہندوستان کے موقر جرائد اور رسائل میں سالہا سال سے چھپتی رہتی ہیں۔ سب سے پہلی غزل ۱۹۶۹ء میں بقول ان کے ماہنامہ ''تحریک'' دہلی میں شائع ہوئی ہے۔ بعدازاں جن رسائل اور جرائد میں بلراؔج کی غزلیں زینت بنتی رہیں ان میں ''شاعر'' بمبی، ''شب خون'' الہ آباد'' روبی'' دہلی'' شیرازہ'' سرینگر ''شمع'' دہلی، ''سر سبز'' دھرم شالہ ''انتساب'' سرونج وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ جرائد اور دوسرے رسائل واخبارات میں موصوف کا اتنا کلام شائع ہوا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دینے کی زحمت گوارا کریں گے تو دو ایک خوبصورت شعری مجموعے وجود میں آسکتے ہیں۔

بلراؔج کے کلام کا جہاں تک تعلق ہے اس میں ان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا برمحل اور بے باکانہ اظہار ملتا ہے۔ موصوف کسی مخصوص تحریک یا رجحان سے وابستگی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنی ذات اور ماحول کے حالات وواقعات کو اپنے محسوسات کے مطابق شعری لباس میں منعکس کرنا زیادہ وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ بلراؔج کی غزلوں کا نمائندہ موضوع زندگی اور اس زندگی کے بے شمار رنگ ہیں۔ انسان روزمرہ زندگی میں جن حالات وحادثات سے دوچار ہوتا ہے اور یہ حالات وحادثات اس کی زندگی پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں، ان سب چیزوں کو بلراؔج اپنی غزلوں میں مخصوص انداز میں کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

کچھ اس طرح مرے دن رات ڈھلتے رہتے ہیں
کہ امتحان کے لمحات ٹلتے رہتے ہیں
اسی کو مری خموشی قبول جرم لگی
کبھی نہ کرنے دیا جس نے عرض حال مجھے
کوئی سنتا اگر میری صدائیں
پلٹ کے یوں نہ آجاتیں دعائیں
کبھی اپنے کبھی اغیار نظر آتے ہیں
سائے بھی کتنے پر اسرار نظر آتے ہیں

اک وادی ہو نیندوں کی
اور خوابوں کا ڈیرا ہو

متذکرہ بالا اشعار میں پہلے شعر پر غور کیا جائے تو لگتا ہے کہ بلراج بخشی اپنی روزمرہ زندگی میں آزمائشوں کے کڑے دور سے گزر رہے ہیں۔ابھی ایک کام مکمل نہیں ہوا کہ دوسرا آپڑا،اسے پورا کرنے میں لگے کہ تیسرا شروع ہوا،اور یہ سلسلہ متواتر چلتا رہتا ہے۔یہی حالات آج کل کے لگ بھگ ہر فرد کے ہیں جو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے شب وروز کام کرتا ہے۔گویا زندگی مسلسل امتحانات کا ایک مرکز ہے۔

دوسرے شعر میں شاعر مایوس نظر آتے ہیں کیونکہ جو التجا اور دعائیں وہ کرتے ہیں وہ کسی وجہ سے پوری نہیں ہو پائیں ہیں،جس کے لئے انہیں لگتا ہے کہ ان کی آرزؤں اور خواہشوں کو سننے والا اور پورا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔کیونکہ جب بھی انہوں نے دعا کی وہ قبول نہیں ہوئی بلکہ پلٹ کر واپس آئی۔

تیسرے شعر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دورِ حاضر میں کسی پر اعتماد کرنا آسان کام نہیں۔کیونکہ جو شخص بظاہر آپ کا قریبی دوست نظر آتا ہے۔اصل میں وہ آپ کا دشمن ہوتا ہے۔آج کل کا انسان بہروپیا ہے جو ایک چہرے پر کئی چہرے اُوڑھے ہوئے ہیں۔اور ہر وقت اپنا روپ بدلتا رہتا ہے۔لہٰذا کسی پر بھروسہ اور یقین کرنا بہت ہی مشکل ہے۔اس شعر میں بلراؔج نے دور رفتہ کی زندگی کے ایک اہم پہلو کو منعکس کیا ہے۔

چوتھے شعر میں شاعر نے ایک اہم حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔جس کا مشاہدہ ہم سب کو ہوگا وہ یہ کہ آج کے دور میں جو لوگ بے گناہ اور معصوم ہوتے ہیں انہیں ملزم و مجرم ثابت کر کے سزائیں سنائی جاتی ہیں۔جبکہ انہوں نے وہ خطا جس کی سزا کاٹ رہے ہیں کبھی کی ہی نہیں ہوتی ہے۔یہ شعر آجکل کی عدلتوں اور منصفوں پر ایک زبردست طنز ہے۔جو سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی قانون اور انصاف کو کھلے عام بالائے طاق رکھتے ہیں۔اور بے گناہوں کو جھوٹے الزاموں میں مجرم ثابت کر کے فیصلے سناتے ہیں۔

اسی طرح پانچواں شعر بھی اپنے اندر غضب کی انفرادیت رکھتا ہے۔اس شعر میں بلراؔج نے موجود دور کی تیز رفتار اور بھاگ دوڑ والی زندگی سے فرار کو موضوع بنایا ہے۔دور رفتہ کے ذی حس افراد اس مادی مسابقت والی زندگی میں سکون اور آرام کے خواہاں ہیں۔یہ لوگ نیند اور خواب کے متلاشی اور ممتنی ہیں۔کیونکہ آجکل کے انسان کے پاس سب کچھ ہے مگر چین،سکون،راحت،نیند،خواب نہیں ہیں۔اسی خیال کو شاعر نے ان دو مصرعوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بلراؔج کی شاعری خاص طور پر غزلیہ شاعری میں ایک مخصوص لفظیاتی نظام نظر آتا ہے۔جو جدید

غزل کی لفظیات سے مناسبت رکھنے کے باوجود معنی اور کیفیت کے اعتبار سے بڑی گہرائی رکھتا ہے۔ان کی غزلیں تازہ افکار وخیالات کی بدولت توجہ طلب ہیں۔بلراج نے زندگی اور زمانہ کی سچائیوں کا ذاتی طور پر سامنا کر کے اس کو حوصلے اور ہمت کے ساتھ جھیلا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں جھوٹ اور ریا کاری کے بجائے سچے تجربات و مشاہدات ہی زیادہ نظر آتے ہیں۔موصوف ایک حقیقت پسند شاعر ہیں۔اور زندگی کے حقائق کو قریب سے دیکھنے کے بعد اپنے تجربات اور محسوسات کو اشعار کا لباس کچھ اس طرح پہناتے ہیں:

باہر ہو اگر آگ تڑپتا ہے بہت دل
اندر جو لگی ہو تو بجھا نے نہیں دیتا

سمجھ میں آرہی ہے اب یہ دنیا
کہ راس آنے لگیں اپنی خطائیں

دنیا کا یہ دستور گوارہ نہیں ہوتا
ہم سب کے ہوئے کوئی ہمارا نہیں ہوا

آج کل کچھ بھی سلیقے سے نہیں ہوتا ہے
دل کہیں اور دماغ اور کہیں ہوتا ہے

وہ میرا دوست ہے دشمن ہے کیا یقین کروں
میں پات ہوں، کرتا ہے ڈال ڈال مجھے

دردوغم انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔اور ہمارے شعراء حضرات نے اس کو بطور موضوع اپنی شاعری میں کئی رنگوں میں پیش کیا ہے۔بلراج نے بھی اپنی غزلوں میں دردوغم کو سمیٹا ہے۔انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی سے ہی غموں اور مصیبتوں کا سامنا کیا ہے۔وہ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے اور رفوجی کیمپوں میں زندگی کے ابتدائی مراحل طے کیے ہیں۔غریبی اور لاچاری نے انہیں ہر طرف سے گیرے رکھا تھا۔ایسے میں بلراج اپنے غموں کو غلط کرنے کے لئے غزل کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے درد دل کو غزل کے ساغر میں چھلکاتے ہوئے کہتے ہیں:

درد بھی ایک مسلسل ہے میرا ہی بلراج
ڈوبتا ہے کبھی رہ رہ کے ابھر جاتا ہے

علاج ایک ہی باقی ہے اس مصیبت کا
کہ سر نہ ہوتا اگر درد سر نہیں ہوتا

کھڑے کھڑے کف افسوس کوئی مل جاتا
رُکا پڑا کوئی آنسوں ہو میں نکل جاتا
نہ درد جائے نہ ان کے نشاں مٹیں دل سے
کہاں سے ڈھونڈ کے یہ زخم لائے جاتے ہیں
کوئی سراغ نہ چہرہ یہاں کرے بلراؔج
دلوں کے درد دلوں میں چھپائے جاتے ہیں

بلراؔج گہرا شعور رکھتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ جس دور سے گزر رہا ہے۔ جو حالات آئے دن ہماری سماجی زندگی میں رونما ہو رہے ہیں۔ چاہے ان کا تعلق سماجی نابرابری، قدروں کے زوال، رشتوں کی پامالی، جنسی بے راہ روی، مادیت پرستی سے ہو یا پھر مذہبی تفریق وغیرہ سے غرض ان سب چیزوں کو بلراؔج نے جہاں تک محسوس کیا ہے اس کی ہو بہو عکاسی اپنے کلام میں کی ہے۔ جو کہ ایک تخلیق کار اپنے سماج کے لئے ایک اخلاقی فرض بھی ہے۔ موصوف نے یہ فرض کس خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے صاف ہوتا ہے:

حادثے اور بھی ہیں شہر میں ہونے والے
آنسوں کی نہ کمی ہو کہیں رونے والے
ہم نے مل جل کے جلایا ہے جو گھر کس کا تھا
اپنی تلوار گلا اپنا ہے ڈر کس کا تھا
اپنے ہی نام پہ وہ کر گیا تقسیم ہمیں
کبھی سوچا بھی نہ تھا ایسا خدا ہے میرا
اب تو اک حد ادب رہنے لگی رشتوں میں
اب کہاں کوئی کسی دل میں مکیں ہوتا ہے
کسی بھٹکے مسافر کو بھی ہم مہمان کہتے تھے
مگر اب دوست کو بھی گھر میں ٹھہرایا نہیں جاتا

مذکورہ بالا اشعار پر غور کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ بلراج ہمارے معاشرے کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ جو ان کے ذی حس اور مفکر ہونے کا عین ثبوت ہے۔ پہلے شعر میں شاعر ہماری توجہ آئے دن رونما ہونے والے بے شمار حادثات کی طرف مبذول کرا رہے ہیں۔ ان حادثوں کو دیکھ کر ہر دردمند دل رکھنے والا شخص آنسو بہاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں

مذہب، ذات پات، رنگ ونسل کے نام پر ایک دوسرے سے لڑنا اور سازش کرنا آج کے دور کے انسان کا معمول بن گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں دونوں فریق کے لوگوں کو بھاری نقصانات اُٹھانا پڑتے ہیں۔ تیسرے شعر میں مذہب جو کہ ایک انسان کی پہنچان ہے کو موضوع بنایا ہے لیکن یہاں شاعر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آجکل مذہب کے ٹھیکدار مذہب کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے الگ الگ جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی طرح چوتھے شعر میں رشتوں کی اہمیت اور وقعت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ رشتوں اور رشتہ داروں کے لئے جو محبت دلوں میں ہوا کرتی تھی اس کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اب موجودہ دور کے انسان کے پاس رشتہ داروں کا حال پوچھنے کے لئے بھی وقت نہیں جو کہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ ہم اور ہمارا معاشرہ آج اس دور سے گزر رہے ہیں جہاں اپنوں کی اہمیت نہیں تو غیروں کی بات ہی کیا کریں لیکن ایسا بھی وقت گزرا ہے جب لوگ مسافروں اور رہ بھٹکے لوگوں کو گھر بلاتے تھے ان کی خاطر تواضع کرتے تھے۔ لیکن آج وہ زمانہ ہے کہ مسافر اور غیر تو دور اپنے دوست اور قرابت والوں کو بھی نہیں پوچھتے۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار اشعار بلراجؔ کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جو ان کی سماجی بیداری کو عیاں کرتے ہیں۔

کشمیر گذشتہ تین چار دہائیوں سے جن نازک حالات سے گزر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، آئے دن قتل و غارت گری اور خون کی ہولی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ظالموں کے بے پناہ مظالم، افراتفری، ہڑتالیں، گولیوں کی گھن گرج وغیرہ آج کل کشمیر میں معمول کی بات ہے۔ ایسے ماحول میں رہنے والا شاعر ان سب چیزوں سے کیسے چشم پوشی کر سکتا ہے۔ چنانچہ بلراج بخشی ان حالات کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

بارود کے موسم نے کھلائے ہیں نئے گل
سنتے ہیں کہ اب ڈل میں شکارا نہیں ہوتا
بستی رہی مرے گھر میں کچھ ایسی تاریکی
تمام شہر میں کوئی دیے جلا نہ سکا
رونے رلانے والے یہی ملتے رہے ہمیں
بلراج کوئی ہنستا ہنساتا ہوا ملے

تقسیم ہند اور ہجرت جس سے ہندو پاک کے بے شمار لوگوں کو گزرنا پڑا دنیا کی تاریخ کا سب سے دردناک واقع ہے۔ بلراجؔ کا خاندان بھی اس حادثے کا شکار ہوا ہے۔ ایک مہاجر خاندان کی زندگی کن مصائب اور آلام سے دوچار ہوتی ہے کن آفتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلراجؔ نے اپنی

بعض غزلوں کے اشعار میں اس دردناک دور اور اس سے پیدا شدہ صورت حال کی منظر کشی کچھ اس طرح کی ہے:

فسادوں میں اُجڑنے والے کب آباد ہوتے ہیں
دلوں کو جوڑنے کا پُل تو بنوایا نہیں جاتا
یہ کیسی جنگ جاری ہے کہ دونوں سمت ماتم ہے
کسی کی جیت کا پرچم ہی لہرایا نہیں جاتا
اسطرح ہوگئے تقسیم کہ سوچا بھی نہیں
کس کی شاخیں ہیں ثمر کس کے شجر کس کا تھا
بچھڑنا اپنا مقدر ازل سے ہے لیکن
یہ سانحہ کسی اگلی گھڑی کو ٹل جاتا

بلراؔج کے کلام میں ہمیں اس انتشار زدہ سماج و معاشرے کی روداد سنائی دیتی ہے جس میں آج کا انسان اپنی شناخت کھو چکا ہے۔ اس کا یقین ہر چیز پر سے اُٹھ گیا ہے۔ سیاسی بازی گری نے اس کے اندر بغض، عناد، عداوت، عیاری و مکاری اور قتل و خون ریزی کے وہ تمام شر پسند عناصر پیدا کر دئے ہیں کہ وہ اپنے وجود کے تحفظ کے لئے کوئی بھی حد پار کر سکتا ہے۔ اس کے نزدیک اب خیر و شر اور حق و باطل میں کوئی امتیاز نہیں رہا ہے۔ علم و اخلاق کے تمام سرچشمے اُس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے ہیں۔ بلراؔج ان تمام حالات کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور پھر اپنی غزلوں میں اس کا اظہار بھی خوب کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

میری تنہائیوں کے بن رہے ہیں ان گنت قصّے
کوئی بن باس کہتا ہے کوئی مغرور ہوجاتا
اس لئے مجھ سے میرے دوست خفا رہتے ہیں
کہ مجھے اُن سے شکایت یا طلب کچھ بھی نہیں
آج کل کچھ بھی سلیقے سے نہیں ہوتا ہے
دل کہیں اور دماغ اور کہیں ہوتا ہے
یقین ہی اب یقین میں نہیں ہے
کوئی سجدہ جبینوں میں نہیں ہے
جب سے تنہائی کی توسیع ہوا ہوں بلراج

اسے بڑھ کر بھی بھلا اور بُرا ہے میرا

بلراؔج نے اپنی غزلوں میں اپنے گرد ونوح کے ماحول کو منعکس کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اپنی غزلوں میں نئے موضوعات کو برتنے کے لئے بلراؔج نے نئی نئی تراکیب بھی وضع کیں ہیں۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی بلراؔج بخشی کی غزل گوئی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بلراؔج کی غزل نہ تو عورتوں سے باتیں کرنے تک محدود ہے اور نہ ہی وہ کسی خیالی یا حقیقی محبوب کی زلف وعارض اور اس کی وفا وجفا کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ ان کی غزلوں میں ایک ایسے ماحول ومعاشرے کی کارفرمائی کا ذکر ملتا ہے جو تمام اخلاقی اور تہذیبی اقدار کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے اور جہاں عصری حسیت اور جدید زمانے کی چیرہ دستیوں، سماجی ناانصافیوں محرومیوں اور تشنگیوں کا خاصا عمل دخل ہے۔اس پرآشوب دور کو شاعر نے مخصوص لب ولہجہ اور لفظ کی نئی معنویت عطا کر کے خاصا پُر کیف اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔''

۲۹

حادثہ، خواب، نیند، آسمان، سورج، سایہ، سمندر، صحرا، دھوپ، وغیرہ ایسے الفاظ اور استعارات ہیں جن کا استعمال بلراج بخشی نے اپنی غزلوں میں کثرت سے کیا ہے۔یہ اور اس طرح کے بہت سارے الفاظ جدید غزل گوشعراء کی طرح بلراج نے نئی معنویت کے ساتھ اپنے تجربات اور خیالات کی ترسیل کے لئے استعمال میں لائے ہیں۔بلراج بخشی جدید غزل گو حضرات کے مقابلے میں اپنے اشعار کو ان کے اشعار کے معنی اور مطالب کی ترسیل آسانی سے ہوجاتی ہے۔غزل چاہیے کسی بھی دور کی ہو یعنی قدیم اور کلاسیکی ہو یا ترقی پسند دور کی یا پھر جدید اور مابعد جدید دور کی اس میں ہر اعتبار سے موضوع کے علاوہ خیال اور اندازِ بیان کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔عمدہ خیال کو پیش کرنے کے لئے عمدہ اور خوبصورت اندازِ بیان بھی ہونا ضروری ہے کیونکہ اکثر اوقات ایک اچھا اور پاکیزہ خیال بھی بیان کی کمزوری کی وجہ سے اپنا تاثر کھو بیٹھتا ہے وہیں دوسری جانب بیان کی خوبصورتی کی بنا پر معمولی سا موضوع بھی دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔لہٰذا عمدہ شاعری وہی ہے جس میں حسنِ خیال کے ساتھ ساتھ حسنِ بیان بھی موجود ہو۔بلراج بخشی کی شاعری ان خصوصیات سے مزّین ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

اس طرح بھی دیتا ہے سزا مجھ کو ستم گر
ناراض اگر ہو تو منانے نہیں دیتا

میں بھی تنہا ہوں مرے ساتھ بھی تنہائی ہے
آپ نے جب سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے

وہ نیند بھی دیتا ہے تو قسطوں میں ہمیشہ
اور خواب اگر دے تو سہانے نہیں دیتا

اسی لئے تیرے دل میں کوئی نہ رہتا
ترے مزاج کے موسم بدلتے رہتے ہیں

غزل کا فن بہت ہی نازک ہوتا ہے۔بلراج بخشی صنف غزل کے فنی لوازمات پر گہری اور زبردست گرفت رکھتے ہیں۔بات چاہیے وزن کی ہو یا پھر بحور کے انتخاب کی، ردیف قافیہ کی ہو یا پھر تشبیہات اور استعارات کے استعمال کی۔موصوف نے ہر جگہ اور ہر سطح پر اپنی فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ان کی غزلوں میں چھوٹی اور بڑی دونوں نوع کی بحروں کا استعمال ہوا ہے۔اور دونوں کو بڑی فنکاری سے برتنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔علاوہ ازیں ردیف اور قافیہ کے لئے بھی انہوں نے روایتی اور کلاسیکی الفاظ سے قطع نظر نئے اور جدید الفاظ کا زیادہ استعمال کیا ہے۔جس سے ان کی غزلوں میں ترنم اور غنائیت میں اضافہ ہوا ہے۔اور قاری بلراج بخشی کی غزلوں سے پوری طرح محظوظ ہوتا ہے۔چند اشعار دیکھئے جن سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹی اور بڑی بحور کو برتنے میں بلراج بخشی کس قدر یکساں قدرت رکھتے ہیں:

انہیں جب بھی ہم آزمانے گئے
سمجھ لو کہ دل ہی جلانے گئے

دنیا چاہئے جس کی ہو
اس میں کچھ تو میرا ہو

کہاں کہاں نہ گیا ان سنی دعا کی طرح
پھر اپنے در پہ چلا آیا التجا کی طرح

میرے قریب رہا وہ مجھ سے دور رہا
کوئی نہ کوئی تعلق مگر ضرور رہا

بلراج بخشی کی غزلوں کی ایک اور نمائندہ خوبی ان کا منفرد لب ولہجہ اور سادہ اور سہل اندازِ بیان ہے۔یہی چیزیں ان کو ریاست جموں وکشمیر کے نمائندہ غزل گو شعراء کی صف میں جگہ دینے میں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں۔بلراج بخشی روزمرہ اور عام فہم الفاظ کے ساتھ ساتھ مانوس تشبیہات، استعارات

اورتراکیب کا بھی بڑی ہنرمندی اور سادہ بیانی سے استعمال کرتے ہیں۔جس سے ان کے اشعار میں فطری روانی اور جامعیت پیدا ہوجاتی ہے۔اور ان کی غزل میں فطری تغزل کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔موصوف کی غزل میں زبان و بیان،لب ولہجہ اور دیگر خصوصیات کے پیش نظر ڈاکٹر مشتاق احمد وانی یوں رقمطراز ہیں:

> ''بلراج بخشی ایسے شاعر ہیں جو عروض وقواعد اور زبان پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔بلراج کی طبیعت میں سادگی، لطافت،نفاست اور ادبی چاشنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور یہی اوصاف حمیدہ ان کی شاعری میں بھی پائے جاتے ہیں۔ان کی زیادہ تر غزلیں پہاڑی زمینوں اور مترنم بحروں کی حامل ہیں۔اُن کے اشعار میں عصری مسائل اور واردات قلبی کا بیان پوری فنی مہارت کے ساتھ قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔بلراج کی غزلوں میں ان کا لب ولہجہ لفظیات،تراکیب اور اس کی نئی معنویتیں ایک خاص رُخ اختیار کرلیتی ہیں اور ہمیں ان کی شاعری نئے طرز احساس کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔''۳۰

غزل پر موضوع کے اعتبار سے بات کی جائے یا فنی لحاظ سے بلراج بخشی دونوں سطح پر ایک کامیاب غزل گو کے طور پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔موصوف کے کلام نے انہیں نہ صرف اپنے وطن عزیز جموں وکشمیر بلکہ پورے ملک میں ایک پہچان اور مقام عطا کیا ہے۔امید ہے کہ آئندہ بھی وہ اپنی تخلیقات سے ہمیں نوازتے رہیں گئے اور اردو غزل کے سرمایے میں خاطر خواہ اضافہ کرتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆

احمد شناس

احمد شناس جموں وکشمیر کے ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اردو ادب کے بے شمار خدام پیدا ہوئے ہیں۔راجوری پونچھ ریاست کا ایسا علاقہ ہے جہاں اردو کے شیدائیوں کی کثیر تعداد آباد ہیں۔یہاں کے فنکاروں نے اردو شعر وادب کی خوب خدمت کی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔اس لحاظ سے جو نام ناقابل فراموش ہیں ان میں چراغ حسن حسرت،کرشن چندر،اثر صہبائی،ٹھاکر پونچھی،دینا ناتھ رفیق،مالک رام آنند،آنند لہر،پرتپال سنگھ بیتاب،تحسین جعفر،فاروق مضطر،شہباز راجوری کے علاوہ احمد

شناس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

احمد شناس راجوری کے ایک تاریخی گاوں شاہدراہ شریف میں ۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو پیدا ہوئے ۔شاہدراہ شریف میں مشہور دینی بزرگ بابا غلام شاہ بادشاہ کا آستان شریف واقع ہے، جہاں سال بھر عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔احمد شناس نے اپنے آبائی گاوں میں پہلے مدرسہ سے قرآن شریف سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔اس کے بعد مقامی پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔میٹرک کا امتحان موصوف نے تھانہ منڈی کے ہائی اسکول سے پاس کیا۔اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے ڈگری کالج پونچھ میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ بعدازاں جموں یونیورسٹی کے شعبہ قانون سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد احمد شناس ریڈیو کشمیر جموں میں بحیثیت ٹرانس مشن ایگزیکیٹو تعینات ہوئے۔ یہاں انہوں نے سات سال تک اپنے فرائض انجام دیئے ۔اسی دوران موصوف نے (کے اے ایس /KAS) کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان پاس کیا۔اور مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۲۰۰۹ء میں ضلع رام بن کے ڈپٹی کمشنر کے منصب سے سبکدوش ہوئے ہیں۔آج کل فرصت کے لمحات اپنے آشیانے واقع توی وہار کالونی سدرا جموں میں گذار رہے ہیں۔اور اردو غزل کے گلستان میں روز افزاوں نئے نئے پھول کھلا رہے ہیں۔

احمد شناس جب مدرسہ میں تحصیل علم کر رہے تھے اسی دوران انہیں شعر گوئی کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ان کے شفیق اور رفیق استاد مرحوم مولوی عالم صاحب اردو زبان اور شاعری بالعموم اور کلام اقبال سے بالخصوص والہانہ شغف رکھتے تھے۔جس کا اثر براہ راست احمد شناس پر بھی پڑا۔مولوی صاحب اپنے شاگردوں کو قرآنی تعلیم کے ساتھ ساتھ کلامِ اقبال کی نظمیں اور غزلیں بھی بلند آواز سے پڑھاتے تھے۔مدرسے میں احمد شناس اور ان کے ایک دوست عبدالرشید شاہین کی آواز مولوی صاحب کو زیادہ پسند تھی ۔اس لئے ان دونوں کو ہی زیادہ تر کلام اقبال ترنم سے پڑھنے کے لئے کہتے تھے۔مولوی صاحب موصوف ہی کے توسط سے مختلف دینی، سماجی اور سیاسی تقاریب میں احمد شناس اور ان کے ساتھی اپنی سریلی آواز میں کلامِ اقبال سُنایا کرتے تھے۔جس کے عوض انہیں خوب داد ملتی تھی اور بعض اوقات انعامات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ایسی محفلوں میں اقبال کا کلام پڑھنا اور گنگنانا ایک ذہین اور ذی حس شخص کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑ سکتا ہے۔اور ہوا بھی یہی کہ احمد شناس کے وجود میں خوابیدہ شاعرانہ محفلوں میں کلام اقبال پڑھنے کے بہانے نمودار ہوا۔جس کا اعتراف وہ اس طرح کرتے ہیں:

''یہ ایک ایسا وسیلہ تھا جو کسی بھی حساس ذہن اپنے اثرات مرتب کیے بنا نہیں رہ سکتا چنانچہ شعری آہنگ میں لاشعور کا حصّہ بن گیا اور لفظوں کی قطع و برید کو

میں نے اپنا مشغلہ بنالیا۔''۳۱؎

احمد شناس نے باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز اس وقت کیا ہے، جب وہ گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ میں زیر تعلیم تھے۔ یہاں پر وہ نصابی کتابوں کے علاوہ علامہ اقبال کے شعری مجموعہ ''بال جبرئیل'' کا نسبتاً زیادہ مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ احمد شناس کی لیاقت اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے اردو کے استاد مرحوم اجیت کمار بخشی نے انہیں کالج میگزین کا طالب علم مدیر مقرر کیا۔ علاوہ ازیں موصوف کی ابتدائی شعری کاوشوں کی اصلاح بھی کرنے لگے۔ کالج میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں اب احمد شناس بھی شرکت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں کہتے ہیں:

''یہیں (کالج) سے میں نے باقاعدہ ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کیا۔ جن اشعار کے ساتھ میں نے کالج کے پہلے مشاعرے میں شرکت کی تھی ان کی نوک پلک سنوارنے میں مرحوم اجیت کمار بخشی نے میری مدد کی تھی۔'' ۳۲؎

اردو کے شعری منظر نامے پر احمد شناس نے اس وقت قدم جمانے شروع کیے جب جدیدیت کا دور اپنے عروج پر تھا۔ اسی فضا میں احمد شناس نے بھی اپنے جذبات اور محسوسات کو لسانی اور فنی اعتبار سے برتنا شروع کیا۔ اردو دنیا میں ''شب خون'' نے ایک نئی لہر پیدا کی تھی۔ جس کا اثر کسی محدود علاقے تک ہی نہیں بلکہ پورے ہندو پاک میں اس نے شب خون مارا تھا۔ کشمیر میں بھی اس رسالے کے قارئین کی کثیر تعداد موجود تھی۔ ان میں احمد شناس بھی شامل تھے۔ انہوں نے بھی جدید رنگ کے اشعار کہنا شروع کیے اور دوسرے ہمعصر شعراء کی بہ نسبت احمد شناس نے جدید طرزِ اظہار کے ساتھ اچھی خاصی ذہنی ہم آہنگی پیدا کی تھی۔ جس کا اندازہ ان کے درجہ ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

جسے دکھایا گیا تھا حرف ِکمال جیسا
وہی ہے آنکھوں میں آج خواب جیسا

بہت چھوٹا سفر تھا زندگی کا
میں اپنے گھر کے اندر تک نہ پہنچا

غرق کرتا ہے نہ دیتا ہے کنارہ ہی مجھے
اس نے میری ذات میں کیسا سمندر رکھ دیا

نام خوشبو کی مانند ذات آئینہ
میں تحیّر تیری بات بات آئینہ

احمد شناس نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی ہے اور اس صنف میں انہوں نے ایک مخصوص لب ولہجہ اور ایک دلکش انداز بیان اپنایا ہے۔ اگر چہ انہوں نے بہت اچھی نظمیں بھی لکھیں ہیں تاہم ان کا شمار ریاست کے عمدہ غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے اب تک دو شعری مجموعے ''پسِ آشکار'' ۲۰۱۰ء اور ''صلصال'' ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان مجموعوں نے شاعر کو شہرت عام اور بقائے دوام بخشنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ احمد شناس کے یہ دونوں مجموعے ریاست جموں و کشمیر میں اردو شاعری بالعموم اور صنفِ غزل میں بالخصوص ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ موصوف شروع سے ہی ہندوستان کے تقریباً تمام شہرت یافتہ جرائد اور رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ جن میں ''شاعر'' ممبی، ''شب خون'' الہ آباد، انتساب'' سرونج، ''الفاظ'' علی گڑھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی بہ دستور جاری ہے۔ موصوف کے شعری مجموعے ''صلصال'' کو یو پی اردو اکیڈیمی اور بہار اردو اکیڈیمی نے انعامات سے نوازا ہے۔

غزل اردو شاعری کی وہ صنف سخن ہے جس میں زمانے کے ساتھ بدلنے کا عمدہ سلیقہ موجود ہے۔ اردو غزل کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ولی سے میر تک، میر کے عہد سے غالب تک، غالب سے اقبال تک، اقبال سے فیض تک اور فیض سے ناصر کاظمی تک غزل نے کتنے روپ بدلے اور یہ صنف ہر دور میں کثیر شعراء کے اظہار کا وسیلہ رہی ہے۔ غزل نے کسی خاص زمانے سے خود کو منسوب نہیں کیا ہے بلکہ ہر نئے عہد میں اپنے لئے نیا لباس زیب تن کیا ہے۔ جس نے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔ غزل کا حالات کے ساتھ بدلنے کی اس خوبی کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی یوں لکھتے ہیں:

> ''غزل میں حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت ہے اس کے ارتقا کی رفتا ہر دور میں زندگی کے مدو جزر سے پوری طرح ہم آہنگ رہی ہے۔ اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا عکس نظر آتا ہے۔ ماحول کی بدلتی ہوئی کیفیات کو اس نے بڑی خوبی سے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ وہ اسی ایک کہانی ہے۔''۳۳

احمد شناس بھی غزل کے تغیّر کے اس عہد کے اہم اور نمائندہ شاعر ہیں۔ یہ دور بیسویں صدی کے ستّر کے دہے میں شروع ہوا اور اس دور میں غزل نے جو رُخ اختیار کیا تھا اس کی نمایاں جھلک ہمیں احمد شناس کی غزلوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ احمد شناس اپنے جذبات اور محسوسات کو اپنے منفرد لہجے اور مخصوص لفظیات کے سہارے غزل میں سموتے ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے مروجہ موضوعات کے ساتھ ساتھ ذاتی تجربات اور مشاہدات سے نئے نئے موضوعات سے صنف غزل کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

میں پیاسا ہوں پرانے موسموں کا
مگر اب وہ زمانہ جاچکا ہے
ہمیں جو کچھ ملا ناقص ملا ہے
مگر خوش فہمیوں کی انتہا ہے
یہی باعث ہے میری تشنگی کا
سمندر مجھ سے پانی مانگتا ہے
کیا خبر کتنے جہانوں سے گزر جانا ہے مجھے
اس جہاں میں میرا ہونا احتمالی ہوگیا

احمد شناس کی غزلوں میں متنوع موضوعات ملتے ہیں۔ زندگی اور اس کے بے شمار پہلوان کی غزلوں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ عصری زندگی جس دور سے گزر رہی ہے۔ اس کی طرف احمد اپنی متعدد غزلوں میں علامتی انداز سے ہمیں متوجہ کرا رہے ہیں۔ دورِ رفتہ کا انسان جن حالات سے نبرد آزما ہو رہا ہے یعنی اخلاقی قدروں کا فقدان، سماجی پستی سیاسی بدحالی، رشتوں کا خاتمہ، مادیت پرستی، رشوت خوری، ہوس پرستی، تنہائی اور محرومی، ظلم و جبر وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو شعری پیکروں میں ڈھل کر احمد کے ہاتھوں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ جس سے ان کی عصری آگہی کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اشعار دیکھئے۔

حادثہ بیروِں ہستی تھا کہ اندر
سنگِ امکان ریزہ ریزہ ہوگیا ہے
زندہ انساں اسے آباد کیا کرتے ہیں
گھر کسی خواب سے معمور نہیں ہوسکتا
کچھ تو میرے وجود کا حصہ ہے تیرے پاس
ورنہ میں اپنے آپ میں کیا انتظار ہوں
اس کو انساں نے قبیلوں کے حوالے کردیا
جو یہاں آیا تھا انسانوں کی وحدت کے لئے
پردیس کی راتوں میں بہت جاگ چکا میں
اب گھر کا سکوں اوڑھ کے سونے کے لئے ہوں

آج کے دور میں لوگ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے لئے زمین، آسمان ایک کرتے ہیں اور جب یہی بچے تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں۔ اور اچھی نوکری کرنے لگتے ہیں تو وہ اپنے والدین کو بھول

جاتے ہیں۔اوران کوکسی ''بزرگ خانہ'' (Old age Home) میں داخل کراتے ہیں۔ایسے لوگوں کی تعداد معاشرے میں روز افزوں بڑھتی جارہی ہے۔اس کڑوی سچائی کی جانب احمد شناس ہماری توجہ اپنے اشعار کے ذریعے یوں مبذول کرارہے ہیں۔

رشتوں کا آشوب انہیں کھا جائے گا
ہم سے کتنے دور ہمارے بچے ہیں
میں خود اپنے آپ سے ہوں بیگانہ سا
بستی کے انسان بھی میرے جیسے ہیں
تنہا جینے مرنے والا
رشتوں کا دم بھرنے والا

اسی طرح احمد موجودہ دور کے انسان کی نفس پرستی کو بھی موضوع بناتے ہیں۔انسان نفسیاتی خواہشات کو پورا کرنے میں دن رات ایک کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے خون کے رشتوں کو بھی اس ضمن میں نظرانداز کرتا ہے۔احمد شناس اپنے مخصوص انداز میں اس صورت حال کو یوں شعر کا لباس پہناتے ہیں:

نفس کا سانپ کہاں زیر ہونے والا ہے
پھر اس کے بعد کوئی اور امتحاں دیکھو
پیٹ کی خاطر مشرق سے مغرب کی دوڑ لگاتا ہوں
ایسی بھوک لگی ہے احمدؔ روٹی کھانا بھول گیا

عشق اردو غزل کا بنیادی موضوع ہے جس کو ابتداء سے موجودہ دور تک ہر چھوٹے بڑے شاعر نے اپنے اپنے تجربات کے مطابق اشعار میں سمویا ہے۔احمد شناس کی غزلوں میں بھی عشق کے موضوع پر متعدد اشعار ملتے ہیں لیکن انہوں نے مجازی عشق کے بجائے عشق حقیقی کو نئے اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔عشق الٰہی ایک پاک جذبہ ہے جس کو برتنے کے لئے احمدؔ نے نئے الفاظ اور تراکیب کو استعمال میں لایا ہے۔احمدؔ کا ماننا ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد خود آگہی کے ساتھ ساتھ خدا آگہی بھی ضروری ہے۔کیونکہ اللہ نے انسان کو ایک مخصوص کام کے لئے اس دنیا میں محدود وقت کے لئے بھیجا ہے۔اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انسان اللہ کی قدرت کو غور و فکر کے ساتھ سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔اس سلسلے میں ان کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں:

کوئی چہرہ ہے کہ چہرہ ماورا ہے
پھول ہے وہ یا تصور پھول کا ہے

میرے اندر بھی تیرے نام کی چنگاری ہے
تو میرے واسطے کیوں طور نہیں ہو سکتا
احمد کسی زماں ومکاں کا نہیں ہوں میں
لمحوں کی دیر ہے جو سرِ آبشار ہوں
کیسے کھڑا ہوں کس کے سہارے کھڑا ہوں میں
اپنا یقین ہوں کہ تیرا اعتبار ہوں
ہے واہموں کا تماشہ یہاں وہاں دیکھو
ہمارے پاس مکمل خدا کہاں دیکھو

احمد شناس کی غزلوں میں موضوعات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے مشہور نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری یوں رقمطراز ہیں:

''احمد شناس کے یہاں حمایت، رومانیت، حسن پرستی اور فطرت اور انسان کی رشتگی کی نشاندہی کرنا مشکل نہیں۔ ساتھ ہی ان کے کئی اشعار میں فکر ونظر کی پرتیں بھی کھلتی نظر آتی ہیں۔ وہ موجودہ انسان کے خوابوں کی شکست، اقدار شکنی اور اخلاقی پستی کا گہرا احساس رکھتے ہیں۔ نتیجتاً ان کے ہاں محرومی اور بیگانگی سے واسطہ پڑتا ہے مگر وہ زندگی کے روشن اور امید افروز پہلوؤں سے انحراف نہیں کرتے۔ اس طرح سے ان کی غزل ایک نئی آواز کا احساس دلاتی ہے۔'' ۴۳

دنیا میں انسان اپنے نام کے علاوہ اپنے مذہب سے بھی پہنچانا جاتا ہے اور ہر انسان اپنے مذہب سے اپنی فکر اور فہم کے مطابق مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن ہر انسان کی ذہنی اور فکری وابستگی دوسرے انسان سے مختلف ہوتی ہے۔ بیشتر لوگ بس بنیادی چیزوں پر اکتفا کر کے مذہب کو سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر جو لوگ ذہنی اور شعوری طور پر زیادہ بیدار اور حساس ہوتے ہیں وہ مذہب سے صرف جذبات کے حد تک ہی واسطہ نہیں رکھتے بلکہ اس کی باریکیوں کو سمجھنے اور زندگی میں اس کی اہمیت اور افادیت کو بھی بڑے غور سے سمجھنے کی مسلسل سعی کرتے ہیں۔ احمد شناس کے کلام کے مطالعے سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ وہ مذہب سے گہری مناسبت رکھتے ہیں۔ وہ مذہب کو انسانی وجود کا لازمی جزو خیال کرتے ہیں۔ احمد شناس ایک انسان کو نہ صرف ظاہری طور پر مذہب کا پیرو کار دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ باطنی طور پر بھی اس کی تعلیمات کو اپنانے کے خواہاں ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ مذہب کا زیادہ تعلق ظاہر کے بجائے اندروں

سے ہوتا ہے اور جو یہ چیز سمجھ گیا وہ کامیاب ہوگیا۔ اس بات کی گونج ان کے درجہ ذیل اشعار میں صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔

وہ اذانِ ذات کا اللہ اکبر
اب کسی مسجد کا چھوٹا سا خدا ہے
جہالت روگ تھا جو دل کے اندر
وہی مذہب ہمارا ہوگیا ہے
وہ خدا کے واسطے بولا ہمیشہ
اس لئے مذہب سے خارج ہوگیا ہے
ہم نے کیوں آپسی اضداد کے نکتے ڈھونڈے ؟
ہم نے تو خود کو شیر وشکر کرنا تھا
میں سامنے ہوں وہ میرے اندر چھپا ہوا ہے
میں اُس کی تخلیق ہوں وہ میرے خیال جیسا

دنیا میں انسان مذہب کے حوالے سے اپنے آپ کو کسی مخصوص نظریہ یا گروپ سے وابستہ ہوکر اپنی مذہبی کاوشوں کو اس گروپ یا نظریہ کے بنائے ہوئے اصولوں تک محدود رکھتا ہے۔ احمد شناس بھی اس چیز کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور اس کو گرہوں اور فکروں تک محدود کرنا بڑی ناانصافی ہے۔ موصوف بھی زندگی میں ایک طویل عرصے تک اپنے آپ کو ایک مخصوص عقیدے سے منسلک تھے لیکن ان کی زندگی میں مذہب کو لیکر بیداری اس وقت پیدا ہوئی جب انہوں نے مولانا وحید الدین خان کی کتب کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ مولانا موصوف اسلام کو عالمی اور آفاقی مذہب سمجھتے ہیں اور تمام دنیا میں بسنے والے لوگوں کو آپس میں جوڑنا ان کا مشن ہے۔ اس ضمن میں ان کی لکھی کتابوں کے مطالعے سے احمد شناس کے ذہن کے دریچے کھل گئے اور ان کی عملی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اپنی اس تبدیلی کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں بھی ایک مخصوص دنیا کا آدمی تھا۔ ادب کی دنیا شعروں کی دنیا میں نے اپنے آگے پیچھے ایک حصار کھینچ رکھا تھا۔ کچھ متعین ناموں اور شکلوں کا دھار، کچھ مخصوص آوازوں اور رنگوں کے عادی ہو چکے تھے۔ میری کتابی دل چسپیاں ایک متعین دائرے کے اندر ہی گردش کرتی تھیں اور میں یہ سمجھتا تھا کہ یہی ساری حقیقت ہے اور یہی ساری کائنات۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو

اس مخصوص دائرے سے باہر نکل کر دیکھنے اور سمجھنے کو کوشش نہیں کی تھی۔ جب تک کہ میری نظروں سے مولانا وحید الدین خان کی کچھ فکر انگیز کتابیں نہیں گزری تھیں۔ جنھوں نے میرے ذہن کے عقب میں کھلنے والے بند دروازوں پر مسلسل دستک دینا شروع کر دیا تھا۔" ۳۵

احمد شناس کی غزلوں میں ایک اور توانا موضوع جسم اور روح کی پہنچان ہے۔ انسان اس مادیت کے دور میں اپنا پورا زور جسم پر صرف کرتا ہے۔ جسم کی ضروریات کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے جب کہ روح کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وقت ہی نہیں ہے۔ روحانی سکون حاصل کرنا آج کے انسان کے لئے محال سا ہو گیا ہے۔ احمد شناس کے یہاں جسم کے بجائے روحانی شعور کی زیادہ اہمیت ہے۔ کیونکہ جسم مٹی ہے اور اصل تو روح ہے۔ اس فلسفے کو احمد شناس اپنی بعض غزلوں کے اشعار میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

بدل کے دیکھو کبھی بستوں کی دنیا کو
بدن کو روح کے خانے میں ڈال کر دیکھو

جسم کے سارے تقاضے ہیں ادھورے احمد
یہ تصور کبھی بھر پور نہیں ہوسکتا

جسم بھوکا ہے تو ہے روح بھی پیاسی میری
کام ایسا ہے کہ دن رات کا زندہ ہوں

جسم اور روح، مذہب اور عقیدت، ظاہر اور باطن کو غزلوں میں موضوع بنا کر پیش کرنے میں احمد شناس نے ایک نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر قدوس جاوید رقمطراز ہیں:

"احمد شناس کی غزلیں سادہ اور لطیف روحانیت اور پر آشوب عصری سماجی و ثقافتی صورت حال کے حوالے سے انسان کو سیاسی انتشار، مذہب کی جاہلانہ تو ضیح، ایمانی اور ایقانی زوال وجودی بحران کے جبر سے نبرد آزما ہونے کا شعور جگاتی ہیں۔ کیونکہ ان کی غزلوں سے شعور جسم کی نہیں بلکہ شعور روح کی صدائیں آتی ہیں۔" ۳۶

احمد شناس کی غزلیں جدید غزل کی نمائندہ ہیں۔ کیونکہ ان کی غزل کی شعریات روایتی غزل کی شعریات سے مختلف ہے۔ ان کا اظہار بیان بالکل جدید ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ احمد شناس روایت سے واقف نہیں۔ وہ غزل کی روایات سے پوری طرح شناسا ہیں اور ان روایات کا احترام بھی کرتے ہیں

لیکن عصر حاضر میں جو روپ اختیار کر لیا ہے اور اسلوب بیان کا جو طریقہ جدید غزل گو شعراء نے اختیار کیا ہے احمد شناس بھی اسی طریقے کو پسند کرتے ہیں اور اسی طرز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ جدید غزل کو برتنے میں احمد شناس نے نہ صرف ریاست بلکہ پورے ملک میں ایک شناخت قائم کی ہے۔ بقول پروفیسر قدوس جاوید:

''بیسویں صدی کی آخری اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک آتے آتے غزل کی شعریات کی تشکیل جدیدیت کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے آثار ناصر کاظمی، شجاع ربانی، پروین شاکر، کمار اشک، ظفر اقبال اور حکیم منظور وغیرہ کے یہاں نمایاں ہو چکے تھے لیکن جن نئے شاعروں نے اس عمل کو رفتار اور معیار عطا کی۔ ان میں عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، رفیق راز اور شفق سوپوری کے ساتھ احمد شناس کا بھی ایک اہم کردار رہا ہے۔'' ۳۷

متذکرہ بحث کو احمد شناس کے ان اشعار سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے:

خود فراموشی کے جنگل سے اُٹھے گی
آگہی بھی صبح صادق کی ہوا ہے
اب نغموں کے دیپک کون جلائے گا
اب بنجارے پکے گھر میں رہتے ہیں
ابھی کھلنے کو ہے در آسمان کا
ابھی اظہار کو پیاسا بشر ہے

احمد شناس جدید غزل کو برتنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے اپنے احساسات اور خیالات کے اظہار کو سادگی، سچائی اور اثر انگیزی کے ساتھ اپنے اشعار میں ڈھالا ہے۔ ان کی غزلوں میں نادر تشبیہات اور استعارات کے علاوہ نئی نئی علامتیں اور ترکیبیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے کلام میں لفظیات کا ایک مخصوص نظام ملتا ہے جو ان کی انفرادیت پر دلالت کرتا ہے۔ احمد شناس کی غزلوں میں ردیف، قافیہ کا بھی ایک منفرد اور دلکش برتاو نظر آتا ہے۔ ان کی زیادہ تر غزلیں طویل ہیں۔ بحروں کے انتخاب میں بھی انہوں نے فنکارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ چھوٹی اور بڑی دونوں طرح کی بحور کو بڑی چابکدستی سے استعمال میں لایا ہے۔ بعض ردیفیں ایسی بھی ان کی غزلوں میں در آئیں ہیں جو بالکل نئی اور عصری حسیت کی غماز ہیں۔ جیسے ''گورکھ دھندا''، بچے، صورت، دیکھو، دیا، قیامت، خوشبو آئے گی، اداس، گم، گشتہ، زمینوں میں، آئینہ، لمحوں کی، آخرش، سفر، ماں، مانگیں، نہ پہنچا، وغیرہ علاوہ ازیں

ہندی الفاظ کا استعمال بھی احمد شناس نے موقع محل کی مناسبت سے کیا ہے۔اشعار دیکھئے:

اس نے مجھ سے ذات کا پورا حصّہ مانگا تھا
اور مجھے در پیش رہا ہے سانسوں کا گرداب سفر

میں جب نفی کی لکیر رشتوں پر کھینچتا ہوں
تو پھوٹ پڑتی ہے دار سے آشنائی کی خوشبو

گھر سے جب نکلا تھا میں سرسبز تھیں پگڈنڈیاں
اب میرے گھر کی طرف جاتی ہیں سب راہیں اداس

تمنا آسمان در آسمان لکھی ہے اس نے
وہ ان دیکھی ہزاروں کہکشاں بھی قیامت

خواب کی صورت دنیا میرے ہاتھ نہ آئی
ہار گیا میں ایک سہانا گورکھ دھندا

احمد شناس کی غزلوں میں الفاظ اور تراکیب کے برتاو اور تشبیہات اور استعارات کے منفرد استعمال کے پیش نظر پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''احمد شناس نے مابعد جدید معاصر سماجی وثقافتی معاشی وسیاسی ڈسکورس کے حوالے سے اپنے تجربات ومشاہدات اور کیفیات وتاثرات کی لسانی تشکیل کی ہے۔احمد شناس نے تازہ کار مترنم اور معنی خیز الفاظ وتراکیب تشبیہات و استعارات کے برتاو میں ایسی فن کارانہ مہارات کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کی غزلوں کے اکثر وبیشتر اشعار ذہن وضمیر میں فوراً اتر جاتے ہیں۔'' ۳۸

ایک شاعر کا مطالعہ اور مشاہدہ جتنا وسیع ہوگا اتنا ہی وہ زندگی اور اس سے وابستہ مختلف پہلوؤں کو اپنے کلام میں منعکس کر سکتا ہے۔احمد شناس نے بھی اپنے تخیل، مشاہدے اور تجربے کی بدولت ایک منفرد شعری کائنات خلق کی ہے۔لیکن انہوں نے اپنے محسوسات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے لئے علامتی رنگ کو پسند کیا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ دوسرے علوم اور ادب دو مختلف چیزیں ہیں۔اس حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تخلیقی ادب زندگی کے دوسرے علوم سے مختلف ایک چیز ہے۔دوسرے علوم میں چیزوں کو براہ راست معلومات کا موضوع بنایا جاتا ہے مگر شاعری میں مشاہدے میں آنے والی چیزیں زیادہ تر علامتی اظہار کا ذریعہ ہوتی ہیں۔''

احمد شناس نے اردو غزل میں اپنے منفرد لب ولہجہ سے ایک اہم مقام حاصل کیا ہے۔ان کے کلام میں فن اور فکر کے وہ تمام لوازمات موجود ہیں جو جدید غزل کے لئے درکار ہیں۔دورِ حاضر میں جو مسائل انسان کو درپیش ہیں ان کی عکاسی احمد شناس نے مخصوص اسلوب میں نادر تراکیب اور علائم کے سہارے کی ہے۔موصوف کی غزلوں میں اندازِ بیان اور لب ولہجہ کے پیش نظر پروفیسر محمد نعمان خان یوں رقمطراز ہیں:

''احمد شناس جدید نسل کے جدید لب ولہجہ کے باکمال شاعر ہیں۔انہوں نے اپنے نجی احساسات و خیالات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے عصر کے حالات کو بھی سادگی، سچائی اور اثر انگیزی کے ساتھ اپنے اشعار میں ڈھالا ہے۔'' ۱۰

بہر کیف ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ احمد شناس ریاست جموں وکشمیر کے ان غزل گو شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔جنہوں نے اپنی فنی اور فکری بصیرت کے بل پر پورے برصغیر میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔احمد شناس کا یہ شعری سفر ہنوز جاری ہے اوران کی ذات سے امید ہے کہ آئندہ بھی وہ اپنی تازہ شعری تخلیقات سے اردو غزل کے گلستان کو مہکاتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔(ماہنامہ ''شیرازہ''، سرینگر جموں وکشمیر میں اردو شاعری نمبر، جلد ۵۲، شمارہ ۷۔۶، ص:۹۱)

۲۔(عرش صہبائی صاحب سے ایک ملاقات کے دوران، مورخہ ۱۵ اپریل، ۲۰۱۶)

۳۔(بحوالہ کرن کوشل ٹھاکر، عرش صہبائی، اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، ص:۱۷)

۴۔(پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو حصّہ سوم، ص:۷۴)

۵۔(ڈاکٹر عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل، ص:۴۱)

۶۔(شکست جام، ص:۴)

۷۔(پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو حصّہ سوم، ص:۷۲)

۸۔(پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو حصّہ سوم، ص:۷۲)

۹۔(میر امتیاز، ایک شخص ادارہ، نایاب، ص:۷)

۱۰۔(کوشل کرن ٹھاکر، عرش صہبائی اردو غزل کی عہد ساز شخصیت، ص:۱۶۱)

۱۱۔(خورشید کاظمی، ایوان اردو، دہلی، جولائی ۲۰۰۹)

۱۲۔(محمد آصف ملک علیمی، عاصی شخص اور شاعر،ص:۲۸)

۱۳۔(ڈاکٹر عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل،ص:۱۲۔۱۳)

۱۴۔(پروفیسر شہاب عنایت ملک، پیش لفظ، عاصی شخص اور شاعر،ص:۱۱)

۱۵۔(اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، ڈاکٹر مختار الحق،ص:۷۴۔۷۵)

۱۶۔(عاصی شخص اور شاعر، محمد آصف ملک علیمی،ص:۹۵)

۱۷۔(ڈاکٹر وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج،ص:۲۱۲)

۱۸۔(پروفیسر شہاب عنایت ملک، پیش لفظ، عاصی شخص اور شاعر، محمد آصف ملک،ص:۱۲)

۱۹۔(ڈاکٹر شفق سوپوری، جہات،ص۱۲)

۲۰۔(سہ ماہی سرسبز، بیتاب نمبر،ص:۵۵)

۲۱۔(دوماہی ''تعمیر'' سرینگر انتخاب نمبر، ستمبر ۱۹۹۹ء،ص:۱۸۱)

۲۲۔(شباب للت، سرسبز،ص:۷۹)

۲۳۔(ارمان نجمی، سرسبز،ص:۱۳۳)

۲۴۔(بلراج کومل، موج ریگ،ص:۱۳

۲۵۔(افضل شاہین، سرسبز،ص:۱۱)

۲۶۔(امین بنجارا، موج ریگ، فلیپ سے)

۲۷۔(موصوف کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران، تاریخ ۱۵ مارچ ۲۰۱۷)

۲۸۔(موصوف سے ایک ملاقات کے دوران، مورخہ ۱۵ مارچ، ۲۰۱۷)

۲۹۔(شعور بصیرت، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی،ص:۷۸)

۳۰۔(شعورِ بصیرت، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی،ص:۷۷)

۳۱۔(احمد شناس، پس آشکار،ص:۲۴)

۳۲۔(احمد شناس، پس آشکار،ص:۲۴)

۳۳۔(ڈاکٹر عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل،ص۵۷۴)

۳۴۔(پروفیسر حامدی کاشمیری، پسِ آشکار، فلیپ)

۳۵۔(احمد شناس، پس آشکار،ص:۲۷)

۳۶۔(پروفیسر قدوس جاوید، صلصال، ص:۱۲)
۳۷۔(پروفیسر قدوس جاوید، صلصال، ص:۱۴)
۳۸۔(پروفیسر قدوس جاوید، سہ ماہی ''انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴، ص:۱۷۸)
۳۹۔(احمد شناس، صلصال، ص:۳۷)
۴۰۔(پروفیسر محمد نعمان خان، سہ ماہی عالمی انتساب، سرونج، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ ص:۱۶۸)

☆☆☆☆☆☆☆

باب چہارم

جموں و کشمیر میں اُردو غزل کا مستقبل اور امکانات

ریاست میں اُردو غزل کا سنہرا دور تقسیمِ ہند کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا اثر ریاست کے قلم کاروں پر بھی پڑا ہے۔ ادب کی اہم تحریکات ور جحانات کے ساتھ ریاست کے ادباء وشعراء نے بھی منسلک ہو کر اپنی ذہنی وابستگی کا اظہار اپنے کلام میں پیش کیا ہے ۔اس کے علاوہ ریاست کے مختلف حالات وحادثات کا اظہار بھی یہاں کے شعراء کا اہم موضوع رہا ہے۔
اس دوران جن شعراء نے ریاست میں اُردو غزل کی نمائندگی کی ہے ان میں حکیم منظور، حامدی کاشمیری، عرش صہبائی، ہمدم کاشمیری، مظفر ایرج، ودیا رتن عاصی، عابد مناوری، فاروق نازکی، رفیق راز، ایاز رسول نازکی، پرتپال سنگھ بیتاب، احمد شناس، بلراج بخشی، خالد بشیر احمد، فرید پربتی، شفق سوپوری، فاروق مضطر، تنویر بھدرواہی اور نذیر آزاد غیرہ اہم نام ہیں۔ جن کا تذکرہ گزشتہ ابواب میں کیا جاچکا ہے۔

مذکورہ بالا شعراء کی رہنمائی اور رہبری میں ریاست جموں وکشمیر میں اُردو غزل گو شعراء کی ایک نئی نسل پچھلے دو ڈھائی عشرے سے منظرِ عام پر آئی ہے، جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اپنے شعری وجود کا احساس دلانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور جو ریاست جموں وکشمیر میں اُردو غزل کے مستقبل کے حوالے سے اہم نام ہو سکتے ہیں۔ ایسے شعراء کی تعداد بھی یہاں اچھی خاصی ہیں۔ ان نئے شعراء کا کلام ریاست کے اخبارات ورسائل میں متواتر طور سے شائع ہوتا رہتا ہے، اور بعض کا کلام ملک کے اہم اور موقر جرائد میں بھی نظر آتا ہے۔ اس بات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کا مستقبل کس حد تک تابناک اور روشن ہوگا۔

ریاستی سطح پر اُردو غزل کی نئی نسل کے شعراء میں جن حضرات کا نام اور کام اہمیت کا حامل ہے، ان میں شیخ گلزار، پرویز مانوس، اشرف عادل، لیاقت جعفری، خالد کرار، سلیم ساغر فاروق احمد فاروق، علمدار عدم، غضنفر علی، غلام نبی غافل، یاسین سنبلی، اقبال صدیقی، سبطِ رضا، ع ع عارف، اقبال صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔

شیخ گلزار

شیخ گلزار کا تعلق کشمیر کے زعفران زار علاقہ پانپور کے گاؤں سامبورہ سے ہے۔ موصوف ۴ جولائی ١٩٥٦ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کرنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی شیخ گلزار اُردو شعر وادب سے خصوصی رغبت رکھتے ہیں۔ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ

آپ شعری ذوق وشوق بھی رکھتے ہیں۔گلزار اپنے جذبات اور مشاہدات کو ظاہر کرنے کے لیے شاعری کو وسیلہ بناتے ہیں۔گلزار کا کلام گزشتہ دو تین دہائیوں سے ریاست کے اہم اخبارات اور رسائل کے علاوہ ملکی سطح کے جرائد میں بھی چھپتا رہتا ہے۔علاوہ ازیں مقامی سطح پر منعقد کئے جانے والے مشاعروں میں بھی مدعو کئے جاتے ہیں۔شیخ گلزار نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے،لیکن صنف غزل کی لوچ و لچک نے انہیں خاص طور پر گرویدہ کیا ہے۔دیگر اصناف کے مقابلے میں صنف غزل میں ہی زیادہ تر اپنے جذبات اور تجربات کو پیش کرتے ہیں۔شیخ گلزار کے اب تک دو مجموعے ''سایہ دھوپ کا'' اور ''لمحے اندھیروں کے'' کے ناموں سے منظر عام پر آچکے ہیں،جن کو ادبی حلقوں میں اچھی پزیرائی ملی ہیں۔

شیخ گلزار کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ موصوف اردو کی کلاسیکی قدروں کے امانت دار بھی ہیں اور جدید عصری حسیت کے روادار بھی۔آپ کی شاعری میں روایتی موضوعات کی بوقلمونی بھی ہے اور دور حاضر کے نئے اور اور تازہ موضوعات کی فراوانی بھی۔گلزار صنفِ غزل کے فنی لوزمات سے اچھی طرح واقف ہیں۔وہ اپنے داخلی جذبات واحساسات کو غزل کا پیرہن عطا کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نیا اور اچھوتا ہے۔اس ضمن میں نمونے کے طور پر چند اشعار دیکھئے

چھوڑ کے مجھ کو جانے کی ضد مت کرنا
اپنوں کو ٹھکرانے کی ضد مت کرنا

سنتا ہوں مجھ کو چھوڑ کے مایوس ہے بہت
قدرت خدا کی دیکھ ،بھلا نہ سکا مجھے

بدلتے وقت کے تیور عجب ہیں
کہ اب جسموں کے اوپر سر عجب ہیں

گلزار کی شعری اور تخلیقی زبان نہایت ہی سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ان کا اسلوب جدت اور ندرت کا بہترین نمونہ ہے۔وہ اپنے محسوسات کو راست انداز میں بیان کرنے کے قائل ہیں۔گلزار نامانوس اور ثقیل الفاظ کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ان کے یہاں روزمرہ کی سلیس اور آسان زبان میں سنجیدہ اور پیچیدہ مضامین بھی ادا ہوئے ہیں۔شعری محاسن کا استعمال بھی حسب ضرورت فن کارانہ چابکدستی سے کرتے ہیں۔

ایک مدت سے سوچتا ہوں میں
ختم کب انتظار ہوجائے

شہر آباد ہیں پر لوگ سارے

سدا روتے ہیں رونا زندگی کا
شہر سارے بہت آباد ہوں گے
مگر دل ہیں کہ جو برباد ہوں گے

شیخ گلزار کا سیاسی اور سماجی شعور بھی پختہ ہے۔ وہ اپنے گرد ونواح کے حالات سے باخبر ہیں۔ وادی کشمیر کے گذشتہ دو تین دہائیوں کے ابتر حالات وحادثات نے ہر ذی حس انسان کو متاثر کیا ہے۔ شیخ گلزار بھی اپنے وطن عزیز کے ان روح فرسا واقعات کا پر درد لہجے میں اظہار کرتے ہیں۔

قیامت خیز ہیں حالات اب کے
کہاں قابو میں ہیں جذبات اب کے
لہو کی بو ہے پانی میں، ہوا میں
کہ اب باقی نہیں خوشبو صبا میں
خیر خواہ کتنے بھی ہوں گے پر یہاں
موت کی تلوار کے سائے میں ہیں
جس کو بھی دیکھتا ہوں میں حیران بہت ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان بہت ہے
اک روز قیامت کا ہو گا حشر بپا لیکن
تم روز قیامت کا احساس دلاتے ہو

شہر، لہو، بستی، گھر، آگ، زندگی وغیرہ جیسے الفاظ کو گلزار نے علامتوں کے طور پر برتا ہے۔ اگرچہ ان الفاظ کا استعمال اکثر معاصر غزل گو شعراء نے کیا ہے۔ لیکن شیخ گلزار نے انہیں نئے معنوی جہات عطا کئے ہیں۔ جس سے ان کے فکری میلانات کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں جدید حسیت اور عصری آگہی سے تعلق رکھنے والے متعدد موضوعات کو فنی ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شیخ گلزار کی غزل گوئی کے بارے میں ڈاکٹر اشرف آثاری لکھتے ہیں:

''شیخ گلزار کی شاعری میں اسلوب وبیان کی سادگی اور پُر کاری بھی ہے، عصری مسائل ومشکلات کا فہم وادراک بھی ہے اسلاف کی روایات سے استفادہ بھی ہے اور جدید تقاضوں اور قاری کی ضرورتوں کا انہیں بھر پور احساس بھی ہے۔ زندگی سے متعلق حقائق کا سچا اظہار سماجی شعور کی پختگی، مسائل کے افہام وتفہیم کے ضمن میں بالغ النظری اور ہم آہنگی کی موجودگی

،معاشرتی مسائل پر گہری نظر جیسے سب اوصاف ان کی شاعری میں موجود ہیں اور پھر ان سب چیزوں کو دامن غزل کی وسعتوں میں سمانا اور جگہ دینا بھی ایک ہنر ہی تو ہے'' [1]

شیخ گلزار جدید تر نسل کے غزل گو شعراء میں جس رفتار سے شعر کہہ رہے ہیں اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں ریاست کے اہم غزل گو شاعر کہلائیں گے۔

☆☆☆☆

پرویز مانوس

ریاست جموں و کشمیر میں نئی نسل کے غزل گو شعراء میں ایک اہم نام پرویز مانوس کا ہے۔ مانوس اپنے نازک جذبات اور احساسات کو غزل کی زبان سے اظہار میں لاتے ہیں۔ پرویز مانوس کا اصلی نام پرویز احمد بٹ ہے۔ آپ ۶ مارچ ۱۹۶۶ء کو سرینگر کے محلّہ چھانپورہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کی ہے۔ آپ کے والد فوج میں ملازم تھے۔ پرویز مانوس ابھی پانچویں جماعت میں ہی تھے کہ ان کے والد کا تبادلہ ریاست کے سرحدی ضلع پونچھ ہو گیا۔ مانوس اپنے والد کے ہمراہ وہیں منتقل ہو گئے، اور باقی تعلیم پونچھ میں ہی حاصل کی۔ پونچھ کے ادبی ماحول نے پرویز مانوس کے اندر چھپے تخلیق کار کو متحرک کیا اور وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار غزل، نظم، افسانہ، ڈرامہ، ناول وغیرہ جیسی اہم اصناف میں یکساں طور پر کرتے ہیں۔ البتہ غزل موصوف کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ اور اس کو برتنے میں غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ مانوس کی پہلی غزل ۱۹۸۹ء میں روزنامہ ''ہند سماچار'' میں شائع ہوئی ہے۔ جب سے یہ سلسلہ آج تک بدستور جاری ہے۔ پرویز کے اب تک تین شعری مجموعے ''بیتے لمحوں کی سوغاتیں''، ''موسم اڑان کا'' اور ''چاند لمس گلاب'' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کا کلام تواتر سے ہندستان کے موقر ادبی جرائد، جن میں، آجکل، شاعر، پاسبان، خاتون مشرق، ایوان اردو، شیرازہ وغیرہ میں چھپتا ہے۔

جہاں تک پرویز مانوس کی غزلوں میں موضوعات کا تعلق ہے، تو اس حوالے سے جو موضوع ان کی شاعری کا روح رواں ہے وہ عشق ہے۔ عشق اور اس کی بے شمار وارداتیں پرویز مانوس کی غزلوں میں ہر سو نظر آتی ہیں۔ مانوس کے ابتدائی شعری مجموعے ''بیتے لمحوں کی سوغاتیں'' کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ رومان پسند شاعر ہیں۔ عشق و عاشقی کی مختلف کیفیات کی پر لطف عکاسی ان کے ابتدائی دور کی غزلوں میں میں جا بجا نظر آتی ہے۔

بخشی ہیں جس نے دھڑکنیں الفت کے نام کی
بھولوں گا کس طرح اس جانِ جگر کو میں
جب سے اس ناز آفریں نے دل پہ قبضہ کر لیا
میں نے پایا عشرتوں سے میرا دامن بھر گئی
اور بڑھ جائے گا چاہت کا مزا
جس گھڑی پہرے لگیں گے پیار پر
رنگینیاں، شباب، لطافت، نزاکتیں
یہ سب تمہارے حسن کے پیکر میں ڈھل گئے

پرویز مانوس کی غزلوں میں یاد، ہجر، غم، پہرہ، خواب وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ یہ الفاظ عشق کے اہم تجربات کی پیشکش میں ان کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں کیوں کہ جب عاشق معشوق سے روٹھ جاتا ہے یا کسی وجہ سے جدا ہو جاتا ہے، تو وہاں اس کی یادوں کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ پرویز مانوس کے کلام سے بھی اس طرح کے ایک عاشق کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

یاد اسے بھی ہوں گی شاید پہلے پیار کی وہ باتیں
رات گئے تک تنہائی میں جو مجھ کو تڑپاتی ہیں
تنہائی سے ڈر کر جب بھی لپٹا ہوں دیواروں سے
"بیتے لمحوں کی سوغاتیں" میرا دل بہلاتی ہیں
توڑ کے سارے عہدوں وپیماں ساجن. تو بدلا لیکن
کر کے میری یاد وفائیں اک دن وہ پچھتائے گی
گر تم نقوش پیار کے دل سے مٹا بھی دو
یادوں کو تیری دل میں بسایا کریں گے ہم
آئے گی یاد ہجر میں جب بھی تیری ہمیں
چھپ چھپ کے روز اشک بہایا کریں گے ہم
ہجر کی راتیں، درد، تڑپ اور یہ بے تابی بے چینی
تیری فرقت میں جھیلے جو وہ سارے آلام لکھوں

اگر چہ پرویز مانوس کے کلام میں عشق ایک موضوع کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ

مطلب نہیں کہ وہ صرف اسی میں الجھ کر رہ گئے ہیں، بلکہ ان کے یہاں دیگر جدید موضوعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ جدید زمینی حقائق اور عصری حسیت سے واقف ہیں۔ ان کا عہد جن حالات وحوادث سے گزر رہا ہے، اس پر پرویز مانوس گہری نظر رکھتے ہیں۔ محرومی، تنہائی، بے یقینی، عدم تحفظ، مایوسی، مذہبی تعصب اور اخلاقی قدروں کی شکست وریخت وغیرہ ایسے مسائل ہیں، جو آج کے دور کے انسان کی زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔ ان معاملات کو پرویز مانوس نے فنی اور فکری بلندی کے ذریعے شعری لباس عطا کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں نیاپن اور تازگی پائی جاتی ہے۔ پرویز ہر طرح کے موضوع اور مضمون کو ادا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اشعار دیکھئے۔

رستے میں پڑی لاش میں بھی قوم کا رہبر
تاجر کی طرح سودوزیاں دیکھ رہا ہے
اب کھال میں انساں کی پھرتے ہیں بھیڑئے
اپنوں کے قافلے میں بھی اغیار بہت ہیں
بارود کے اک ڈھیر پہ بیٹھی ہے یہ دنیا
لگتا ہے اب قیامت کے آثار بہت ہیں

محبت کے نغمے گانے والا شاعر پرویز مانوس امن وسکون اور بھائی چارے میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنے گردونواح کے ماحول کو دیکھ کر رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں، اور اپنی غزلوں میں اس نفرت بھرے دور میں لوگوں کو آپسی اختلافات کو دور کرنے اور راحت وسکون کے ساتھ جینے کا پیغام دیتے ہیں۔ سیاست اور سیاسی بازی گروں پر طنز بھی کرتے ہیں۔ اپنے وطن کے پرآشوب حالات کی عکاسی بڑی دردمندی سے کرتے ہیں:

سونی آنکھیں دیکھتی ہیں جابجا لاشوں کے ڈھیر
کس نے سوچا کیوں ہوا یہ وادی کشمیر میں
جان یہ کس کی گئی ہے کس کا بہتا ہے لہو
کوئی بھی لیڈر نہیں کہتا ہے یہ تقریر میں
راکھ، لاشیں، خون، آنسو دیکھ کر ہوں سوچتا
کس نے کھیلی خون کی ہولی یہاں کشمیر میں
اب اس لیے بچوں کو کھلونے نہیں ملتے
اس شہر میں اسلحہ کے بازار بہت ہیں

وہ تیرا کشمیر جو تھا خطۂ جنت نشان
بن گئے ہیں اب وہاں بنکر ہی بنکر یاد کر

پرویز مانوس کی زبان نہایت ہی سادہ اور سہل ہے۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے تشبیہات ،استعارات اور علامتوں کا استعمال بڑی سلیقہ مندی سے کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی ایک اور خوبی ترنم اور نغمگی ہے۔ سلاست اور روانی سے ان کے یہاں عجیب غنائیت پیدا ہوئی ہے۔ پرویز مانوس کی غزل بجا طور پر قدیم وجدید شعری اظہار کا دلکش امتزاج ہے۔ جہاں ایک طرف ان کی غزل میں حسن وعشق کی رنگارنگی ملتی ہے تو وہی دوسری جانب موجودہ دور کے سیاسی اور سماجی صورت حال کی پردرد عکاسی بھی نظر آتی ہے۔ مانوس کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے خواجہ محمد دین بانڈے رقمطراز ہیں:

''مانوس کے پاس نئے استعارے اور جاندار تلمیحات برتنے کا طریقہ بھی ہے اور وہ ہر بات غزل میں بڑے متاثر کن انداز میں کہنے کا ہنر جانتا ہے۔ دلنشیں انداز بیان کے ساتھ ساتھ اس کے کلام میں سادگی، شگفتگی ،سلاست ،تغزل اور روانی بھی موجود ہے۔ مانوس کی شاعری جدیدیت کی ہمنوا ہونے کے باوجود روایت کی قدردان بھی ہے۔ وہ روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک پل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔'' ؎۲

پرویز مانوس ابھی جوان ہیں ،اور جس انداز اور رفتار سے وہ اردو شعروادب تخلیق کر رہے ہیں۔ اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی دکھا رہے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مستقبل میں ریاست کے اہم شعراء میں شمار ہونگے۔

☆☆☆☆

اشرف عادل

اشرف عادل وادئ کشمیر کی نئی نسل کے غزل گو شعراء میں بہت ہی فعال اور سرگرم نظر آتے ہیں۔ انہیں اردو زبان اور شعروادب سے کالج کے زمانے سے رغبت پیدا ہوئی ہے۔ جو بعدازاں تخلیقیت میں بدل گئی اور وہ باقاعدہ مشق سخن کرنے لگے۔

شیخ محمد اشرف نام اور اشرف عادل قلمی نام ہے۔ آپ سرینگر کے محلہ خانیار میں ۱۹۶۶ء میں ایک متوسطہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اشرف عادل نے ابتدائی تعلیم مقامی سرکاری اسکول میں حاصل کرنے کے بعد اسلامیہ کالج حول سرینگر سے بی۔کام کا امتحان پاس کیا ہے۔ بی۔کام کرنے کے بعد آپ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ امتحانات میں ملازم ہوگئے اور آج بھی موصوف مذکورہ شعبہ میں اپنے فرائض

انجام دے رہے ہیں۔

اگرچہ اشرف عادل غیر ادبی ماحول میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن کالج کے زمانہ طالب علمی نے انہیں اردو زبان وادب کے قریب کر دیا اور وہ کالج میں منعقد کی جانے والی ادبی محفلوں میں حصہ لینے لگے۔ یہاں سے ان کے اندر چھپے تخلیق کار کو تحریک ملی، اور وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے الفاظ کو موزوں کرنے لگے۔ اس سلسلے کی شروعات ۹۰ء کے ابتدائی برسوں میں ہوئی ہے۔ وہ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت جلد مختلف اصناف سخن میں اپنے خیالات کو آراستہ کرنے لگے۔ عادل کی پہلی غزل ماہنامہ ''شاعر'' ممبئ میں ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے آج تک اشرف عادل نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا ہے۔ اور وہ مسلسل اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اشرف کا کلام ریاست کے نامور اخبارات اور رسائل کی زینت بننے کے علاوہ ملک کے شہرت یافتہ جرائد میں بھی مسلسل چھپتا رہتا ہے۔ 'شاعر کے علاوہ، زریں شعاعیں، انتساب، کسوٹی، سب رس، ابر، فنون، ترکش، شیرازہ، اسباق، پیامِ اردو' وغیرہ جیسے اہم ادبی رسائل میں عادل کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے۔ اشرف عادل نے اپنے ابتدائی دور کے کلام کی شیرازہ بندی کر کے ایک مجموعہ کلام ''لذتِ گریہ'' کے نام سے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ کو کافی پسند کیا گیا۔ اشرف عادل نے اردو ادب کے کلاسیکی شعراء میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ داغؔ اور آتشؔ وغیرہ کے ساتھ ساتھ جدید غزل گو جیسے ساغر صدیقی، ناصر کاظمی، شہر یارِ اور عرفان صدیقی وغیرہ کے کلام کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ جس سے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں میں نئی جان پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اشرف عادل نے وادی کے نامور شاعر مرحوم فرید پربتی سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ اس عمل سے ان کی شاعری کو کسی حد تک صحیح سمت ملی ہے۔

اشرف عادل کے یہاں مروجہ شعری میلانات کی پیش کش نئے انداز اور تازہ لہجے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے کلام میں حسن وعشق اور کیف وسرور کے واقعات کی تصویر کشی مخصوص لفظوں میں ہوتی ہے۔ وہ اردو کی کلاسیکی شاعری کے دلدادہ ہیں اور اساتذہ کے کلام کے مطالعے نے انھیں بعض ایسے اشعار کہنے پر مائل کیا جو ندرت کاری اور تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ عادل کی غزلوں میں روایتی موضوعات نئے لفظوں اور نئے انداز میں نظر آتے ہیں۔

موسم گل نہ مجھ کو بھاتا تھا
تیری چاہت نے خوش مزاج کیا

دل آشفتہ تیر کھا کے گرا
زخم پارینہ ہے نشاں نیا

لکیروں میں بسی ہے تیری خوشبو
میری قسمت چمکنے کا ہے امکان
کہاں وہ موسم گل اور کہاں یہ دشت کا عالم
ترے مرے فسانے ہیں، ترے مرے زمانے تھے

اشرف عادل کی غزلوں کا نمایاں وصف زبان و بیان کی سادگی ہے۔ وہ اپنے جذبات کو جدید شعری میلانات کے تحت آسان اور روزمرہ کہ زبان میں پیش کرنے کے روادار ہیں۔ جدید غزل کے فنی و فکری لوازمات سے عادل نہ صرف پوری طرح سے واقف ہیں بلکہ ان کے اظہار و برتاو میں بھی انھیں ملکہ حاصل ہے۔ اُن کی غزلوں میں لہجے کی تازگی اور احساس کی ندرت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جدید تر غزل میں زندگی کے اہم موضوعات کی ترجمانی ہر شاعر نے کی ہے۔ اشرف عادل بھی اپنی ذات کے وسیلے سے اپنے عہد اور معاشرے کا مطالعہ اور مشاہدہ گہرائی سے کرنے کے بعد اپنی غزلوں کو اس طرح کے موضوعات سے دلکش بناتے ہیں۔ آگے چل کر یہی غزلیں سماجی عناصر اور ان سے پیدا شدہ صورت حال کی علامت بن جاتی ہیں۔ عادل کی شاعری میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ دنیا کی بے ثباتی کی باتیں بھی ہیں اور عصری آگہی بھی۔ غرض ان کی شاعری میں سماجی حقیقتوں سے اس طرح پردہ اٹھایا گیا ہے کہ ہر ایک شے اپنی اصلی شناخت کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ ان تمام حقیقتوں کا عادل پورے جوش و جذبے کے ساتھ اظہار کرتے ہیں:

ایک انجان خواب کا افسوں
کھٹکھٹاتا ہے شہرِ ذات کا در
شہر پُر آشوب میں ڈر بکتا ہے
اور بے مول ستمگر بکتا ہے
میں نے مندر تو نے مسجد ڈھا دی
اپنی اپنی ہے سیاست سب کی
سبز پتوں کو گرا دیتا ہے چپکے چپکے
پیڑ خود کو بھی سزا دیتا ہے چپکے چپکے
شہر جلتا ہے سرد شعلوں میں
گردشِ حالات کہتے ہیں کچھ

اشرف عادل کی شاعرانہ خصوصیات میں پیکر تراشی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ عادل نے اپنے

تجربات اور احساسات کو اپنے مخصوص الفاظ کی بدولت خوبصورت پیکر تراشے ہیں۔ گویا وہ لفظوں کی تجسیم کاری کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ عادل کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے فرید پربتی لکھتے ہیں:

''اشرف عادل کا تعلق چونکہ جدید تر نسل سے ہے اسی لئے ان کا میلانِ طبع راست گفتاری کی طرف پایا جاتا ہے۔ ان کی غزل لہجے اور طرزِ احساس دونوں اعتبار سے نئے لب و لہجے اور احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ انہوں نے عشق و محبت کے بنیادی احساسات کے ہمراہ روحِ عصر کی تصویر کشی جذبے کی شدت شائستگی، اظہار کی صداقت، لہجے کے سوز و گداز کے ساتھ کی ہے۔''۳

اشرف عادل کے ابھی تک کے شعری سفر کے پیش نظر ریاست جموں کشمیر میں اردو غزل میں ان کے روشن مستقبل کے بھرپور امکانات دکھائی دے رہے ہیں، کیونکہ وہ گزشتہ کئی برسوں سے ریاست کے بڑے اور اعلیٰ معیار کے مشاعروں میں بھی مسلسل مدعو کئے جاتے ہیں جس سے ان کے قارئین کے حلقے میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

☆☆☆☆

سبط رضا

صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے ایک اور نوجوان شاعر سید سبط رضاؔ ہیں۔ آپ ۱۲ اپریل ۱۹۶۹ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی ہے۔ بی۔اے کے دوران ہی سبط رضا نے شاعری اور لوازمات شاعری میں دلچسپی لینا شروع کی اور بہت جلد آپ کا کلام مقامی اخبارات میں شائع ہونے لگا، جس کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ سبط رضا اپنی دفتری مصروفیات کے باوجود اپنے شعری وجدان کی آبیاری کے لئے الفاظ کو موزوں کرتے رہتے ہیں۔

سبط رضا کے کلام میں جدید شاعری کے متنوع موضوعات کی پیش کش کے لئے نئے الفاظ، اسلوب اور تازہ لہجہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں تازہ کاری اور خلاقانہ جوہر موجود ہیں۔ وہ دور رفتہ کے کشمیر کے پر درد حالات کا دلخراش اظہار اس انداز سے کرتے ہیں۔

دیکھ کر شہروں کی میں خاموشیاں
کس طرح پاؤں سکونِ قلب وجاں
منزلوں کے سب نشاں مقتل نشاں
جسم مردہ آنسوؤں میں خوں رواں

ہر طرف خوں کی پھواریں جابجا
بے سروسامانیاں ہیں لامکاں

سبط رضا کے یہاں جدید موضوعات کے ساتھ اُردو غزل کے روایتی موضوعات بھی جابجا نظر آتے ہیں۔ان کے سینے میں ایک حساس دل دھڑکتا ہے۔ان کی غزلوں میں حسن وعشق، ہجرووصل، ذہنی اضطراب اور گلے وشکوے وغیرہ جیسے اُردو غزل کے بنیادی موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔ان خیالات اور تجربات کو اکثر شعراء نے نظم کیا ہے، لیکن سبط رضا نے ان کی پیش کش کے لئے مختلف انداز اور لہجہ اختیار کیا ہے۔سادہ بیانی اور شگفتگی ان کی غزلوں کی اہم خوبیاں ہیں۔عشق وسرمستی کے جذبات کو بیان کرنے کے لئے موصوف الفاظ کو کچھ اس انداز سے شعری لباس پہناتے ہیں ۔

راحت وصل میں انکارِ جنوں کیا معنی
تم نہ آؤ تو یونہی رات پہ بن آتی ہے

جنس احساس خریدی نہیں جاتی ہے رضا
کس نے جیتا ہے محبت کو بازورِ شمشیر

عذاب عشق ومحبت کہاں سمجھتے ہیں
کہ وہ تو آتش ِدل کو دھواں سمجھتے ہیں

اشک آنکھوں سے رواں ہیں غم ہجراں کے سبب
بے کراں رہنے دے برسات پر بن آتی ہے

سبط رضا کے یہاں بھی ریاست میں اردو غزل کے ایک اچھے شاعر کے امکانات نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆

لیاقت جعفری

لیاقت جعفری دور رفتہ کے ابھرتے ہوئے غزل گو شعراء میں دور سے پہچانے جاتے ہیں ۔موصوف نے قلیل عرصے میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔آپ کا کلام ریاست کے علاوہ ملکی سطح کے اخبارات اور رسائل میں تواتر سے چھپتا ہے۔

لیاقت جعفری جموں وکشمیر کے ضلع پونچھ کے زرخیز ادبی علاقہ میں ۱۸ فروری ۱۹۷۱ء کو پیدا ہوئے۔آپ کا اصلی نام لیاقت علی سلطان ہے لیکن شعری دنیا میں آپ لیاقت جعفری کے قلمی نام سے جانے جاتے ہیں۔ والد کا نام غلام اکبر سلطان ہے۔تعلیم کے ابتدائی مراحل پونچھ میں ہی طے کئے ہیں ۔بی۔اے گورنمنٹ کالج پونچھ سے پاس کرنے کے بعد ایم۔اے کے لئے شعبہ اردو جموں یونیورسٹی میں

داخلہ لیا۔ ایم۔اے کے بعد پی۔ایچ۔ڈی کی اعلیٰ سند بھی اسی یونیورسٹی سے حاصل کی۔علاوہ ازیں NET\ SET کے امتحانات بھی پاس کیے ہیں۔لیاقت جعفری آج کل شعبہ اردو ایم اے ایم کالج جموں میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

لیاقت جعفری بچپن سے ہی اردو زبان وادب سے لگاؤ رکھتے آئے ہیں، جو وقت کے ساتھ ساتھ شدت پکڑتا گیا۔پونچھ کا علاقہ ریاست میں اردو شعروادب کے حوالے سے نہایت ہی زرخیز رہا ہے۔ یہاں اردو ادب کے کئی نامور شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں جن میں کرشن چندر، چراغ حسن حسرت، ٹھاکر پانچھی، دینا ناتھ رفیق وغیرہ ناقابل فراموش ہیں، اسی سلسلے کی ایک نئی کڑی لیاقت جعفری بھی ہیں۔لیاقت جعفری نثری اصناف کی تنقید و تحقیق میں دلچسپی رکھتے ہیں۔تاہم وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو عموماً غزل کے پیرائے ہی میں پیش کرنا پسند کرتے ہیں۔

لیاقت جعفری کا شعری مزاج سماجی حقیقتوں کے موافق ہے۔ان کے کلام میں فرسودہ اور پائمال مضامین نہیں ملتے۔جعفری جدید فکری میلانات کے شاعر ہیں۔ان کی غزل میں عصری آگہی کا عرفان موجود ہے۔۔لیاقت جعفری حساس طبیعت کے مالک ہیں، آپ اپنے وجود کے تشخص کے ساتھ ساتھ اپنے گردونواح کے حالات وحادثات سے بھی باخبر ہیں۔موصوف کے کلام میں آج کے دور کے انسان کی بے چارگی، محرومی، بے یقینی اور لاحاصلی خاص موضوعات ہیں۔چنانچہ کہتے ہیں ۔

دب کے مرجاؤں گا اک روز میں اپنے نیچے
ایک گرتی ہوئی دیوار ہے میرے اندر
نیند بستی میں بھی بیدار بدن گھومتا ہوں
کوچۂ خواب بھی آباد میرا کوئی نہیں
کچھ سمجھ کر ہی حوالے کر دیا اپنا وجود
خود سے بچنے کا اگرچہ راستہ موجود تھا

لیاقت جعفری کی غزلوں کی زبان سلیس، عام فہم اور بامحاورہ ہے۔انداز بیان اور طرز ادا بھی منفرد ہے۔ان کی غزل لسانی وفنی اعتبار سے کافی پختہ ہے۔ان کا لہجہ تازہ ہے۔وہ اپنے جذبات کی پیش کش کے لئے مخصوص لفظیات کا انتخاب محتاط انداز میں کرتے ہیں۔جعفری جدید اور مابعد جدید شعری رجحانات سے متاثر نظر آتے ہیں جن کی مثالیں ان کی شاعری میں موجود ہیں۔انسانی رشتوں اور اخلاقی قدروں کی شکست وریخت کا پردرد انداز میں لیاقت جعفری نے اپنی غزلوں میں اظہار کیا ہے۔

دشت دردشت عجب نور کا کوندا لپکا

کر دیا کس نے اندھیرے میں یہ صحرا روشن
وہ زرخیز زمینوں کے دن ہوتے تھے
شہر اجڑ جانے کے بعد بھی بستا تھا
میرے لکھے ہوئے ہر لفظ کو جھٹلاتا ہے
مجھ سے بڑھ کر کوئی فن کار ہے میرے اندر
زلزلہ تھمنے کے فوراً بعد اک ٹھہراؤ تھا
اور اس ٹھہراؤ میں بھی زلزلہ موجود تھا

لیاقت جعفری کی غزلوں میں علامتوں کا برمحل استعمال ہوتا ہے۔ معنی آفرینی اور فکر کی بلندی موصوف کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے پیشِ نظر یہ خیال کرنا مناسب ہوگا کہ وہ مستقبل قریب میں ریاست کے اہم غزل گو شاعر ہونگے۔ لیاقت جعفری کی غزلوں کے حوالے سے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں:

''ان کی غزلیں موضوعاتی اور فکری اعتبار سے جدید حسیت سے تعلق رکھتی ہیں، ان کے مخصوص لب و لہجے اور شعری رویے میں تازہ کاری اور تہہ داری کا احساس ہوتا ہے۔''[۴]

لیاقت جعفری سیاسی اور سماجی حالات وواقعات سے خوب آگاہ ہیں۔ وہ ان حالات کے منفی ومثبت اثرات کا اظہار اپنی غزلوں میں کرتے ہیں۔ وہ دور حاضر کے انسان کی کربناکی اور بے چینی کی دل دوز تصویر کشی اپنی غزلوں میں منفرد لہجے میں کرتے ہیں۔

گھر کے ہر کمرے میں دوڑ رہے تھے سانپ
اور آنگن میں ہرا بھرا گلدستہ تھا
جس کے مر جانے کا احساس بنا رہتا ہے
مجھ سے بڑھ کر کوئی بیمار ہے میرے اندر
آنکھ لگتے ہی کئی آسیب آتے تھے نظر
میری ہر اک نیند میں اک سانحہ موجود تھا

☆☆☆☆

فاروق احمد فاروق

فاروق احمد فاروق بھی ریاست کے شعراء کی جدید ترپود میں شمار ہوتے ہیں۔ فاروق احمد بٹ نام اور فاروق تخلص ہے۔ ابتداً فدا کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ آپ کی پیدائش اسلام آباد کے علاقہ انچی ڈورہ میں ۱۹ نومبر ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ والد کا نام غلام قادر بٹ ہے۔ فاروق نے بی۔ اے گورنمنٹ ڈگری کالج اسلام آباد سے اور ایم اے اردو کشمیر یونیورسٹی سے کیا ہے۔ آج کل آپ بحیثیت معلم اردو کے فرائض اپنے آبائی علاقہ میں دے رہے ہیں۔

کالج کی تعلیم کے دوران فاروق کو شعر وادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا اور وہ شعر کہنے لگے۔ انھوں نے شعر کہنے کے ساتھ ساتھ اردو کے اچھے شعراء کا مطالعہ بھی جاری رکھا جس کا یہ اثر ہوا کہ آپ کی شاعری میں فنی گرفت آنے لگی۔ فاروق نے اردو کی اصنافِ سخن میں سے صنف غزل کو خاص طور پر اپنے تخیلات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کی غزلیں یہاں کے اخبارات کے علاوہ ملک کے باوقار جرائد میں بھی چھپتی ہیں۔ شاعر، شیرازہ، آجکل، سرسبز، لفظ لفظ اور روزنامہ ہندسماچار میں آپ کا کلام گاہے گاہے چھپتا رہتا ہے۔ فاروق نے اپنے کلام کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں ''دیوانِ فاروق'' اور ''دیوانِ دوم فاروق'' کے ناموں سے شائع کیا ہے۔ فاروق احمد فاروق نے نہایت ہی کم عرصے میں اردو شاعری کو دو دیوان عطا کئے ہیں۔ جن سے فاروق کی تخلیقی پرواز کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

فاروق احمد فاروق کا شاعرانہ مزاج مختلف ومتنوع پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں ذاتی تجربات کی بوقلمونی بھی ہے، اور عصر حاضر کی روداد بھی، فکر وفن کی تازگی بھی ہے، اور طرز ادا کی دل نشینی بھی، خیالات کی بلندی بھی ہے، اور احساسات کی فراوانی بھی۔ اُردو غزل کی فنی، ہیتی اور لسانی باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنے تجربات کا اظہار بڑی ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تفکر کو ہے آوارہ مزاجی
ہے مشکل ذوق میں اوسان رکھنا

میری آرزو ئیں جواں ہو گئیں تھیں
محبت کا جب آستاں چھو لیا تھا

حقیقتوں کے شہر میں وہ خواب بیچتا رہا
حدود ریگزار میں سراب بیچتا رہا

زندگی اس کو کہوں کیسے جو پائے وفات

موت جس کو چھو نہ پائے بس وہی تو ہے حیات
پرورش دل کی کر لے جان کی حامی نہ بھر
ایک دن تجھ کو تڑپتا چھوڑ دے گی جاں عبث

فاروق احمد فاروقؔ کی شاعری کے مطالعے سے ان کی زبان اور لفظیات ہمیں بڑا متاثر کرتے ہیں۔آپ الفاظ کے انتخاب اور دروبست پر خاص توجہ صرف کرتے ہیں۔عالمی سطح پر رونما ہونے والے حالات وحادثات کے ساتھ ساتھ وادیٔ کشمیر کے ابتر حالات کا اظہار بھی مخصوص لفظیات اور لب ولہجے میں فاروق اپنی غزلوں میں کرتے ہیں۔آپ ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔فاروق اپنے گردونواح کے حالات کا مشاہدہ اپنے مخصوص زاوئیے سے کرتے ہیں اور پھر اپنے ان مشاہدات اور تجربات کو شعری پیکروں میں کچھ اس طرح ڈھالتے ہیں ۔

دور ہے ضرب قلم کا آج کل
ہوگئی بے دم یہاں شمشیر دیکھ
خوف کے سائے میں پلتے ہیں سارے لوگ
کھانا پینا بھول گئے بیچارے لوگ
تواریخ وادی میں یہ باب کیوں ہے
جہلم میں خون کا یہ سیلاب کیوں ہے
فضاؤں میں بارود کی بو ہے کیسی
بلوریں تھا جو آب ،زہراب کیوں ہے
آسماں کی وسعتوں پر راج بمباروں کا ہے
شہر ہے سہما ہوا جھولی میں کچے گھر لئے

فاروق احمد فاروق کی تخلیقی صلاحیتوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے زاہد مختار لکھتے ہیں:

''فاروق احمد فاروق کی شاعری میں ایک گہرائی ہے۔اوران کے اندر موجیں مارتے ایک جنوں کا عکس ہے۔فاروق احمد فاروق اس طرحدار عکس کو صفحہ قرطاس پرلانے میں تخلیقی اور لسانی باریکیوں سے لبریز کی رنگ زیر قلم لاتے ہیں۔جن کی اپنی ایک الگ نزاکت بھی ہے اور علامتی خوشبو بھی۔'' ۵

فاروق احمد فاروق متصوفانہ خیالات کے شاعر ہیں۔ان کے دونوں دواوین کے مطالعے سے تصوف کے موضوع پر مشتمل متعدد اشعار نظر نواز ہوتے ہیں۔وہ ایک مخصوص فکر کی نمائندگی اپنے کلام میں

کرتے ہیں۔ان کے یہاں رندی و سرمستی، دنیا کی بے ثباتی، خداپرستی، صوفی و صافی، عشق حقیقی وغیرہ کے عناصر سے سرشار اشعار جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔فاروق اپنے صوفیانہ خیالات کی ترسیل کے لئے ایک مخصوص لہجے کو بروئے کار لاتے ہیں، جس میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔چنانچہ کہتے ہیں:

جو توکل پہ تیرے بیٹھا ہو
وہ تو مجبور نہیں ہو سکتا

سجدۂ شاہد جبیں سے کر ادا
بندگی کا لے ذرا ماتھے پہ داغ

ہو فاروق جاری اگر ضرب لا
کرے ماسوا کی حجامت زباں

خودی کے آئینے میں خود نمائی ہو چکی اس کی
قیامت تک جاری ہے اب اُس کا تامل بس

ضرب لا پیوندِ حق در خود روی
رمز الااللہ تیغ بے نیام

کلیسا و دیر و حرم میں نہیں ہے
خدا وہ نہیں ہے جو ہم میں نہیں ہے

فاروق احمد فاروق نے گزشتہ چند برسوں سے جس رفتار سے اردو شاعری کی دنیا میں اپنے تخیلات اور احساسات کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ گماں کرنا غلط نہ ہوگا کہ وہ مستقبل میں کشمیر کے اہم شعراء میں ایک خاص مقام کے مالک ہونگے۔

☆☆☆☆

غضنفر علی شہباؔز

غضنفر علی پرے نام اور شہباؔز تخلص ہے۔آپ بھی جموں کشمیر کی اسی نئی پود کے شاعر ہیں جو گزشتہ دو تین دہائیوں سے شعر و شاعری کی آبیاری میں مصروف ہیں۔غضنفر علی ۱۳ نومبر ۱۹۷۱ء کو سرینگر کے محلہ جڈی بل میں پیدا ہوئے۔شہباز بی۔اے کرنے کرنے بعد بنک میں ملازم ہو گئے اور آج بھی اسی کام سے منسلک ہیں۔شعر و شاعری سے بچپن سے ہی لگاؤ رہا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور جس کی بدولت ان کو بھی شعر کہنے کا سلیقہ آ گیا۔

غضنفر علی شہباز جدید ترین نسل کے شاعر ہیں۔ان کے یہاں احساسات اور مشاہدات کا انوکھا

برتاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔شہباز کے کلام میں غزل کے بنیادی موضوع عشق کے متفرق پہلوؤں کی عکاسی دکھائی دیتی ہے۔شہباز نے اپنے عشقیہ جذبات اور احساسات کو زبان کی سادگی اور برجستگی سے بہت خوب صورت انداز میں پیش کئے ہیں۔ان کے کلام میں بھی دیگر نو آموز شعراء کی طرح حسن و خوبصورتی ،حزن و یاس،فراق و وصال،یاد و امید،تڑپ و بے قراری وغیرہ جیسے معاملات عشق کی کارفرمائی جابجا محسوس کی جاسکتی ہے۔

قید و رسن میں تب بھی بند ھتے تھے عشق والے
حق بات کہنے والے اس دن بھی دار ڈھونڈیں
تری فرقتوں کی دلبر کوئی انتہا تو ہوگی
تو بتا عروسِ خلوت بنے غم گسار کب تک
ہم ان سے شکایت کر نہ سکے
ہم وصل کی چاہت کر نہ سکے

روایتی موضوعات کے علاوہ شہباز اپنے وطن کی موجودہ صورت حال کی پیش کش بھی اپنی غزلوں میں کرتے ہیں۔مابعد جدید فکری میلانات کے اثرات کا عکس بھی غضنفر علی شہباز کے کلام میں راست بیانی کے ساتھ نظر آتا ہے۔انہوں نے عصر حاضر کے انسان کی زندگی کے متفرق پہلوؤں کو منفرد لب و لہجے میں بیان کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

دھوئے جو دل سے نفرت کی بدنما سیاہی
مل جل کے آؤ ہم سب وہ آبشار ڈھونڈیں
کیوں جگر جگر ہے چھلنی کیوں ہے دن بہ دن اُداسی
کیوں جلیں یہ آشیانے رہے انتشار کب تک
یہ شہر دھواں دھواں سا ،رہے کیوں بجھا بجھا سا
کہ ہر نظر کے آگے رہے یہ غبار کب تک

☆☆☆☆

علمدار عدم

علمدار حسین شاہ کاظمی بھی ریاست کے نئے شعراء میں ایک اہم نام ہے۔علمدار حسین ادبی دنیا میں علمدار عدم کے نام سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔آپ ۳ نومبر ۱۹۷۵ءکو ریاست کے ضلع پونچھ کے قصبہ حویلی میں پیدا ہوئے۔مقامی مدرسے سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علمدار نے پونچھ ڈگری

کالج سے بی۔اے اور بعدازاں جموں یونیورسٹی سے ایم۔اے، بی۔ایڈ اور پی۔ایچ۔ڈی کی اعلیٰ اسناد حاصل کیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد موصوف ریاست کی کلچرل اکیڈمی میں ملازم ہوگئے اور آج کل بھی آپ اسی ادارے میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

پونچھ کا علاقہ اُردو شعر و ادب کے حوالے سے ریاست کا زرخیز ترین علاقہ رہا ہے۔ یہاں کے ادبی ماحول نے فن کاروں اور قلم کاروں کی ایک کہکشاں پیدا کیں ہیں، جو اُردو شعر و ادب کی خدمت میں منہمک ہیں۔ اسی محفل کا ایک نیا ستارہ علمدار عدم ہے۔ انہیں بچپن سے ہی اُردو زبان اور شاعری سے لگاؤ رہا ہے۔ جس پر پونچھ کی ادبی فضا نے سونے پہ سہاگا کا کام کیا۔ علمدار بھی اس شاعرانہ ماحول سحر انگیز فضا میں محصور ہوگئے اور وہ بھی شعر و شاعری کی زلفیں سنوارنے لگے۔ علمدار عدم اُردو شاعری میں صنف غزل سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں اور اسی میں اپنے جذبات اور تجربات کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کلام ریاست اور بیرون ریاست کے اخبارات اور رسائل میں چھپنے کے علاوہ کتابی صورت میں ''آگہی کا سفر'' کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔

علمدار عدم نئی فکر کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے تجربات اور احساسات کو پیش کرنے کا ایک انوکھا انداز رکھتے ہیں۔ عدم اپنے عہد کے حالات و واقعات اور مشکلات و مسائل کو اپنے تجربات کے پیش نظر اشعار میں سموتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نیا اور تازہ ہے۔ اسلوب میں سادگی ہے۔ بلکہ سادگی سلاست اور روانی ان کے کلام کی خاص خوبیاں ہیں۔ وہ عصر حاضر کے انسان کی نفسیات اس کی سوچ اور فکر سے واقف ہیں۔ ان کی غزل نئی نسل کی سوچ و فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔ علمدار عدم کی غزل ان کی ذات کا بھی انکشاف کرتی ہے۔ ان کی غزلیں ان کے اندرونی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میں جو کہتا تو سب راز پر تولتے
مجھ میں خاموش تھا ان کہی کا بدن

میں جس کو ڈھونڈتا تھا
شعورِ زیست لگے ہے خفا خفا جیسے

میں گمرہی کے جوں ہی ذائقے تلاش کروں
میرے درون میں آئے ہے زلزلہ جیسے

ٹھہر گئے ہیں جنوں کی ہر اک سرحد پر
کہ آگہی کا ہمیں انتظار کرنا ہے

علمدار عدم ایک امن پسند اور ہمدرد انسان ہیں۔ دور رفتہ کے انسان کی مادیت پسندی، نفسا نفسی، ہماہمی، مذہبی تعصب اور دوسرے اہم مسائل کے متعلق علمدار عدم ایک مثبت سوچ رکھتے ہیں۔ وہ آپس میں بھائی چارے اور مذہبی رواداری کے حامی ہیں۔ جس کی نمائندگی وہ اپنے کلام کرتے ہیں۔ اس طرح کے موضوعات کو پیش کرنے کے لئے علمدار عدم شعری محاسن اور دیگر فنی لوازمات کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ مابعد جدید دور کے اہم موضوعات ان کی غزلوں میں جا بجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے حالات کو فنی چابکدستی کے ساتھ شعری پیرہن عطا کرتے ہیں۔ علمدار عدم اپنی ذات اور کائنات کے اسرار و رموز کو قلم کی زبان سے کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں۔

اس میں الفاظ و معنی کے سب رنگ تھے
پھر بھی روٹھا رہا شاعری کا بدن

وفا، احساس، ہمدردی، محبت
نئے بازار کا سودا نہیں ہے

یہ اور بات کہ اب راستہ ملے نہ ملے
سفر تو پھر بھی ہمیں اختیار کرنا ہے

☆☆☆☆

ع۔ع عارف

ریاست کے ضلع پونچھ کے علاقہ حویلی کے رہنے والے عرفان علی بھی اُردو غزل کے اُمید افزاء شاعر ہیں۔ عرفان علی اردو دنیا میں ع ع عارف کے قلمی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۱ مئی ۱۹۷۷ء میں پونچھ میں ہوئی ہے۔ موصوف نے اُردو میں ایم۔اے اور NET کے امتحانات پاس کئے ہیں اور آج کل درس و تدریس سے منسلک ہیں۔ عارف بھی پونچھ کے ادبی ماحول میں رہ کر غزل کہنے میں پیش پیش ہیں۔ وہ ایک اچھا اور معقول شعری مزاج رکھتے ہیں۔ آپ اردو غزل کی فنی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اپنے دل کی روداد غزل کے وسیلے سے پیش کرنے کا ہنر آپ کو اچھی طرح سے آتا ہے۔ ع۔ع عارف کے کلام میں ذاتی تجربات کے علاوہ موجودہ دور کے سماجی اور سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ عارف کا شعری مجموعہ ''دور افق سے پار'' شائع ہوا ہے۔ ان کے اس مجموعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خوش نما منظر یہاں کوئی نہیں
خوشبوؤں کا گھر یہاں کوئی نہیں

جو شہیدوں کا سودا گر ہے
وہ کب چین سے سو سکتا ہے
اس کے ساتھ ہوا جو سب کچھ
میرے ستھ بھی ہو سکتا ہے
جلوے لاکھ دکھاتا ہے
سب کے من کو بھاتا ہے

زبان کی شیرینی اور سادگی عارف کے کلام کا وصف خاص ہے۔ وہ ہر طرح کے مضمون کو غزل میں بیان کرنے کا فن جانتے ہیں۔ عموماً چھوٹی مگر پُر کیف بحریں آپ کی شاعری میں استعمال ہوتی ہیں۔ ع۔ع عارف کی صورت میں اردو غزل کے حوالے سے جموں کشمیر کو ایک لائق شاعر دستیاب ہونے کے امکانات نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆

سلیم ساغر

سلیم ساغر کا تعلق وادیٔ گلپوش کے چمن زعفران علاقہ پانپور کے محلّہ تل باغ سے ہے۔ ساغر ۱۵ نومبر ۱۹۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا حقیقی نام سمیع اللہ بٹ ہے لیکن ادبی دنیا میں سلیم ساغر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اپنے آبائی علاقے سے انٹرمیڈیٹ اور امر سنگھ کالج سرینگر سے بی۔ اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ نے کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ اس کے علاوہ ملکی سطح پر لئے جانے والا امتحان نیٹ (UGC NET) بھی دو مرتبہ پاس کیا ہے۔ آپ ایک عرصے تک اردو درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ اسی دوران ریاستی کلچرل اکیڈیمی سرینگر میں آپ کا تقرر بحیثیت مدیر ماہنامہ ''شیرازہ'' ہوا۔ جب سے آپ اس ادارے میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

جہاں تک ساغر کی شاعری کے آغاز تعلق ہے، اس حوالے سے راقم کے ساتھ ایک ملاقت کے دوران انہوں نے اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا:

''میں نے پہلی غزل آٹھویں جماعت میں کہی ہے۔ اور جب سے یہ سفر آج تک مختلف راہوں سے گزرتا ہوا مسلسل جاری ہے۔'' [۶]

آٹھویں جماعت سے شعری سفر کو جاری رکھنے والے اس شاعر نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی شعری صلاحیتوں کو سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ ساغر نے اردو ادب کے نمائندہ غزل گو شعراء کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ جس کی بدولت ان کو اردو شاعری کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل ہو

گئی ہے۔اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنے ذوقِ شعر کی آبیاری کرنے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لئے میں نے برسوں خلوت نشینی اختیار کی اور کتب ہائے ادب سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔'' ؎

سلیم ساغر ریاست کے نئی نسل کے شعراء کی صف میں اپنی خلاقانہ ذہانت کے بل پر اہم مقام رکھتے ہیں۔گزشتہ دوڈھائی دہائیوں سے ریاستی سطح پر نمودار ہونے والے نئے شعراء میں سلیم ساغر نے اپنی تازہ کار شعری تخلیقات سے ادبی حلقوں کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ساغر نے اپنے اظہارات کے لئے فنی تلازموں سے کام لے کر اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں از حد محنت سے کام لیا ہے۔موصوف کے شعر مجموعے''انتظار اور سہی'' میں ایسے تجربے پائے جاتے ہیں جو فنی اور فکری لحاظ سے کافی توانا ہیں۔جو اردو غزل کے سرمائے میں خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔سلیم ساغر کی شاعری ان کی ذات کی آئینہ دار ہے۔وہ اپنے اندرون کی روداد شعری پیرائے میں منفرد اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔

ایک انجانا تخیل ، ایک ان دیکھا سا خواب
محو حسرت ہے تمنا خواب کی تعبیر میں
میرے دل کی وسعتوں میں بھر دیا ذوقِ جمال
اور امکان کی زمیں پھر کتنی بنجر دے گیا
جو اپنا ہونہ سکا وہ کسی کا کیا ہوگا؟
حصارِ ذات سے باہر میں صبح وشام رہا
یہ ابتداء ہے انوکھی ، یہ انتہا ہے عجب
شعورِ ذات کا سارا ہی سلسلہ ہے عجب

سلیم ساغر کے کلام میں عشقیہ موضوعات پر مشتمل اشعار کی تعداد بھی خاصی ہے۔ساغر عشق اور دل لگی کی باتوں کا اظہار اپنے مخصوص انداز سے کرتے ہیں۔محبوب کی کج روی، ہجر کی صعبتیں اور وصل کی لذتیں وغیرہ جیسے معاملات ساغر نے جا بجا پیش کئے ہیں۔انھوں نے بے وفائی کے تیر کھانے کے باوجود بھی وفا کا دامن تھامے رکھا۔ان کی شاعری میں اس طرح کی نہج اشاروں کنایوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں ہجر وجدائی کا عجیب ماحول پایا جاتا ہے۔

ان کی نظروں میں محبت ہے لبوں پر شکوے
بات شیریں ہے مگر تلخئ تمہید کے ساتھ

اہلِ دل کے لئے ہر رنگ سعادت مندی
وصل ہو جائے کہیں چاک جگر ہوجائے

میں عمر بھر کی تمنا سمیٹے ہوں دل میں
یہ انتظار ہے مجھ کو تو آئے پھر سے

نہ اس نے بات کی ایسی نہ کچھ سوال کیا
کہے بغیر ہی ظاہر مگر ملال کیا

وصال و ہجر کے موسم پروئے شعروں میں
ہر ایک رُت کو غزل کیوں نہ خوشگوار کرے

سلیم ساغر کی غزلیہ شاعری نئے لب ولہجہ اور طرزِ احساس سے لبریز ہے۔ انھوں نے عشق و محبت کے مخصوص احساسات اور جذبات کے علاوہ عصری حالات وحادثات کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ ساغر کی غزلوں میں جذبات کی صداقت وشدت، احساس کی تازگی وشائستگی، طرزِ اظہار کی ندرت وجدت جیسی صفات کا اظہار برملا پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں روانی اور سلاست کے علاوہ موسیقی، نغمگی اور سوز و گداز بھی بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ ڈاکٹر بشر بشیر سلیم ساغر کے کلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"سلیم ساغر کی شعری کاوشیں اس کے فکری رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں، اور وہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے امکانات کے خدوخال بھی ابھارتی ہیں۔ اس کی شاعری میں احساسات کی ایک ایسی کہکشاں سجی ہوئی ہے جو قدم بہ قدم اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور قاری کے دل کو پڑھتے وقت اپنی گرفت میں لے کر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ سلیم جذباتیت کا نہیں بلکہ سچائیوں کا شاعر ہے۔" [8]

سلیم ساغر کی تخلیقی تازہ کاری اور موضوعاتی تنوعیت نے مختصر وقت میں ہی انھیں ریاست کے ادبی حلقوں میں ایک پہچان عطا کرائی ہے۔ آنے والے وقت میں ان سے اردو غزل کے حوالے سے بڑی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں، کیوں کہ ان کے تجربات اور مشاہدات کی پیش کش میں بے شمار امکانات موجود ہیں۔

☆☆☆☆

شیخ خالد کرار

شیخ خالد کرار ریاست جموں وکشمیر کی جدید تر نسل کے غزل گو شعراء میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔آپ کا اصلی نام شیخ خالد محمود ہے۔۱۹ دسمبر ۱۹۷۷ء کو سرنکوٹ ضلع پونچھ میں آپ شیخ قمرالدین کے گھر میں پیدا ہوئے۔پونچھ کا علاقہ ادبی سرگرمیوں کے لحاظ سے ریاست کا نمائندہ علاقہ ہے۔خالد نے بھی اس ماحول کا اثر قبول کیا۔تعلیمی سفر کے دوران ہی آپ یہاں کی ادبی محافل سے قرابت رکھنے لگے۔اس کے نتیجے میں آپ کے اندر شعری مزاج پیدا ہو گیا اور جب سے آپ مسلسل ارتقاء کی جانب گامزن ہیں۔بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ نے صحافت کے پیشے سے اپنی وابستگی اختیار کی۔اور تا حال اسی سے منسلک ہیں۔علاوہ اس کے آپ کے مشاغل میں گرافک ڈیزائننگ کو بھی جگہ حاصل ہے۔

خالد کرار نے قلیل عرصے کے اندر ہی اپنی ذہنی، فکری اور فنی صلاحیتوں سے ہر ذی حس قاری کو متاثر کیا ہے۔ان کے ہاں تخلیقی صلاحیت کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے۔آپ لکھنے کے ساتھ ساتھ اردو کے منجھے ہوئے استادوں کے کلام کو پڑھتے رہتے ہیں جس سے آپ کے فن میں پختگی کے نمونے نظر آتے ہیں۔خالد اپنے جذبات کو الفاظ کی خوب صورت نشست کے ساتھ نظم و غزل اور افسانوی اور غیر افسانوی اصناف میں پیش کرتے ہیں۔آپ کی بیش تر کاوشیں ملکی اور ریاستی سطح کے اعلیٰ رسائل و جراید میں شائع ہوتی ہیں۔خالد نے ابتداء ہی سے شاعری کا دامن مضبوطی سے پکڑا تھا جو ہنوز جاری ہے۔آپ کو شاعری سے بے حد لگاؤ ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ مختصر وقت کے اندر میں ہی آپ نے تین شعری مجموعے محبوبانِ شاعری کی نذر کئے ہیں۔''آنگن آنگن پت جھڑ''، ''سوا نیزے پہ سورج'' اور ''ورود'' آپ کے قلم کے تراشیدہ شعری مجموعے ہیں۔ان مجموعوں کی ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی ہوئی ہے۔

خالد جدید ذہن اور شعور کے شاعر ہیں۔ان کی غزل عصری حسیت کی آگہی کا خوبصورت احاطہ کرتی ہے۔انہوں نے روح عصر کے متفرق موضوعات کو مخصوص لفظیات سے شعری سانچوں میں ڈھالا ہے۔وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو جدید فکری میلانات کے تحت منفرد لہجے میں بیان کرتے ہیں۔خالد کرار کی غزلوں میں تازگی اور شگفتگی کا احساس جا بجا ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے شعری اظہار کے کئے مروجہ موضوعات اور لفظیات کو نئے اسالیب اور نئے معنوں میں پیش کیا ہے۔جس میں ان کی انفرادی حیثیت جھلکتی ہے۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ہماری ذات مسلسل سفر میں ہے اب بھی
ہمارا خود سے کوئی رابطہ نہیں ٹکتا
شعور آگہی کے فلسفے میں جلتا ہوں

میں اپنے ساتھ اسی رابطے میں جلتا ہوں

دشت ویرانیوں میں ہے آباد
شہر میں کوبہ کو تماشا ہے

سارے آثار سب امکان بدل جاتے ہیں
لفظ رہ جاتے ہیں پیمان بدل جاتے ہیں

دشت ،خون ،خرقہ چاہ جاں
رات ،ڈر، کنعاں، دریا ،بے ثبات

خالد کرار جدید تر غزل کے تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو موضوعات کو فنی ،فکری اور لسانی لوازمات کی منفرد پاسداری کے ساتھ بیان کرنے کے ہنر سے بہرہ ور ہیں۔ وہ صنف غزل کی فنی اور ہیئتی باریکیوں پر اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات اور تجربات کو ایک مخصوص اسلوب میں پیش کرتے ہیں جو بالکل ان کا اپنا ہے۔ ان کے کلام میں ان کی ذات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔خالد کرار سنجیدہ ذہن کے مالک ہیں، وہ اپنے گردونواح کے حالات پر غور کرتے ہیں اور اپنی ذات کے حوالے سے اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں، کیا اخذ کرتے ہیں، اس بات کا اظہار وہ اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اردو غزل کے پائمال اور فرسودہ مضامین کا اظہار بہت کم نظر آتا ہے۔ آج کے دور کا انسان کیا سوچتا ہے، کیا کرتا ہے ،کن حالات سے دوچار ہے، ان سب چیزوں کا احاطہ خالد اپنی غزلوں میں شعریت کے ساتھ کرتے ہیں۔

خلا، انسان ،وحشت ،خاک ،ہجرت
مکان ،رستے ،نشانی، بے یقینی

ورود جِسم تھا جاں کا عذاب ہونے لگا
لہو میں اُترا مگر زہرآب ہونے لگا

یہ انتظارِ مسلسل ،یہ امتحانِ پیہم
یہ دشت اور یہی بے رِدا بدن میرا

اک جنس زدہ نسل ہے تہذیب کے پیچھے
بازار ہے اک کوچہ وبازار سے آگے

خالد خود اپین ذات سے خدشات ہیں بہت
خود سے ہی اجتناب میرے جسم وجان میں اور

خالد کرار کی شاعرانہ ذہانت اور فطانت کا اعتراف اُردو کے نامور ناقدین شمس الرحمن

فاروقی، حامدی کاشمیری، قدوس جاوید، حقانی القاسمی، ڈاکٹر شہناز نبی، فرید پربتی، وغیرہ نے خوبصورت انداز اور الفاظ میں کیا ہے۔ جوان کے روشن مستقبل کی ضمانت کے لئے کافی ہے۔ ڈاکٹر فرید پربتی خالد کی تخلیقی بصیرت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''خالد کرار کا تعلق اردو شعراء کی جدید تر نسل سے ہے۔ وہ اپنے تازہ کار اور خلاقانہ ذہانت منفرد شیوۂ گفتار اور نئی حسیت کے ذریعے جدید شعری منظر نامے کو بقعۂ نور بنا رہے ہیں۔ خالد کرار کی تخلیقی شخصیت اتنی متنوع اور پر اعتماد ہے کہ اپنی انفرادیت کا احساس نہ صرف لفظیاتی سطح پر کرواتی ہے بلکہ موضوعاتی سطح پر بھی۔ جس کے ذریعے وہ ایک ایسے خیال آفرین کیف واثر سے ہمکنار کرتا ہے جو دور تک اور دیر تک اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔''

9

الغرض یہ کہ خالد کرار نے اپنے شعری سفر میں جس قدر کم وقت میں کامیابی حاصل کی اسے مدِ نظر رکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ آنے والے وقت میں وہ مزید اپنے خیالات سے شاعری کی ڈگر کو صحیح طور سے آگے لے جائیں گے۔

☆☆☆☆

غلام نبی غافل

غلام نبی غافل بھی ریاست کے تازہ کار شاعر ہیں۔ آپ ۱۴ اپریل ۱۹۷۸ء کو ریاست کے ضلع کشتواڑ کے علاقہ دچھن میں پیدا ہوئے۔ غلام نبی غافل جدید تر شعراء میں اہم نام ہے۔ اردو غزل میں وہ اپنے مخصوص لب و لہجے سے موجودہ دور کے ان تمام حالات کو پیش کرتے ہیں جن کا تعلق ہمارے سماج سے روز بہ روز گہرا ہوتا جارہا ہے۔ غلام نبی غافل نے انسانی رشتوں کی بے معنویت اور ذاتی درد و کرب کو بڑی سنجیدگی سے پیش کیا ہے۔ آپ اردو غزل کے فنی و فکری پہلوؤں سے بھی پوری آگہی رکھتے ہیں۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

ضمیر و خوف ِ خدا کی باتیں حدودِ دیر و حرم سے باہر
قدیم انسان جدیدیت میں تمہاری ممکن گزر نہیں
قدم مریخ پہ ہے جسم کا اور روح کہتی ہے
نہیں آتی کوئی صورت نظر سیراب ہونے کی
روح کی تشنہ لبی کو مان لو مرگ حیات

زندگی کا نام لکھ لو جابجا تشنہ لبی
فنا کی دسترس میں ہے نظارگی کا بانکپن
نہ جلوہ گہ میں وہ طالب نہ وہ نظر نگاہ میں

☆☆☆☆

یاسین سمبلی

محمد یاسین ڈار المعروف یاسین سمبلی کشمیر کے ضلع بانڈی پورہ کے علاقہ سُمبل اندرکوٹ سوناواری میں یکم فروری ۱۹۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ یاسین نے اردو میں ایم۔اے کے علاوہ بی۔ایڈ کا امتحان بھی پاس کیا ہے۔ اور آج کل بحیثیت معلم اردو مقامی اسکول میں کام کر رہے ہیں۔ یاسین سمبلی اردو شعروادب میں ابتدائی عمر سے ہی دلچسپی لینے لگے، جو آہستہ آہستہ پروان چڑھتی گئی۔ یاسین نے طالب علمی کے دوران اردو نصاب میں شامل شعراء اوران کے کلام کا غائر مطالعہ کیا۔ علاوہ اس کے آپ مختلف ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہونے والے کلام سے بھی فائدہ اٹھاتے رہے جس کا بعد میں یہ اثر ہوا کہ آپ شعر کہنے کے ہنر سے واقف ہوگئے اور اس وقت شعری دنیا میں آپ ابھرتے ہوئے فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یاسین سمبلی کی شاعری کا محور رومانیت اور اس کے مخصوص لوازم ہیں۔ وہ کہیں عشق وعاشقی کے معاملات میں اُلجھ جاتے ہیں تو کہیں ہجر وجدائی کی کیتیات بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ان کی شاعری میں محبوب کی یاد اوران کی جھلک سے پیدا شدہ صورتحال کا بہترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ درجِ ذیل اشعار ان تمام باتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

ملتے ہیں اتفاقاًان کے خیال مجھ سے
جی چاہتا ہے کرے کوئی سوال مجھ سے
ہمارے ملن کی ختم ہے کہانی
زمانے کے حائل ہیں دستور ساقی
جو سادگی کا پیکر بنتا رہا ہوں اب تک
کس بات پر رکھا ہے رنج و ملال مجھ سے
یاسین تیری صورت ان کو نہیں گوارا
ہائے بہت ہے مشکل ان کا وصال مجھ سے
کس سے حالِ دل کہوں کون سنے
ہے من میں ہی سوال اس شام

☆☆☆☆

اقبال صدیقی

اقبال احمد صدیقی ریاست کے چرار شریف علاقے میں ۲۷ ستمبر ۱۹۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایم۔اے معاشیات (Economics) میں کیا ہے۔ اور شعبہ تعلیم میں بحیثیت لیکچرار اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ معلّمی کے علاوہ آپ شاعری میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنے احساسات وخیالات کو شعری پیکروں میں ڈالتے ہیں۔ اقبال صدیقی صنف غزل کو برتنے کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے تجربات اور مشاہدات کے علاوہ عصری میلانات کا احاطہ کرتی ہے۔ انسان کی محرومی، بے بسی، لاچاری، اور تنہائی کے علاوہ اقبال صدیقی کی شاعری میں فکر واحساس کی تازگی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

میں خوف کھاؤں تو تنہایئوں سے کیوں کھاوں
کہ میرے ساتھ ہے شام وسحر کی خاموشی
کیا تلافی ہو میرے خونِ جگر کی خواب سے
یہ تماشہ دیدۂ خونبار کے قابل نہیں
فکر میری شعر میرے سب اُسی کے ہیں مگر
میں ہی اس خاموشیٔ دشوار کے قابل نہیں
میں ہوں برسوں سے کفن اوڑھے ہوئے
منتظر تیری ہے بے جانی میری
خرابوں میں، بیابانوں میں ،ویرانے میں گزری
حقیقت ہے کہ ساری عمر پچھتا نے میں گزری ہے

☆☆☆☆

مذکورہ شعراء کے علاوہ جو شعراء آج کل ریاست جموں وکشمیر میں غزل کی پرداخت میں مصروف ہیں، ان میں سہیل مہدی، روف راحت، امتیاز نسیم ہاشمی، لیاقت نیر، محتشم احتشام، اطہر بشیر اور شاد سجاد وغیرہ کے نام قابل قدر ہیں۔ یہ تمام حضرات تواتر سے لکھنے میں مگن ہے۔ یہاں پر میں مذکورہ شعراء کا نمونۂ کلام نقل کرتا ہوں جس سے ان کی تخلیقی بصیرت اور فکری آگہی کا اندازہ ہوسکتا ہے ۔

فانی ہے بے شک جہاں آب و گل
سوزِ دل کو ہے مگر حاصل ثبات

نقوشِ ہستی بگاڑ کر دیکھوں
پردۂ جان کو پھاڑ کر دیکھوں
قبر میں کیا حساب لیتے ہیں
خود میں خود کو ہی بگاڑ کر دیکھوں
ذرہ ذرہ دھوں ہے میرے وجود کا
مجھ کو جلا گئے یوں جذباتِ زندگی
(سہیل مہدی)

بہا کر خون کے دریا گلی میں
پھرا کرتا ہے وہ چہرا بدل کر
زمیں پر ہے بپا محشر
اتر آ آسمانوں سے
آتے ہیں وہی خواب نگاہوں میں ہماری
ہم خوف کا منظر وہ بلا بھول گئے تھے
ساتھ ہمیشہ رہتے ہیں
میں اور میری تنہائی
(رؤف راحت)

اک سمندر ہے اور پیاسا ہے
ایک دریا ہے بے قراری ہے
فقیرِ شہر ہوں ہاتھوں میں لڑ کھڑاتا ہوا
چراغِ جان ہے وہ بھی بجھا رہی ہے ہوا
آزمانا تُو بھی مجھ کو چھوڑ مت
ہار میں نے بھی ابھی مانی نہیں
ہر طرف بھیڑ ہے تنہائیوں میں ، تنہائی ہے
کیا ہوا ہے کہ طبعیت میری بھر آئی ہے
(امتیاز نسیم ہاشمی)

افسانہ آچکا ہے اب اختتام پر
نبضِ حیات ڈوبنے والی ہے یار آ
پھول کھلنے لگے رت بدلنے لگی
آپ اس دل کو جب یاد آنے لگے
مٹ گئیں زندگی کی سب قدریں
وہ محبت گئی وہ پیار گیا
عظمتِ زندگی وہ کیا سمجھے
جو غمِ زندگی سے ہار گیا
(لیاقت نیر)

آئینے لے کر چلا ہوں پتھروں کے شہر میں
ڈھونڈنے اک گھر چلا ہوں بے گھروں کے شہر میں
ہر طرف بر بادیاں ہیں ہر طرف مرنے کا ڈر
سر بچانے جا رہا ہوں خنجروں کے شہر میں
کوئی سایہ نہ دوست نہ دشمن
ساتھ چاروں پہر تھی تنہائی
ان آنکھوں کا سمندر بولتا ہے
میں چپ ہوں میرا جوہر بولتا ہے
(محتشم احتشام)

اعتراف اس نے حقیقت کا کیا ہی کب ہے
شہر میں اس کو ملی میری وجہ سے توقیر
بس انتظار میں ہی ساری رات ختم ہوئی
امید و یاس کی اک کائنات ختم ہوئی
بٹھا دیا ہے بڑا سخت پہرا چاروں اور
زمین نکل نہ سکی آسماں سے باہر
یہ اب اس کا اکیلا بیٹا تھا
اب کے اس کا ہر آسارا ٹوٹا

لوٹ آؤ کہ بسائیں گے محبت کا جہاں
لوٹ آؤ کہ کریں مل کے نیا گھر تعمیر
(اطہر بشیر)

آوارگی یہ رات میں اور یہ چاند اکیلا
اب سوچتے ہیں یہ کہ کہاں کون جائے گا
وہ باتیں امن کی تو کر رہا تھا
جو دامن نفرتوں سے بھر رہا تھا
پر کیا لگے کہ پرندوں نے اڑ کے اب
گھونسلے میں ماں کو پریشان کر دیا
ملتے ہم رہتے ہیں سارے لوگوں سے
پھر بھی چاروں جانب اک تنہائی ہے
(شاد سجاد)

ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کو فنی وفکری، لسانی وہیئتی، اسلوبیاتی اور جمالیاتی بنیادوں پر نئی بلندیوں سے آشکار کرانے میں مذکورہ شعراء کے علاوہ بھی سینکڑوں نئے شعراء اس کام میں مصروف ہیں۔ جو کہ ریاست میں اردو غزل کے امکانات اور اس کے مستقبل کی واضح دلیل ہے۔ ریاستی سطح پر اردو غزل کی پیش رفت میں کلاسیکی، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی اہم تحریکات ورجحانات کی اثر آفرینی کے علاوہ ارضی اور ثقافتی عناصر اور یہاں کے عصری سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کو بھی برتا گیا ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید اس تناظر میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کسی بھی دوسری ریاست کے مقابلے میں کہیں زیادہ توازن اور تازہ کاری کے ساتھ نئی بلندیاں چھو رہی ہے ۔۔۔۔۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جموں وکشمیر کے اردو غزل گو شاعروں نے غزل کی روح سے انحراف نہیں کیا ہے اور اپنی غزلوں میں ارضیت اور عصریت کی محسوس یا نا محسوس اثر پذیری کے باوجود غزل کی شعریات کے مطابق انسانی جذبات واحساسات اور احوال و حوادث کا ہی اظہار نئی وجمالیات دروبست کے ساتھ کیا ہے۔"[10]

مجموعی طور پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کے سفرنامے کی شاندار ابتداء کمال

الدین حسینی اندرابی رسؔوا سے ہوئی اور اس طویل غزلیہ سفر کا موجودہ پڑاو ہمارے سماج میں اپنی آب وتاب کے ساتھ نظر آرہا ہے۔ عصرِ حاضر میں نئے اور تازہ دم فن کاروں کی شعری تخلیقات سے راسخ امید ہے کہ آئندہ بھی اس ریاست میں اردو غزل کے امکانات روشن ہیں ۔ یہاں دیگر ہندوستانی ریاستوں کے مقابلے میں اردو غزل کا مستقبل کافی روشن اور مسرت انگیز دکھائی دے رہا ہے۔اس کی وجہ نہ صرف اردو غزل کی تیز تر سمت ورفتار ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی یہ بات مسلم ہے کہ یہاں اردو کو سرکاری زبان کا رتبہ حاصل ہے اور ساتھ ہی اردو پڑھنے والوں کی کثیر تعداد بھی یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ریاست جموں وکشمیر میں آج بھی اسکولوں میں دسویں جماعت تک اردو کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔علاوہ اس کے کالجوں اور یونیورسٹیوں اور باقی دیگر تعلیمی شعبہ جات سے بھی اردو کے طالب علم فارغ ہوتے ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح اس زبان کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں ۔اس طرح ہم امید رکھتے ہیں کہ ریاست میں آئندہ بھی اردو زبان وادب سے شغف اور محبت رکھنے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ یہاں ایسے محبان اُردو کی کمی نہیں، جو اس کی ترقی اور فروغ کے لئے کوشاں ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔(مشمولہ،''لمحے اندھیرں کے''ص،۱۲)

۲۔(پیش لفظ''موسم اُڈان کا''ص،۹)

۳۔(مشمولہ پیش لفظ،''لذتِ گریہ''،ص۴)

۴۔(مشمولہ''شیرازہ''سرینگر،ص۲۰۱،جلد۵۲،شمارہ ۷۔۶)

۵۔(مشمولہ،''دیوانِ دوم فاروق''ص۱۰۴)

۶۔(ایک ملاقات مورخہ ۱۵مارچ ۲۰۱۷ء، کلچرل اکیڈمی، سرینگر)

۷۔(پیشِ گفتار،''انتظار اور سہی''ص،ح)

۸۔(مشمول''انتظار اور سہی''ص،ہ)

۹۔(مشمولہ''وُرود''فلیپ سے)

۱۰۔(مشمولہ سہ ماہی سر سبز، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴،ص۵۴،۵۸)

☆☆☆☆☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	ناشر	سن اشاعت
۱	اُردوشاعری کامزاج	ڈاکٹر وزیر آغا	جدیدناشرین، لکھنؤ	۱۹۸۴ء
۲	اُردوغزل	ڈاکٹر کامل قریشی	انجمن ترقی اُردو، علی گڈھ	۱۹۸۷ء
۳	اُردوغزل	ڈاکٹر یوسف حسین خان	انجمن ترقی اُردو، علی گڈھ	۱۹۸۷ء
۴	اُردومیں ترقی پسندادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بپک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۴ء
۵	اُردوزبان وادب	مسعود حسین خان	ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۱ء
۶	آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	بشیر بدر	انجمن ترقی اُردو، دہلی	۱۹۸۱ء
۷	اُردوغزل کی روایت اور ترقی پسندغزل	ڈاکٹر ممتاز الحق	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۸ء
۸	غزل کے جدیدرجحانات	خالد علوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۶ء
۹	جدیدشاعری	عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڈھ	۱۹۷۳ء
۱۰	جدیدغزل	رشیداحمد صدیقی	سرسید بُک ڈپو، علی گڈھ	۱۹۷۴ء
۱۱	جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	شمیم حنفی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	۱۹۷۷
۱۲	جدیدغزل	نشاط شاہد	معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی	۱۹۷۸ء
۱۳	داستانِ تاریخ اُردو	حامد حسن قادری	نگار بک ایجنسی لکھنؤ	۱۹۴۲ء

۱۴	غزل اور غزل کی تعلیم	اختر انصاری	ترقی بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۹ء
۱۵	غزل اور مطالعہ غزل	عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	۱۹۸۳ء
۱۶	غزل اور متغزلین	ابواللیث صدیقی	بھارتی پبلیکیشنز، جامع مسجد دہلی	۱۹۶۸ء
۱۷	غزل اور درس غزل	اختر انصاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	۱۹۷۷ء
۱۸	غزل سرا	مجنوں گورکھپوری	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۶۸ء
۱۹	غزل پسِ منظر پیشِ منظر	ساحل احمد	اُردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد	۱۹۷۶ء
۲۰	غزل کا نیا منظر نامہ	شمیم حنفی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	۱۹۸۱۱ء
۲۱	مقدمہ شعر و شاعری	خواجہ الطاف حسین حالی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	۱۹۸۳ء
۲۲	نئی شعری روایت	شمیم حنفی	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۷۸ء
۲۳	ہماری شاعری	مسعود حسن رضوی ادیب	نظامی پرس، لکھنؤ	۱۹۶۷ء
۲۴	کشمیر میں اُردو (حصہ اول)	پروفیسر عبدالقادر سروری	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	۱۹۸۲ء
۲۵	کشمیر میں اُردو (حصہ دوم)	پروفیسر عبدالقادر سروری	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	۱۹۸۴ء
۲۶	کشمیر میں اُردو (حصہ سوم)	پروفیسر عبدالقادر سروری	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر پروفیسر	۱۹۸۶ء

۲۷	جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو نما	ڈاکٹر برج پریمی	رچنا پبلی کیشنز، جموں (چوتھا ایڈیشن)	۲۰۱۳ء
۲۸	وادیٔ کشمیر کے چند اہم شعراء	جاوید انور	ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی، راجوری	۲۰۱۳ء
۲۹	اُردو غزل کی ثقافتی اساس	ڈاکٹر شبینہ پروین	جے، کے، بک شاپ، سرینگر	۲۰۰۸ء
۳۰	کشمیر میں اردو شاعری ۱۹۴۷ء کے بعد	محمد یوسف خان عادل	جے۔آر آفسٹ پرنٹرس، دہلی	۱۹۸۸ء
۳۱	تنقیدی احتساب	ڈاکٹر عزیز اندوری	شاہد عبدالحفیظ خان، اندور	۲۰۱۱ء
۳۲	تخلیق اور تفہیم	ڈاکٹر گلزار احمد وانی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۲ء
۳۳	ردِ عمل	پریمی رومانی	دیپ پبلی کیشنز، جموں	۱۹۹۴ء
۳۴	پیش رفت	ڈاکٹر پریمی رومانی	رچنا پبلی کیشنز، جموں	۲۰۰۲ء
۳۵	اظہار	ڈاکٹر پریمی رومانی	رچنا پبلی کیشنز، جموں	۲۰۱۵ء
۳۶	توازن	ڈاکٹر پریمی رومانی	رچنا پبلی کیشنز، جموں	۲۰۱۰ء
۳۷	ریاست جموں کشمیر میں اُردو ادب	حامدی کاشمیری	شیخ عثمان اینڈ سنز، سرینگر	۲۰۱۰ء
۳۸	مُشک زعفران	محمد یاسین گنائی	کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، جامعہ نگر دہلی	۲۰۱۷ء
۳۹	عاصی: شخص اور شاعر	محمد آصف ملک علیمی	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۱۳ء
۴۰	رفیق راز آیئنہ تمثال دار	ریحانہ اختر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۰ء

۴۱	دبستانِ جموں وکشمیر میں اُردو	ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری	گلشن بُکس، سرینگر	۲۰۱۲ء
۴۲	عرش صہبائی اُردو غزل کی عہد ساز شخصیت	کوشل کرن ٹھاکر	مانوی پرکاش، جموں	۲۰۱۳ء
۴۳	لوح وقلم	ڈاکٹر کرن سنگھ کرن	مرکز تصنیف وتالیف، کٹھوعہ، جموں	۲۰۱۲ء
۴۴	غ۔م طاوس فن اور شخصیت	ڈاکٹر شفق سوپوری	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۲ء
۴۵	جہات	ڈاکٹر شفق سوپوری	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۲ء
۴۶	کشمیر ادب وثقافت	سلیم خان گمی	یونیورسل بُکس، لاہور	۱۹۸۷ء
۴۷	شعورِ بصیرت	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۴ء

شعری مجموعے

نمبر شمار	نام شاعر	نام کتاب	سن اشاعت
۱	حامدی کشمیری	عرسِ تمنا	۱۹۶۱ء
۲	حامدی کشمیری	نایافت	۱۹۷۶ء
۳	حامدی کاشمیری	لاحرف	۱۹۸۴ء
۴	حامدی کاشمیری	شاخ زعفران	۱۹۹۱ء
۵	حامدی کاشمیری	وادیٔ امکان	۱۹۹۹ء
۶	حامدی کاشمیری	خوابِ رواں	
۷	حامدی کاشمیری	یک شہرِ گماں	

۸	حکیم منظور	ناتمام	۱۹۷۷ء
۹	حکیم منظور	لہولمس چنار	۱۹۸۲ء
۱۰	حکیم منظور	برف رتوں کی آگ	۱۹۹۰ء
۱۱	حکیم منظور	خوشبو کا نام نیا	۱۹۹۱ء
۱۲	حکیم منظور	پھول شفق آنگن کے	۱۹۹۳ء
۱۳	حکیم منظور	شعرِ آسماں	۱۹۹۷ء
۱۴	حکیم منظور	صبح شفق تلاوت	۱۹۹۸ء
۱۵	حکیم منظور	برف آفتاب	۲۰۰۰ء
۱۶	حکیم منظور	سخن برف زاد	۲۰۰۳ء
۱۷	حکیم منظور	قلم، زبان، شگاف	۲۰۰۵ء
۱۸	ہمدم کاشمیری	دھوپ لہو کی	۲۰۰۳ء
۱۹	ہمدم کاشمیری	ورقِ سادہ	۲۰۱۲ء
۱۹	فاروق نازکی	آخری خواب سے پہلے	۱۹۸۹ء
۲۰	فاروق نازکی	لفظ لفظ نوحہ	۱۹۹۰ء
۲۲	مظفر ایرج	ابجد	۱۹۸۳ء
۲۳	مظفر ایرج	انکسار	۱۹۸۸ء
۲۴	مظفر ایرج	ثبات	۲۰۰۷ء
۲۵	مظفر ایرج	دل کتاب	۲۰۰۹ء
۲۶	مظفر ایرج	ہوا دشت دیار	۲۰۱۰ء
۲۷	مظفر ایرج	سخن آئینہ	۲۰۱۲ء
۲۸	رفیق راز	انہار	۲۰۰۴ء
۲۹	رفیق راز	مشراق	۲۰۰۹ء
۳۰	رفیق راز	نخلِ آب	۲۰۱۵ء

۳۱	ایاز رسول نازکی	خودرو	۲۰۰۱ء
۳۲	ایاز رسول نازکی	شام سے پہلے	۲۰۰۸ء
۳۳	ایاز رسول نازکی	نقدِ ایاز	۲۰۱۷ء
۳۴	خالد بشیر احمد	صدائے نیم شب	۱۹۸۳ء
۳۵	خالد بشیر احمد	خواب پارہ	۲۰۰۸ء
۳۶	فرید پربتی	ابرتر	۱۹۸۷ء
۳۷	فرید پربتی	آب نیساں	۱۹۹۲ء
۳۸	فرید پربتی	اثبات	۱۹۹۸ء
۳۹	فرید پربتی	فرید نامہ	۲۰۰۳ء
۴۰	فرید پربتی	گفتگو چاند سے	۲۰۰۵ء
۴۱	فرید پربتی	ہزار امکان	۲۰۰۶ء
۴۲	فرید پربتی	ہجومِ آئینہ	۲۰۱۰ء
۴۳	عرش صہبائی	شکست جام	۱۹۵۸ء
۴۴	عرش صہبائی	شگفت گل	۱۹۶۱ء
۴۵	عرش صہبائی	صلیب	۱۹۶۳ء
۴۶	عرش صہبائی	اسلوب	۱۹۹۱ء
۴۷	عرش صہبائی	ریزہ ریزہ وجود	۱۹۹۵ء
۴۸	عرش صہبائی	اساس	۲۰۰۱ء
۴۹	عرش صہبائی	نایاب	۲۰۰۴ء
۵۰	عرش صہبائی	توازن	۲۰۰۵ء
۵۱	عرش صہبائی	دسترس	۲۰۰۷ء
۵۲	عرش صہبائی	عکس جمال	۲۰۰۷ء
۵۳	عرش صہبائی	جواز	۲۰۱۱ء

۵۴	عرش صہبائی	شبنم تیری یادوں کی	۲۰۱۳ء
۵۵	عرش صہبائی	دل کے خواب ادھورے	۲۰۱۴ء
۵۶	ودیارتن عاصی	دشت طلب	۲۰۰۴ء
۵۷	پرتپال سنگھ بیتاب	پیش خیمہ	۱۹۸۰ء
۵۸	پرتپال سنگھ بیتاب	سراب درسراب	۱۹۸۴ء
۵۹	پرتپال سنگھ بیتاب	خودرنگ	۱۹۹۵ء
۶۰	پرتپال سنگھ بیتاب	کیکٹس اور گلاب	۱۹۹۹ء
۶۱	پرتپال سنگھ بیتاب	موج ریگ	۲۰۰۳ء
۶۲	پرتپال سنگھ بیتاب	فلک آثار	۲۰۱۳ء
۶۳	احمد شناس	پس آشکار	۲۰۱۰ء
۶۴	احمد شناس	صلصال	۲۰۱۲ء
۶۵	پرویز مانوس	بیتے لمحوں کی سوغاتیں	۱۹۹۲ء
۶۶	پرویز مانوس	موسم اُڑان کا	۱۹۹۷ء
۶۷	پرویز مانوس	چاند، لمس، گلاب	۲۰۰۴ء
۶۸	تنویر بھدرواہی	منظر منظر آئینہ	۲۰۰۹ء
۶۹	شیخ گلزار	لمحے اندھیروں کے	۲۰۱۱
۷۰	سلیم ساغر	انتظار اور سہی	۲۰۰۸ء
۷۱	فاروق احمد فاروق	دیوانِ فاروق	۲۰۱۴ء
۷۲	فاروق احمد فاروق	دیوانِ دوم فاروق	۲۰۱۶ء
۷۳	شجاع سلطان	خواب زار	۲۰۱۲ء
۷۴	سجاد پوچھی	فصلیں بولتی ہیں	۲۰۰۷ء
۷۵	سجاد پوچھی	سمندر آشنا	۲۱۰۱۵ء
۷۶	خالد کرار	ورود	۲۰۱۰ء

۷۷	اشرف عادل	لذتِ گریہ	۲۰۰۲ء

رسائل وجرائد

نمبر شمار	نام رسالہ۔ جریدہ	مقام اشاعت	سن اشاعت
۱	شیرازہ، فرید پربتی نمبر	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	۲۰۱۲ء
۲	قرطاس، گوشۂ مظفر ایرج	ناگپور	نومبر۔ دسمبر ۲۰۱۱ء
۳	شیرازہ، حکیم منظور نمبر	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	جلد ۴۶، شمارہ ۴ تا ۷
۴	شیرازہ، حامدی کاشمیری	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	
۵	شیرازہ، شوریدہ کاشمیری نمبر	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	
۶	شیرازہ، جموں کشمیر میں اُردو شاعری نمبر	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	جلد ۵۲۔ شمارہ ۷۔۶
۷	شیرازہ، ہم عصر شعری انتخاب نمبر	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	جلد ۴۸ شمارہ ۱۔۱۲
۸	تعمیر، انتخاب نمبر	محکمہ اطلاعات، جموں کشمیر، سرینگر	اگست، ستمبر ۱۹۹۹ء
۹	تفہیم	راجوری	جلد ۱، شمارہ ۴
۱۰	سر سبز پرتپال سنگھ نمبر	دھرم شالہ	مئی تا اگست ۲۰۰۸ء
۱۱	شیرازہ	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	جلد۔ شمارہ: ۵
۱۲	ہمارا ادب، شخصیت نمبر	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	۱۹۸۵ء۔ ۱۹۸۶ء
۱۳	شیرازہ جموں۔ کشمیر۔ لداخ نمبر	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر	جلد ۵۰، شمارہ ۹ تا ۱۱
۱۴	سر سبز، جموں کشمیر اُردو غزل نمبر	دھرم شالہ، ہماچل پردیش	جولائی سے ستمبر ۲۰۱۴ء
۱۵	بازیافت	شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی، سرینگر	۲۰۰۶ء
۱۶	انتساب عالمی، گوشۂ احمد شناس	سرونج، مدھ پردیش	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء
۱۷	تحریک ادب گوشۂ خالد بشیر احمد	وارانسی، اُتر پردیش	جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء
۱۸	انتساب عالمی، گوشۂ حامدی کاشمیری	سرونج، مدھ پردیش	اپریل تا جون ۲۰۱۲ء

ذاتی ملاقاتیں اور انٹرویو

نمبر شمار	نام شاعر	مقام ملاقات	تاریخ
۱	عرش صہبائی	موصوف کے گھر واقع ،ریشم گھر کالونی، جموں	۲۲مارچ ۲۰۱۵ء
۲	پرتپال سنگھ بیتاب	موصوف کے گھر، گاندھی نگر، جموں	۲۴مارچ ۲۰۱۵ء
۳	رفیق راز	موصوف کے گھر، باغات برزلہ، سرینگر	۱۳اپریل ۲۰۱۵ء
۴	ہمدم کاشمیری	موصوف کے گھر، باغات برزلہ، سرینگر	۲مئی ۲۰۱۵ء
۵	مظفر ایرج	موصوف کے گھر، نوگام بائی پاس، سرینگر	۲مئی ۲۰۱۵ء
۶	خالد بشیر احمد	موصوف کے گھر، نوگام بائی پاس، سرینگر	۲۱نومبر ۲۰۱۶ء
۷	شفق سوپوری	دفتر، ڈگری کالج، بمنہ، سرینگر	۱۵نومبر ۲۰۱۶ء
۸	ایاز رسول نازکی	ٹیگور ہال، سرینگر	۱۷نومبر ۲۰۱۶ء
۹	شبیب رضوی	موصوف کے گھر، اندرون کاٹھی دروازہ، مخدومؒ صاحب، سرینگر	۱۵جنوری ۲۰۱۷ء
۱۰	فاروق نازکی	کلچرل اکیڈمی، سرینگر	۲۲نومبر ۲۰۱۶ء
۱۱	اشرف عادل	دفتر، شعبۂ امتحانات، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر	۲۴جنوری ۲۰۱۷ء
۱۲	سلیم ساغر	دفتر، کلچرل اکیڈمی، سرینگر	۱۳جنوری ۲۰۱۷ء
۱۳	لیاقت جعفری	دفتر، ایم۔اے۔ایم کالج، جموں	۱۱مارچ ۲۰۱۷ء
۱۴	پرویز مانوس	موصوف کے گھر، نٹی پورہ، سرینگر	۲۵نومبر ۲۰۱۶ء
۱۵	اقبال فہیم	موصوف کے گھر، لاوے پورہ، سرینگر	۲۸نومبر ۲۰۱۶ء
۱۶	فاروق احمد فاروق	کلچرل اکیڈمی، سرینگر	۱۳جنوری ۲۰۱۷ء
۱۷	علمدار عدم	دفتر، کلچرل اکیڈمی، سرینگر	۱۳جنوری ۲۰۱۷ء
۱۸	خالد کرار	دفتر، گاندھی نگر، جموں	۱۲مارچ ۲۰۱۷ء
۱۹	شیخ گلزار	موصوف کے گھر، سامبورہ، پانپور، کشمیر	۱۲نومبر ۲۰۱۶ء
۲۰	احمد شناس	موصوف کے گھر، سدراہ، جموں	۲۰فروری ۲۰۱۷ء

Jammu-O-Kashmir Mein
Urdu Ghazal 1947 Ke Baad

by

Dr. Mushtaq Ahmad Ganai



"ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی کا تحریر کردہ مقالہ "جموں وکشمیر میں اُردو غزل ۱۹۴۷ء کے بعد" ارد
میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یوں تو جموں وکشمیر میں اردو ادب کی سمت ورفتار کا جائزہ پہلے
تاہم یہ مقالہ اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اردو کی محبوب ترین صنف غزل پر
اور وہ بھی ۱۹۴۷ء کے بعد۔ یہ سال اس لئے بھی اہم ہے کہ اسی سال نہ صرف ہندوستان آزاد ہوا بلکہ
تقسیم بھی ہوا۔ اردو کے ادبا وشعرا پر اس تقسیم کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اردو غزل بھی ان
سیاسی وسماجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی جن حالات نے ہندوستان کی ایک بڑی آبادی
کے اذہان پر غیر معمولی اور اندوہ ناک اثرات مرتب کیے تھے۔ جموں وکشمیر بھی ان اثرات سے محفوظ
نہ رہ سکا تھا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی نے اس تحقیقی کام کو بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے۔ یہ بات بھی
لائقِ مسرت ہے کہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی اس مقالے کی اشاعت کے لئے
معالی تعاون دے رہی ہے۔ اُمید ہے کہ کتابی شکل میں آنے کے بعد یہ مقالہ زیادہ سے زیادہ لوگوں
تک پہنچ پائے گا اور سنجیدہ قارئین سے داد وتحسین وصول کرے گا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی کو بے حد
مبارک باد اور بے شمار دعائیں"۔

پروفیسر شہناز نبی
کلکتہ

Meezan Publishers & Distributers
Opp. Fire & Emergancy Services Hqrs
Batamaloo Srinagar- 190009 Kashmir
Ph: [illegible]
Email:- Meezanpublishers@gmail.com

ISBN 978-81-909941-8-7